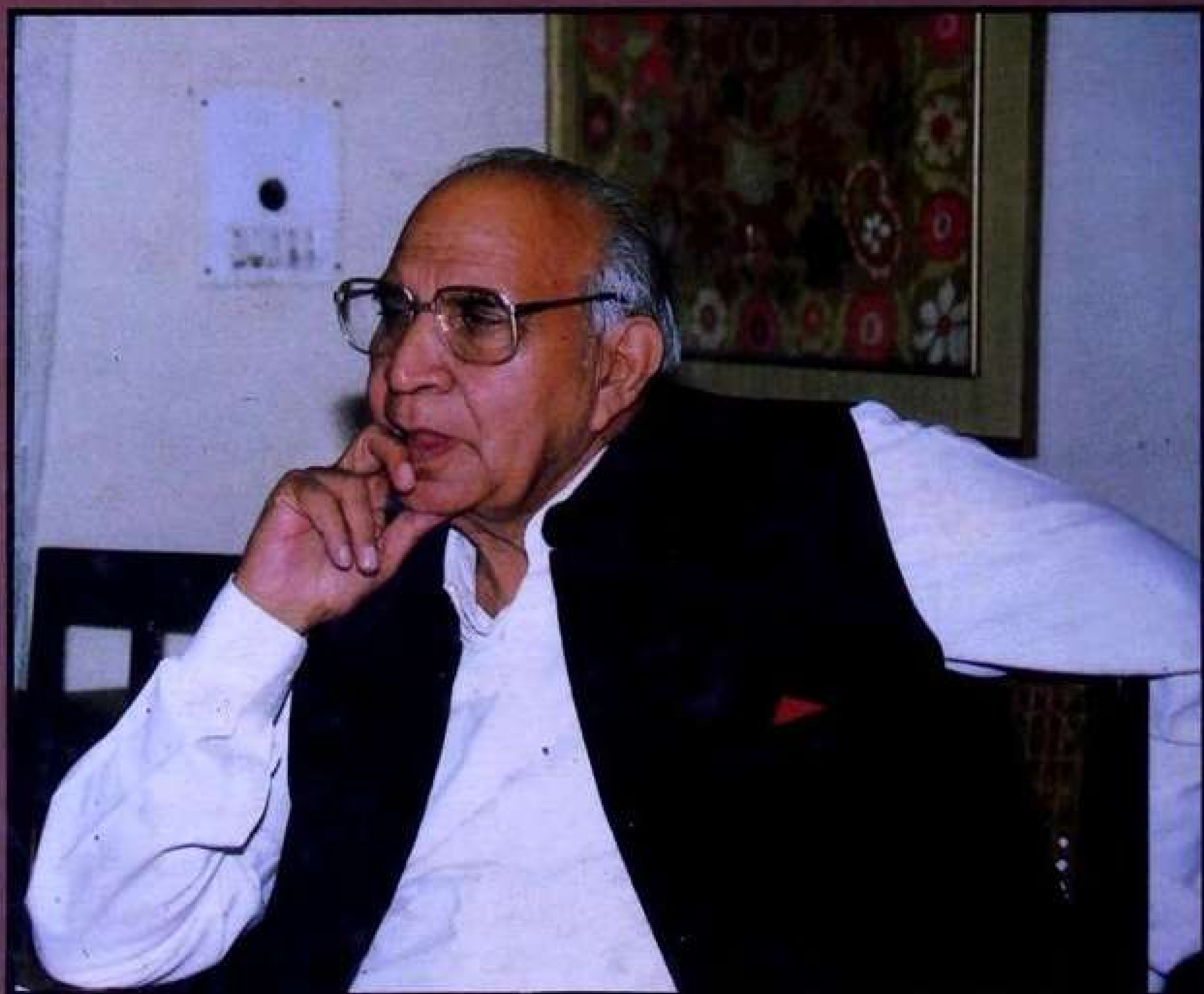
ضمیر حاضر ضمیر غائب

سیّد ضمیر جعفری



بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ضمیر حاضر ضمیر غائب

سیّد ضمیر جعفری

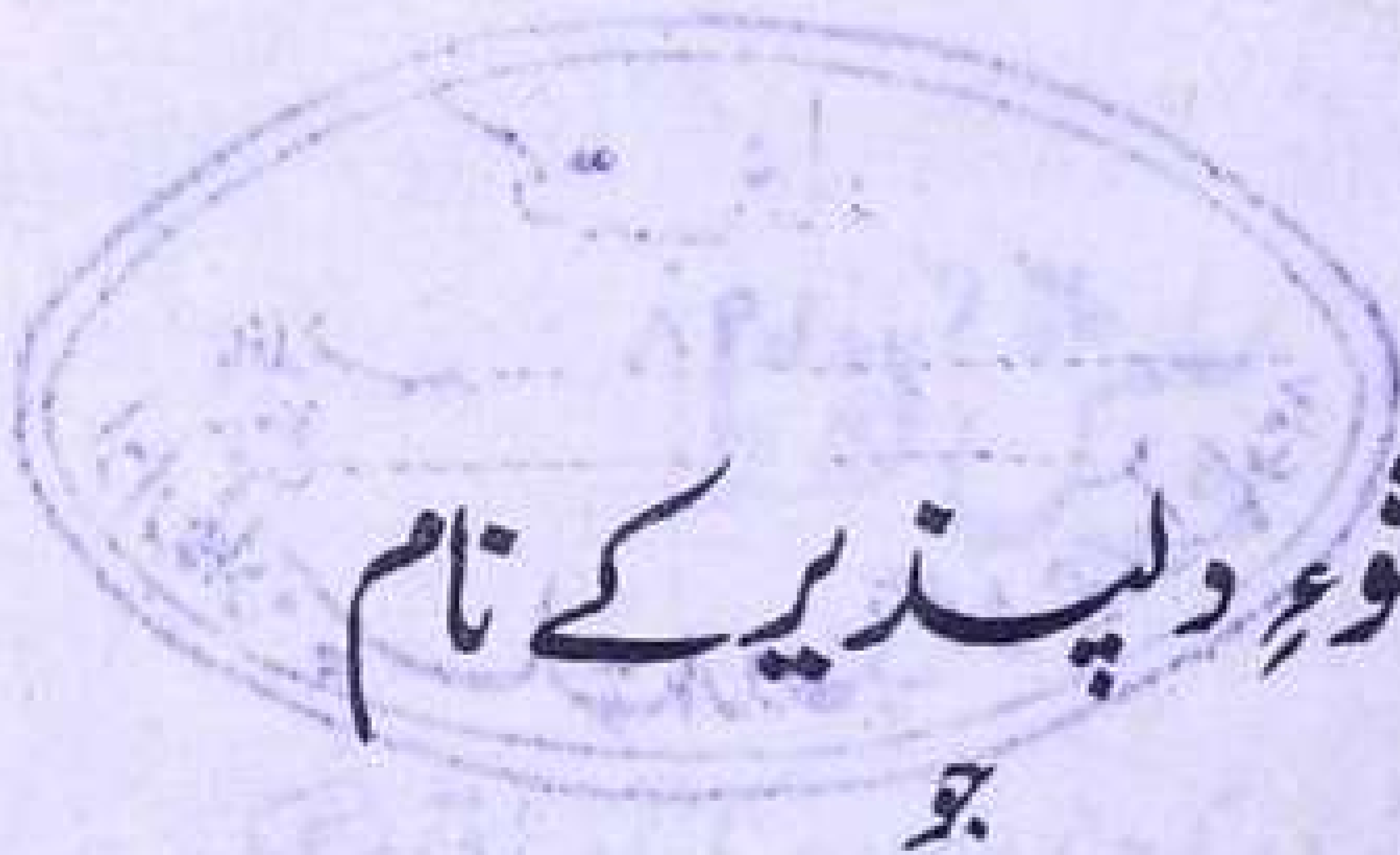
سنگِ میل پبلی کیشنز ○ لاہور

۱۹۸۹ء

نیاز احمد
نے زاہد بشیر پرنٹرز، لاہور
سے چھپوا کر سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور
سے شائع کی۔

تعداد ـــــ ایک ہزار

قیمت ـــــ ۹۰/۰۰ روپے



ماشوءِ دلپذیر کے نام

جو

کرنل مسعود احمد ڈائریکٹر تعلقات عامہ عساکر پاکستان
کے نام سے بھی کچھ پہچانا جاتا ہے۔

پیش لفظ

زیرِ نظر کتاب میری ڈائری کے چند برسوں کے اوراق پر مشتمل ہے۔ یہ نہ میری پوری زندگی ہے، نہ پورا سچ ہے۔ یہ چند جھلکیاں ہیں — ڈوبتی اُبھرتی — دوڑتی بھاگتی — حاشیے — لکیریں!!

میں ستمبر ۱۹۴۳ء سے قریباً روزانہ ڈائری لکھ رہا ہوں۔ کوشش یہی ہوتی ہے کہ شب کو ڈائری لکھ کر ہی بستر پر جاؤں۔ خواہ ایک سطر ہی لکھوں۔ کوئی رت جگا آپڑے تو اگلی صبح پہلا کام یہی کرتا ہوں۔ مجھے معلوم نہیں کہ میرے دماغ میں یہ کیڑا کیوں پیدا ہوا اور میں حیران ہوں کہ مجھ جیسا سُست عناصر گزشتہ چالیس برس سے اس "کیڑے" کی پرورش کیسے کرتا رہا۔ اتنی استقامت کا مظاہرہ میں نے ذاتی زندگی کے کسی معاملے میں شائد ہی کیا ہو۔

ابتدا میں جب فرصت اور ہمت وافر تھی — ڈائری لمبی لکھی جاتی۔ جیسے جیسے عمر بڑھتی گئی، ڈائری سکڑتی گئی۔ شروع میں کئی برس تک، پولیس تھانوں کے روزنامچوں کے لئے تن و توش کا رجسٹر اس کارروائی کا تختۂ مشق رہا۔ بعد میں ہر سال کے لئے علیحدہ علیحدہ ڈائری — اس روگ کو سینے سے لگائے

رکھنے کی ایک ہی وجہ سمجھ میں آتی ہے کہ اس نگارش سے شائد میرے ادبی چسکے کی تسکین ہوتی تھی۔ ورنہ ؎

ہم کہاں کے دانا تھے کس ہُنر میں یکتا تھے

ایک معمولی شخص۔ مسٹر نہ مولانا۔ جس کی عمر تو ہوتی ہے مگر سوانح عمری نہیں ہوتی۔ بھلا ڈائری کیوں لکھتا۔ اس کے بغیر کون سے کام بند تھے۔ مگر یہ تفریح رفتہ رفتہ عادت بن گئی۔ جس طرح بعض لوگ رات کو حقّہ پی کر سوتے ہیں۔

میں نے کبھی سوچا تک نہ تھا کہ اس دفتر کا جو تہہ بہ تہہ جمع ہوتا جا رہا تھا، کبھی کوئی مصرف بھی ہوگا۔ کبھی کچھ دھیان بھی آیا تو وقت کے ضیاع کا احساس ہوا کہ خواہ مخواہ اولاد کے لئے "ردّی" اکٹھی کر رہا ہوں۔ میں اب سوچتا ہوں کہ میں اگر ڈائری لکھنے کے بارے میں زیادہ سوچتا تو شائد میں ڈائری لکھ ہی نہ پاتا۔

یہ شائد ۱۹۷۸ء کی بات ہے۔ ہمارے ملک کے ممتاز شاعر اور دانشور جناب عبدالعزیز خالد میرے ہاں تشریف لائے تو کتاب خانے میں ڈائریوں کی قطار دیکھ کر انہوں نے پوچھا۔

"ان میں کیا ہے؟"

عرض کیا ــــ "راتیں ہیں بند ان میں ہمارے شباب کی۔"

بولے ــــ "آخر اِس درد کی دوا کیا ہے؟"

دوا بھی انہوں نے خود ہی تجویز کر دی ــــ

فرمایا ــــ اِس ذخیرے کی چھانٹی کرو۔ منتخبات کو چھپواؤ۔ اس متاع کو ٹھکانے لگاؤ ؎

کس کے گھر جائے گا یہ سیلِ بلا تیرے بعد

متاع ! ـــــ میں تو اس کو ملبہ سمجھ رہا تھا۔ اگرچہ یہ مٹی مجھے بے حد عزیز تھی۔ اس کی اشاعت کا خیال کبھی میرے ذہن سے گزرا تک نہ تھا۔ میں اب بھی متذبذب تھا کہ ان میں نہ تاریخ ہے نہ ادب۔ زندگی کی لکیر بھی بہت سپاٹ سی۔ یہ ڈر بھی تھا کہ لمحاتی جذبوں۔ اضطراری حالتوں میں سرپٹ لکھی ہوئی تحریروں کی اشاعت کہیں میری عاقبت ہی خراب نہ کر دے۔ مگر خالد صاحب کے تجربے اور دانش کو نظر انداز نہ کر سکا۔ جبکہ ان کا مشورہ مجھے موافق آ رہا تھا ع

واماندگیٔ شوق تراشے ہے پناہیں

ایک سابق فوجی ہونے کے ناطے سے میں نے اس کی "نکاسی" کے لئے ایک فوجی محاذ تاکا۔ ڈائری کی اقساط عساکر پاکستان کے اخبار ہفت روزہ "ہلال" راولپنڈی میں شائع ہونے لگیں۔ یہ سلسلہ اب تک جاری ہے۔ چند اقساط ماہنامہ "عصمت" کراچی میں بھی نکل چکی ہیں۔ ان دونوں رسائل کے محترم مدیروں نے مجھے ہمیشہ جتایا کہ ان کے قارئین اس سلسلے کو دلچسپی سے پڑھتے ہیں ع

نیاز مند نہ کیوں عاجزی یہ ناز کرے

ڈائری کے استعمال کے دو ہی طریقے سمجھ میں آئے۔ ایک یہ کہ منتخب واقعات کو تمام و کمال دوبارہ لکھا جائے اور اس عمل میں تحریر کو تخلیقی اطمینان کے ساتھ ٹھونکنے بجانے کے علاوہ۔ ڈائری کے مختصر لمحاتی تاثرات میں بعد کی تجرباتی روشنی اور آگہی بھی "گھول" دی جائے۔

دوسرا نسخہ ۔ ہرچہ باداباد والا۔ واقعات بے شک منتخب ہوں۔ مگر عبارت میں دست بُرد نہ کی جائے۔ جو بندھ گیا سو موتی۔ چند مہربانوں

سے مشورہ کیا۔ جناب قدرت اللہ شہاب اور جناب مسعود مفتی نے اسی پیرائے کی حمایت کی۔ اُن کا کہنا تھا ــــ تمہاری ڈائری کی کشش تاریخ یا دانش میں نہیں۔ اس کی صداقت اور بے ساختگی میں ہے۔ اس کے چھپنے پر خراش نہ آنے دو۔" کرنل محمد خان نے تو یہاں تک کہا کہ تاریخ اگر کہیں دَر بھی آئی ہے تو اس کو خارج کر دو۔ مے سے صرف نشاط کی غرض رکھو۔ خوش نظرے خوش گزرے۔

میں نے اس نسخے پر عمل کیا۔ یہ میرے لئے سہل بھی تھا۔ عبارت نقل کرتے ہوئے جملوں کی کمر بے شک کس دی ہو گی۔ بعض واقعات کو حذف کرنا بھی مناسب سمجھا۔ مگر اضافے سے احتراز کیا۔

تشکرات کے ضمن میں میرا اوّلین فرض محبّی عبدالعزیز خالد کا شکریہ ادا کرنا ہے جنہوں نے مجھے اس منصوبے کی طرف متوجہ کیا۔ اقتباسات کی نشاندہی میں میرے بیٹے عزیزم میجر احتشام ضمیر نے ہاتھ بٹایا۔ اقتباسات (میرے عزیز دوست اُردو کے منفرد مزاح گو شاعر) نذیر احمد شیخ مرحوم کے پوتے عزیزم ارشاد احمد شیخ نے نقل کئے۔ کتاب کی اشاعت کے مراحل کی نگرانی جناب احمد ہاشمی نے فرمائی۔ میں ان سب کا شکر گزار ہوں۔ جہاں آرا (اپنی اہلیہ) کا شکریہ بھی مجھ پر واجب ہے گھر میں ایسے "ملبے" کی موجودگی سے اپنے "بنیادی اختلاف" کے باوجود وہ ان ڈائریوں کی حفاظت کر رہی ہیں۔

اس روداد میں کئی شخصیتوں کا تذکرہ آیا ہے۔ تاثرات سرسری ہیں۔ میری رائے غلط بھی ہو سکتی ہے۔ میں نے جو کچھ لکھا ایک سَرورِ رفیقانہ و نیازِ رندانہ" کی رَو میں لکھا۔ اگر رواروی کے بہاؤ میں کسی واقعے کی صحت مجروح ہو گئی ہو یا شخصی تذکار میں کوئی ناگوار سایا آ گیا ہو تو میں عفو کا طالب ہوں۔

اسلام آباد

سید ضمیر جعفری

یکم جنوری ۱۹۸۲ء

دو برس شملے میں

۱۹۴۳-۴۴ء

(روزنامچہ لکھنے کا آغاز شملہ ہی میں
۲۷ستمبر ۱۹۴۳ء کو ہوا)

کالی باڑی کا ـــــ کالا مشاعرہ

کالی باڑی ہال میں پچھلے ماہ جون میں جو آل انڈیا مشاعرہ ہم نے کرایا تھا لگتا ہے کہ وہ ہماری اگلی "جون" تک ہمارا پیچھا نہیں چھوڑے گا۔ کالی باڑی ہال کے بنگالی سیکرٹری نے نوٹس دیا ہے کہ ایک ہفتے کے اندر اندر ہماری کرسیاں اور کھڑکیاں مرمت کرا دو ورنہ ..... ابوالاثر حفیظ دہلی سے اپنی موٹر پر آ گئے، واپسی پر موٹر کا لکا میں خراب ہو گئی۔ اس زحمت کی شکایت پنڈت ہری چند اختر نے ٹیلی فون پر ہم سے کی۔ روش صدیقی بھی ہمارے طرز تپاک سے کچھ خوش نہیں گئے۔ اپنے خط کے لہجے کو تو انہوں نے ریشمی ہی رکھا مگر بین السطور میں زحمتِ قیام کی طرف ہلکا سا اشارہ کیا ہے۔ اس کی ایک ہی وجہ سمجھ میں آتی ہے۔ مظفر سے غلطی ہو گئی کہ اس نے روش اور ساحر کو ہوٹل کے ایک ہی کمرے میں ٹھہرا دیا (گجرات کے مظفر الدین قریشی جو بعد میں پاکستان آرمی کے توپ خانے میں کرنل ہوئے اس مشاعرے کی قیام و طعام کمیٹی کے سربراہ تھے) مظفر نے ساحر کو ساحر لدھیانوی سمجھا حالانکہ وہ ساحر ہوشیارپوری تھے۔ اس میں آخر برہمی کی کون سی بات تھی۔ ہاں اتنا لطیفہ ضرور ہے کہ روش دبلے پتلے چالیس پینتالیس سیر کے آدمی تھے اور موہن لال ساحر کا وزن تین من سے کم کیا ہو گا۔ ڈاکٹر تاثیر سے اس لطیفے کا ذکر آیا تو انہوں نے مشورہ دیا کہ روش اور ساحر دونوں کو ایک ایک خط معذرت کا لکھ دو۔

اسمارا سے کسولی

حوالدار شمبو ہو ناتھن ملنے آئے۔ ان سے کسولی میں ملاقات ہوئی تھی۔ ان دنوں میرے گاؤں کا میرا لنگوٹیا دوست جمعدار راجہ محمد عنایت خان اسمارا (شمالی افریقہ) سے تپدق میں مبتلا ہو کر کسولی سینی ٹوریم میں زیرِ علاج تھا اور حوالدار صاحب کو امپھل میں خود ان کے کرنل کے کتّے نے کاٹ لیا تھا۔ سو یہ ان دنوں کسولی کے اس ہسپتال میں مقیم تھے جہاں باؤلے کتّے کے کاٹے ہوئے مریضوں کا علاج ہوتا ہے۔ عنایت اور شمبو ہو پونہ میں اکٹھے رہے تھے۔ شمبو ہو پہلی ملاقات ہی میں دلچسپ شخص معلوم ہوا۔ کہنے لگا! میں کرنل صاحب بلکہ ان کے کتّے کا ممنون ہوں، بقیہ جنگ اسی ہسپتال میں گزاروں گا۔ اچھا بہانہ بن گیا۔ ورنہ آدھ سیر کے ننّھے منّے کتّے کے کاٹے سے آدمی باؤلا تھوڑا ہی ہو جاتا ہے اور پھر جمعدار عنایت خان کے بقول —— ہم نے آج تک کسی انگریز کتّے کو پاگل ہوتے نہیں دیکھا۔

لطیفے کی بات یہ ہے کہ تندرست ہونے کے بعد حوالدار شمبو ہو ناتھن کو مستقلاً ایک "ڈاگ سنٹر" (DOG CENTRE) کے سٹاف پر کوارٹر ماسٹر حوالدار لگا دیا گیا —— سوچنے کی بات یہ ہے کہ سرکار اپنے فوجیوں کے علاج معالجے کا کتنا خیال رکھتی ہے۔ جمعدار عنایت خان کو اسمارا سے اور حوالدار ناتھن کو امپھل سے کسولی بھجوایا۔ ڈیلی راشن کی تفصیلات سن سن کر میرے منہ میں پانی بھر بھر آتا ہے۔

مولانا البرہان

اٹھائیسواں روزہ۔ ہمارے پڑوسی فرساد صاحب نے افطاری سے ملی ہوئی "مہا سحری" کا اہتمام اپنے ہاں کر رکھا تھا۔ رسالہ "البرہان" کے مدیر مولانا پروفیسر سعید احمد اکبر آبادی

ان کے ہاں ٹھہرے ہوئے ہیں۔ یہ مجلس شعر و ادب انہی کے اعزاز میں آراستہ کی گئی۔ شملے کا ہر قابلِ ذکر ادیب و شاعر، عالم یا علم دوست شخص موجود تھا۔ ہمارے سامنے ایک ویدجی رہتے تھے۔ اتفاقاً ان کے ہاں تو ہر یارام درد نکودری مقیم تھے۔ فرساد صاحب ان کو بھی پکڑ لائے۔ خود فرساد صاحب ٹھوس معلومات رکھنے والے خالص علمی و تحقیقی اسکالر ہیں۔ ان کو جب دیکھا موٹی موٹی کتابوں میں گھرا دیکھا معلوم نہ تھا شعر بھی کہتے ہیں۔ انہوں نے بڑی بانکی غزل سنائی۔ میں سمجھتا تھا آپ فرہاد ہوں گے آپ فرساد نکلے۔ مجھے فرساد کے معنے بھی معلوم نہیں۔ کچھ معنی تو ضرور ہوں گے۔ پروفیسر سعید احمد خالص مولوی آدمی ہیں۔ جیسے دیوبند کا کوئی جید عالم سنیٹ اسٹیفنسن کالج دہلی میں پروفیسری کر رہا ہو۔ مزاح نگاری میں صرف دو آدمیوں کو مانتے ہیں، رشید احمد صدیقی اور پروفیسر احمد شاہ بخاری پطرس۔ باتیں بھاری بھرکم، غزل ہلکی پھلکی۔ ٹوپی غزل سے بھی زیادہ ہلکی پھلکی۔

تبسّم قریشی

محمد رمضان تبسّم قریشی (ایڈیٹر ہفت روزہ "محبِ کسان"، گجرات) سے اچانک ملاقات ہو گئی۔ جنرل ہیڈ کوارٹر کے ایک گلیارے میں ایک دیسی کپتان نظر آیا تو میں لپک کر اس کی طرف گیا۔ وہ تبسّم قریشی نکلے۔ لپٹ کر ملے۔ اس والہانہ معانقے کے عمل میں ہم کچھ ڈر بھی رہے تھے کہ ایڈجوٹنٹ جنرل کے کمرے کی سرخ بتی سامنے ہی جل رہی تھی۔ ڈر تھا کہ اگر اچانک جنرل صاحب نکل آئے تو کہیں خفا ہی نہ ہو جائیں کہ ہماری غلام گردشوں میں ایک باوردی دیسی کپتان ایک دوسرے آدمی سے یوں لوٹ کر معانقہ کیوں کر رہا ہے بادشاہوں کے مزاج کے کیا کہنے ——— معلوم ہوا کہ دیہات سدھار (FAME والے بریگیڈیر ایف ایل برین (F.L-BYRENE) نے اپنی ویلفیر برانچ (WELFARE BRANCH) میں بلوا کر ان کو کھڑے کھڑے وردی اوڑھا دی ہے۔ جیسے بریگیڈیر صاحب

خود ویسے ان کا کپتان ——— بتایا ——— "برما جا رہا ہوں۔ وہاں فوج کی دیہات سدھار کروں گا" میں نے عرض کیا ——— "بارکوں میں روشندان رکھوانا نہ بھولیئے گا" فارسی کے اچھے شاعر ہیں تبسّم صاحب۔

ہٹلر بہادر

شملہ میونسپل کمیٹی نے جنگی پروپیگنڈے کے لئے مال روڈ کے بارونق "سکنڈل پوائنٹ" کی ایک سلوٹ پر ایک "لوکل براڈ کاسٹنگ اسٹیشن" قائم کر رکھا ہے۔ ازنڈیل کی طرف ڈھلوان پر بنی ہوئی ایک کوٹھڑی کو اسٹوڈیو مان کر لوگ وہاں سے تقریریں اور نظمیں پڑھتے ہیں جو مال روڈ پر نصب لاؤڈ سپیکروں سے دُور دُور تک نشر ہوتی ہیں۔ خاں صاحب میاں عبدالصمد ناظم بلدیہ (جو قیام پاکستان پر صوبہ پنجاب کے ہیلتھ سیکرٹری ہوئے) اس پروگرام کے کرتا دھرتا ہیں۔ سارا آنریری کھڑاک ہے۔ چند روز ہوئے خان بہادر سید مہدی علی شاہ (وائس چیرمین میونسپل کمیٹی) نے اس کا افتتاح کیا۔ تو ڈپٹی کمشنر بہادر۔ "کمشنر بہادر" کہتے کہتے بدحواسی میں ہٹلر کو بھی ہٹلر بہادر کہہ گئے۔ آج اس سسٹم پر ہم نے بھی ایک نظم پڑھی۔ ہر روز ایک یا دو شاعروں کو مدعو کیا جاتا ہے کوئی ضروری نہیں کہ نظم جنگ کے موضوع پر ہو۔ جنگی ترانوں کے ریکارڈ الگ بجائے جاتے ہیں۔ آج کل یہ نغمہ خوب چل رہا ہے۔

تم شیر ہو تم میداں ہیں گئے۔ تم مرد ہو تم نے کام کیا

عید الفطر

کل شام چاند ہو گیا۔ ہم لوٹی کنڈی کے نشیب نشینوں کو تو چاند نظر نہ آیا۔ ہاں "سمر ہل" کے بالا نشینوں نے چاند دیکھ کر گولے داغ دیئے۔ دوسرے مقامات سے

بھی چاند ہونے کے تار آ گئے۔ ریڈیو نے بھی بشارت سنا دی۔

ہمارے گاؤں میں بھی چاند ہونے کی بشارت سب سے پہلے سائیں امیراللہ نے کسی کوٹھے پر چڑھ کر سنائی ہو گی اور چاند دیکھنے کے لئے اپنے بیٹے زین خان کو (یہ بعد میں فوج میں صوبیدار ہوئے ۱۹۷۷ء) بابا فاضلو شاہ کی سب سے اونچی جنڈ پر چڑھایا ہو گا اور دن کو انہی جنڈیوں میں "پینگ میلہ" رچا ہو گا۔

یہاں احباب نے طے کر رکھا تھا کہ نماز بے شک اپنی اپنی پڑھو مگر دوپہر کا کھانا ایک جگہ کھاؤ۔ کھانا بھی اپنا اپنا۔ یہ "کمیونٹی دسترخوان" خورشید علی بٹ کے گھر میں بچھا۔ (خورشید علی بٹ مرحوم راولپنڈی کے باشندہ تھے۔ کنٹرولر ملٹری اکاؤنٹ کے عہدے سے ریٹائر ہوئے) آج کل "شملے" میں اکثر احباب بال بچوں کے بغیر "چھڑم چھڑے" بیٹھے ہیں۔ دن بھر خوب ہلا گلا رہا۔ پلاؤ، زردہ، کباب، دھوم دھڑکہ، ناچ، گانا، شعر ـــــ سخن دوست، کے گھر میں شادی رچا دی۔

سہ پہر کو مال روڈ کی نشست رہی۔ معمول سے زیادہ چہل پہل تھی، اُجلے اُجلے لوگ، اُجلے اُجلے لباس "کارٹ روڈ" پہ ایک بلتستانی مزدور کو لکڑیوں کے ایک گٹھے کے نیچے زخمی پایا ـــــ "مال روڈ" ـــــ اور "کارٹ روڈ"؟ ـــــ دونوں سڑکوں میں کتنا فاصلہ ہے؟ ـــــ دو سڑکیں! ـــــ دو شہر!

جنوری فروری

۱۹۴۳ء کا جائزہ

جنگ جاری ہی نہیں مہیب ہوتی جا رہی ہے۔ دُنیا کے بڑے بڑوں میں ٹھنی ہوئی ہے۔ جنگ عالمگیر اوّل تو "خندقوں" کی وجہ سے طویل ہو گئی تھی، موجودہ جنگ معلوم نہیں کیوں اتنا طول کھینچ گئی حالانکہ یہ ہوائی جہازوں کی جنگ ہے ——— ذاتی سطح پر میرے لئے سالِ گزشتہ ایک المناک سال رہا۔ والد صاحب قبلہ کی وفات کا صدمہ دیکھنا پڑا۔ میرے دو پیارے دوستوں جمعدار راجہ محمد عنایت اور مبارک مسعود مصری ایم اے کو بھی موت کے بے رحم ہاتھوں نے چھین لیا۔ عنایت شمالی امریکہ میں جرمن ٹینکوں کے سامنے سے بچ آیا مگر اپنے گھر آکر زندگی کی بازی ہار گیا۔

اس وقت ۱۹۴۳ء کے آخری لمحات ابد کی سیاہی میں گھلے جا رہے ہیں۔ لمحے ساعتوں میں، ساعتیں دنوں اور مہینوں میں، مہینے سالوں اور صدیوں میں ڈھل جاتے ہیں۔ انسان کس سمت کو دوڑا جا رہا ہے؟ زندگیاں کتنی تیزی سے ختم ہوتی ہیں۔؟

پہلا دن

نئے سال کا پہلا دن۔ کچھ عجیب بات ہے کہ آج کے دن آدمی اپنے اندر ایک نیا پن ضرور محسوس کرتا ہے۔ ماہ وسال کی مصنوعی تقسیم بھی ذہن کو کتنا متاثر کرتی ہے۔ شاید انگریزوں نے اپنے نئے سال کو کچھ بہت ہی زیادہ بالنس پر چڑھا رکھا ہے۔

ایک دوسرے کو مبارکباد کے علاوہ تحفے بھی دیئے جاتے ہیں۔ شملے میں کرسمس اور سالِ نو کی تقریبات کے ایسے ایسے ہنگامے دیکھنے میں آئے کہ جیسے جنگ ختم ہوگئی ہو۔ سرکاری عمارتوں پر یونین جیک لہرا رہا ہے۔ جیسے ہم پہ ہنس رہا ہو۔ طنزیہ مسکراہٹ (یکم جنوری)

نیا دفتر

آج نئے دفتر میں رپورٹ کی۔ وزارتِ دفاع سے جنرل ہیڈ کوارٹرز میں۔ ارادہ کسی محاذ کی طرف پیشقدمی کا ہے۔ خواہ وہاں سے پس پائی کرنا پڑے، نئے دفتر میں میرے سوا سب اہلکار ہندو ہیں۔ اوپر انگریز نیچے ہندو، ان کے نیچے ہم۔ رہائش بھی ٹوٹی کنڈی میں ہے جو شملے کے تحت الثریٰ میں واقع ہے۔ دفتر میں بھی تحت الثریٰ، ہمارا سیکشن فوجیوں کی چھٹیوں کے قواعد بناتا ہے۔ چھٹی کسی کو ملتے نہیں دیکھی۔ قواعد دھڑا دھڑ بنائے جا رہے ہیں۔

ڈاکٹر بجنوری

عترت صاحب کے ہاں سے دیوانِ غالب کا بھوپالی نسخہ مل گیا۔ ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری کے مقدمے کی دھوم سن رکھی تھی آج پڑھ بھی لیا۔ ڈاکٹر بجنوری کا علم و فضل آدمی کو پاؤں سے اکھاڑ پھینکتا ہے، مگر ان کی نثر کی قوت و عظمت کا جواب نہیں، دلیر آدمی تھا۔

(۲ر جنوری)

موسم اور تمباکو

روشن، تابناک دن جو اس موسم میں یہاں کم کم میسر آتا ہے، ہوا بدستور اتنی تیز اور خنک کہ آدمی دھوپ میں بھی کپکپاتا رہے۔ شملے میں آج کل کپکپاہٹ ہی تو

افراط سے دستیاب ہے۔ درختوں کی سب سے اونچی شاخوں پر بندروں کا آفتابی غسل دیکھنے کے لائق ہے۔ ہمارے تالاب گہرائی میں، اُن کے اونچائی پر۔

آغاجی (میرے ایک بزرگ سید محمد افضل شاہ صاحب) کے ہاں میانوالی کی طرف سے ایک مولوی صاحب مہمان اترے ہوئے ہیں۔ بعض فقہی مسائل پہ آغاجی کے کتب خانے سے استفادہ کرنے کے ارادہ سے آئے ہیں۔ کوئی دو مہینے تک آغاجی کی مہمان نوازی سے بھی استفادہ کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ دو ہفتے آئے کو ہو گئے، ڈیڑھ مہینہ اور قیام فرمائیں گے۔ سادہ لباس، سادہ طبیعت، البتہ حقّے سے بہت رغبت رکھتے ہیں۔ تمباکو کی خاص "برانڈ" جو صوبہ سرحد میں یا پنجاب میں پیدا ہوتی ہے استعمال کرتے ہیں۔ کوئی دوسرا اس تمباکو کا ایک کش بھی لگائے تو دم اکھڑ جائے۔ اپنے ساتھ جتنا تمباکو لائے تھے وہ دو ہفتوں میں پھُنک گیا۔ اب آغاجی حضرو کیمبل پور وغیرہ سے بذریعہ تار تمباکو منگوا رہے ہیں۔ ایک چھوٹا سا توڑا میں نے بھی گجرات سے منگوا کر آج ان کی خدمت میں نذر کیا۔ اب تمباکو کا سٹاک اتنا جمع ہو گیا ہے کہ مولوی صاحب بے شک اپریل مئی تک یہیں بیٹھے رہیں۔

۴ / جنوری

بُنڑے خان

گھر کا نقشہ ویسا ہی ہے جیسا بیوی کے چلے جانے کے بعد ہونا چاہیے۔ کجا کہ تھالیوں اور دیگچیوں میں منہ دیکھ لیتے کجا اب کہ دیگچی اور سالن کے رنگ میں تمیز کرنی مشکل ہے۔ بُنڑے خان (ملازم) بذاتِ خود بڑا دلچسپ آدمی ہے۔ کوئی چیز ڈھنگ کی نہیں پکا سکتا۔ مزے کی بات یہ کہ اپنی بیوی کو چار برس سے جگادھری میں اس کے ماں باپ کے ہاں محض اس قصور پہ بٹھا رکھا ہے کہ بھنڈی توری لعاب دار پکاتی ہے ـــــ بہر حال شکر ہے ہم لوگوں کا لنگر لشتم پشتم چل تو رہا

ہے۔ نسیم بھی میرے ہاں اُٹھ آئے ہیں۔

برما اور برف

برما سے بلبل (میرے دوست غلام علی بلبل ان دنوں برما کے محاذ پر صوبیداری کر رہے تھے) کا خط آتا ہے تو کچھ وقت خوشحال ہو جاتا ہے۔ حیرت ہے کہ وہ محاذ جنگ پر اتنے بے فکرے پن کے خط کیونکر لکھ سکتا ہے۔ مانا کہ وہ ہتھیار چلاتا نہیں ہتھیار ایشو (ISSUE) کرتا ہے۔ تاہم محاذ جنگ پر موجود ہے۔ چار گولے سولہ پنجاب رجمنٹ پر گرتے ہوں گے تو ایک گولہ ان کے (F.O.D.) فیلڈ آرڈی ننس ڈپو تک بھی پہنچ سکتا ہے۔ اب کے خط میں ایک نواحی قصبے کی زندگی کی ایسی منظر کشی کی ہے کہ میرا اپنا جی لہرانے لگا ہے کیسے کیسے کافر پیکروں کا ذکر کیا ہے ظالم نے، اور پھر بیاں اس کا!

برف باری شروع ہے اشجار سفید لٹھے کی چادریں لپیٹے جا رہے ہیں منظر سے پاکیزگی کا تقدس ہویدا ہے۔ برف کے گالے زمین پر آتے ہیں تو ایسا لگتا ہے آسمان سے نیکیاں برس رہی ہیں۔

انگریز برف سے خوب کھیلتے ہیں۔ ہم برف سے کتراتے ہیں۔ انگریز دوڑ دوڑ کر برف کی طرف جاتے ہیں انگریز بچوں کی ایک پوری سپیشل پتہ نہیں کہاں سے برف دیکھنے شملے آئی ہے۔ (۸۔ ۱۰ جنوری)

سنخی گوجر کا قتل

بھائی صاحب کے خط سے معلوم ہوا کہ ہمارے گاؤں کے قریب مدد کا مس نام گاؤں کے ایک معروف شخص سنخی گوجر کو کسی نے قتل کر دیا۔ گاؤں سے جو خط بھی آتا

ہے اس میں ایسی ہی خبریں ہوتی ہیں، فلاں کے بیل چوری ہو گئے، فلاں کے نقب لگ گئی، فلاں گاؤں میں دو پارٹیوں میں بلوہ ہو گیا آٹھ آٹھ آدمی دونوں طرف سے زخمی ہوئے۔ —— زندگی ہے یا کوئی طوفان ہے۔!!

(۱۴ر جنوری)

ادبی ضیافت

لاہور سے رسالہ بیسویں صدی اور ہفت روزہ "اداکار" کے پرچے موصول ہوئے۔ خوشتر گرامی کے تیر و نشتر مزہ دے گئے۔ سید عطاءاللہ شاہ ہاشمی (مدیر اداکار) فلمی صنعت کے بڑے دنبالہ دار لیڈر بنتے جا رہے ہیں۔ ان پرچوں کی آمد سے ادبی ضیافت کا اہتمام ہو گیا۔ ہمارے پڑوسی فرساد صاحب کہ دہلی کے شرفا میں سے ہیں نہ یہ بیسویں صدی پڑھ سکتے ہیں نہ "اداکار" کہ دونوں میں زبان کی اغلاط ہوتی ہیں۔ فرساد صاحب جیسا اجل عالم شاید کچھ بھی نہیں پڑھ سکتا۔ میرے پڑوس میں رہتے ہیں۔ جب کسی لفظ کا شبہ ہوتا ہے تو اس کا مخرج اور تلفظ اور سیدھا اُلٹا سب کچھ ان سے پوچھ لیتا ہوں۔ برف باری پہلے بھی ہوتی تھی مگر دھواں دھار برف تو کل سے گرنے لگی ہے۔ برف کے بغیر کوئی چیز نظر ہی نہیں آتی۔ شملے کی بیرونی دُنیا یوں بھی کٹی پھٹی دشوار گزار دُنیا ہے مگر اب تو شملہ بیرونی دُنیا سے یکسر کٹ گیا ہے۔ سنجولی میں رہنے والے لوگ آج دفتر نہ آسکے۔ جاکھو کے بندر البتہ دفتر کے پاس بکثرت گھومتے نظر آتے ہیں۔

(۲۷ر جنوری)

راجہ صاحب کوٹی

میں اور اکرم قریشی آئندہ گرمیوں میں ایک عظیم آل انڈیا مشاعرہ منعقد کرنے کا منصوبہ بنا رہے ہیں۔ امید ہے کہ حسبِ سابق گورمانی صاحب (نواب مشتاق احمد گورمانی) ہماری سرپرستی کریں گے۔ مسٹر آرتھر ہنری لال (آئی سی ایس) نے بھی

امداد کا وعدہ کیا ہے۔ بلکہ آج ان کا رقعہ لے کر میں اور اکرم قریشی، راجہ صاحب کوٹلی سے ملنے گئے کہ وہ اپنے خزانہ عامرہ سے دیودار کے چند درخت "چندہ" میں مرحمت فرما کر شکر گزار کریں۔ معلوم ہوا کہ راجہ صاحب اپنے پایۂ تخت میں گئے تھے اور اب برفباری کی وجہ سے وہیں پھنس گئے ہیں۔ بہت جلد بھی آئے تو مارچ میں آ سکیں گے۔ ان کے اہلکار بتا رہے تھے کہ اس موسم میں راجہ صاحب محل تو کیا اپنی پوستین سے بھی باہر نہیں نکلتے۔ (۳۰ جنوری)

فیض عالم چنگوی

امین اور نسیم چھٹی پر گھر گئے ہوئے تھے۔ ان کی غیر حاضری میں چوہدری فیض عالم چنگوی رات کو میرے ہاں آ کر سوتے ہیں۔ آپ گوجرخان کے قریب چنگا گاؤں کے رہنے والے ہیں۔ بہت پُرگو شاعر۔ اخلاقی شاعری کے ماہر۔ چٹکی بجاتے میں شعر کہہ لیں۔ پرانے کلام سے بیاضوں کی بیاضیں بھری پڑی ہیں۔ ہر روز دو ایک تازہ نظموں کا اضافہ ہو جاتا ہے۔ رات کے ایک دو بجے تک کلام سناتے ہیں۔ "چنگی" رونق رہتی ہے۔ باہر برفباری اندر فیض عالم چنگوی۔ ع

کشادہ دستِ کرم جب وہ بے نیاز کرے

لاٹری

ہم چند اہلکاروں نے دس دس روپے ماہوار کی ایک لاٹری ڈالی ہوئی ہے ہر مہینے جس کے نام نکلتی ہے اس کو یکمشت دو سو روپے مل جاتے ہیں۔ اس سوسائٹی کے بیشتر ممبر ملازمت کے ابتدائی زینوں پر بیٹھے ہیں ہر کسی کی خواہش ہوتی ہے کہ اس کے نام کی لاٹری جلد سے جلد نکلے۔ میری لاٹری ابھی تک نہیں نکلی۔

ہمارے مہتمم چوہدری عبدالغفور صاحب ایک زیرک بزرگ ہیں (۲ فروری)

کالکا سے شملہ

ایک ہفتہ گھر گزار کر آج واپس پہنچا۔ کالکا سے شملہ تک ریل سے سفر کیا۔ لالہ دینا ناتھ سویلین ڈپٹی اسسٹنٹ ایڈجوٹنٹ جنرل بھی ہمارے ڈبے میں سفر کر رہے تھے۔ لالہ دینا ناتھ موٹے تن و توش کے آدمی، تین من سے اوپر وزن۔ شملہ کے رکشا والے ان کو دیکھ کر راستہ چھوڑ جاتے ہیں۔ کالکا شملہ کی پہاڑی گاڑی کے چھوٹے چھوٹے ڈبوں میں ان کے لئے سفر کرنا پھانسی کے تختے پر جھولنے کے مترادف تھا۔ بمشکل نصف کے برابر سیٹ پر بیٹھ سکتے تھے۔ کالکا سے شملہ تک بے چاروں کی اوپر کی سانس اوپر اور نیچے کی نیچے الگ الگ چلتی ہوئی نظر آتی رہی۔

(۱۴ فروری)

چوہدری نور احمد

شام راگ رنگ کی محفل میں گزری۔ رنگ کم راگ زیادہ۔ لاہور سے محکمہ دیہات سدھار کے موسیقار انسپکٹر چوہدری نور احمد آج کل یہاں آئے ہوئے ہیں۔ خانصاحب عبدالصمد صاحب نے گیٹی تھیٹر میں ان کی نغمہ نوازی کا اہتمام کیا۔ ڈپٹی کمشنر ٹنڈن بھی موجود تھے۔ چوہدری صاحب کے گلے میں بڑا نور ہے، دیندار شخص ہیں۔ دیہات سدھار کے گیت سچے ذوق و شوق سے گاتے ہیں۔ کلامِ اقبالؒ ازبر ہے۔ راجہ حسن اختر ان کے فن کے بڑے قدردان ہیں۔ فارسی کلام بھی حافظؒ، عرفی و نظیری کا ان کو یاد ہے۔ لفظ موتیوں کی طرح الگ الگ رول کر ادا کرتے ہیں۔ پنجاب کے سابق کمشنر دیہات سدھار بریگیڈیئر ایف ایل برین سے ملنے کے

لئے یہاں آئے ہیں۔ بریگیڈیئر صاحب نے اگر ان کو وردی اوڑھوا دی تو بڑا لطف آئے گا۔ کام تو نغمہ نوازی ہی کا رہے گا۔

میجر ہارپر

جنرل ہیڈ کوارٹر کی ویلفیئر برانچ میں ایک میجر ہارپر کے بارے میں سنا تھا کہ کہ وہ آکسفورڈ یونیورسٹی کا پی ایچ ڈی ہے۔ انگریزی ادبیات کا عالم۔ انگریز فوجی افسروں میں اتنے زیادہ لکھے پڑھے لوگ کم ہوتے ہیں۔ ہارپر صاحب جبری بھرتی کے ریلے میں پکڑے گئے ہوں گے۔ آج ہم ان کو خاص طور پہ دیکھنے گئے۔ دفتر میں دوسرے افسروں کی طرح گھوڑے پر سوار آتے ہیں۔ مگر گھوڑے پر بیٹھے ہوئے صاف معلوم ہو رہا تھا کہ وہ خود آئے نہیں لائے گئے ہیں۔

(۲۰ر فروری)

مسحور انبالوی

سیّد دلبر حسن مسحور انبالوی کا انتقال ہو گیا۔ نوجوان شاعروں اور صحافیوں میں مرکزی حیثیت رکھتے تھے۔ اسلامیہ کالج لاہور کے ہونہار طلبہ میں سے تھے۔ رسالہ "کریسنٹ" کے ایڈیٹر بھی رہے۔ مولانا چراغ حسن حسرت کے حلقۂ دوستاں میں شامل تھے۔ انہی کے ہاں مَیں نے دلبر کو دیکھا تھا۔ نام دلبر، شخصیت میں اندازِ دلبری تھا۔ خاموش، خلیق، خوش پوش۔ (۲۶ر فروری)

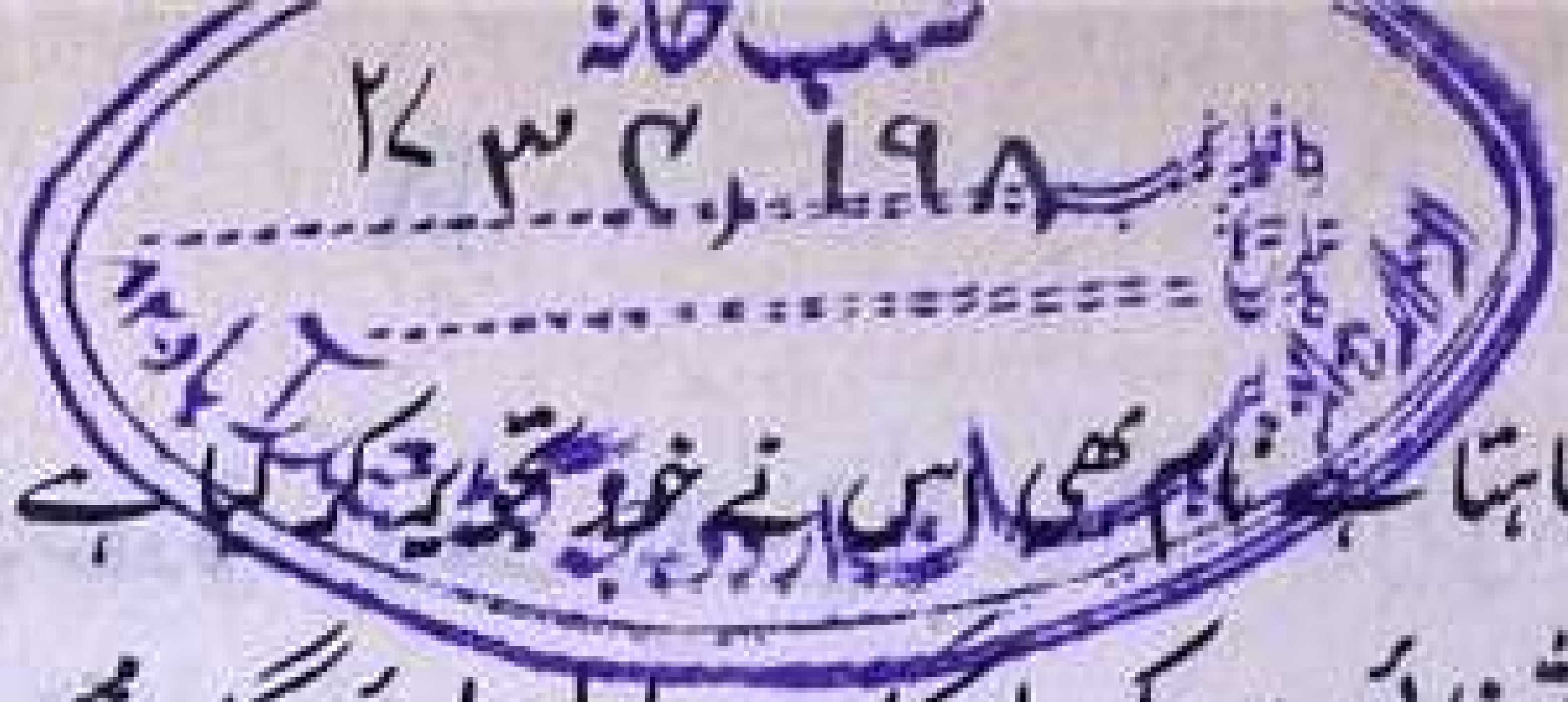
(مارچ۔ اپریل)

ہم بیاباں میں

مارچ کا مہینہ شروع ہوگیا —— ہم بیاباں میں اور گھر میں بہار آئی ہے۔ شملہ میرے کوہستان "پوٹھوار" کے مقابلے میں کہیں زیادہ سبز و شاداب ہے، اور سرخ و سفید ولائتی زندگی سے بھرا ہوا ہے۔ مگر خاکِ وطن کا ہر ذرّہ دیوتا ہوتا ہے۔ جاکھو کی چوٹی کو دیکھتا ہوں تو اپنا ٹنڈ منڈ "ٹلہ جوگیاں" سچ مچ دیوتا معلوم ہوتا ہے۔ یہ مہینہ موسمِ بہار کا نقیب ہے۔ سبزہ و گل انگڑائی لینے لگتے ہیں، مگر یہاں بہار کی خوشبوئیں ابھی تک برف کے کفن میں لپٹی ہوئی ہیں۔ اشجار اتنے گھنے ہیں کہ بے چارے کھل کر انگڑائی بھی نہیں لے سکتے۔

شہنائی

خورشید (ان کا اصلی نام کچھ اور ہے) دو مہینے میں ہی کلرکی سے اکتا گیا۔ مکتبہ کھولنا چاہتا ہے۔ دہلی یا علی گڑھ میں۔ یہ حضرت سیالکوٹ کے رہنے والے ہیں مگر یوپی کے اونچے اونچے گھرانوں سے روابط رکھتے ہیں۔ ان کی ایک بہن معروف شاعرہ ہیں پہلے بی اے بی ٹی تھیں اب ایم اے لکھنے لگی ہیں۔ خورشید خود میٹرک ہے۔ بہن ملازمت کرتی ہے مگر ملازمتیں جلد جلد بدلتی رہتی ہے۔ پچھلے دنوں اس کی ڈاک تسنیم چھتاری کی معرفت علی گڑھ جا رہی تھی۔ ملک کے ہر رسالے میں ان کی نظمیں چھپتی ہیں۔ اختر ہوشیارپوری سے اصلاح لیتی ہیں۔ خورشید کچھ دنوں سے میرے ہاں اٹھ آئے ہیں۔ میرا مجموعۂ کلام



چھپانا چاہتا ہے۔ نام بھی اس نے خود تجویز کر لیا ہے ـــــ شہنائی۔" کہتا ہے مکتبہ کا آغاز" شہنائی سے کروں گا ـــــ مارا جائے گا۔ مجھے یہ شہنائی بجتی نظر نہیں آتی۔

کپتان محمد عظیم

کپتان محمد عظیم صاحب کا خط آیا۔ (آپ پاکستان آرمی کے دو ممتاز افسروں میجر جنرل ریاض عظیم اور لیفٹیننٹ جنرل اعجاز عظیم کے والد ہیں) عظیم صاحب آج کل الہ آباد میں ملٹری اسٹیٹ آفیسر ہیں۔ خط میں چھاؤنی کے انگریز سٹیشن کمانڈر اور الہ آباد کی "نہرو" زندگی کا ایسا دلچسپ خاکہ کھینچا ہے کہ "واہ واہ" ہر فقرے کے ماتھے پر سیندور کی بندی جگمگاتی نظر آتی ہے۔ پُرلطف نثر لکھتے ہیں۔ کالا گوجراں (جہلم) کے رہنے والے ہیں۔ مگر اردو زبان کے "زنان خانے" میں آمدورفت رکھتے ہیں۔ گفتگو میں ان کی پھلجڑیاں شنیدنی ہوتی ہیں۔ افسوس دفتری فائلوں کی نذر ہو گئے ورنہ ادیب خوش نگار ہوتے۔

اکرم کا شوق

ہمارے دوست اکرم قریشی کو ایک شوق تو جلسے کرنے کا ہے اور دوسرا شوق بڑے لوگوں کو خط لکھنے کا ہے۔ اوسطاً چھ سات خط روزانہ لکھتا ہے۔ دو تین خطوں کے جواب بھی آجاتے ہیں۔ ملک میں شاید ہی کوئی خان بہادر ہو گا جس کو اس نے مبارکباد کا خط نہ لکھا ہو۔ حرف کے جادو کا محرم ہے۔ تحریر ایسی بنا سجا کر لکھتا ہے کہ دل موہ لیتا ہے۔ آج کی ڈاک میں خان بہادر اللہ یار خان دولتانہ رئیس لودھراں ایم ایل اے پنجاب اسمبلی کا خط دکھایا۔ ان کو پارلیمنٹری سیکرٹری بننے پر مبارکباد دی تھی۔ خان بہادر لوگ عموماً دوہرے تہرے جثے کے لوگ ہوتے ہیں۔ مگر خان بہادر اللہ یار خان دولتانہ کا خط بہت باریک باریک لفظوں میں تھا۔ خود اُنؒ کے اپنے ہاتھ کا انگریزی

میں لکھا ہوا خط مختصر سا خط۔ سادہ سا کاغذ۔!!

موہن بھوج

برج موہن کے بہلوٹھی کے "منے" کی دعوت پچھلے چھ مہینے سے لٹکی ہوئی تھی۔ کسی اتوار دوست جمع نہ ہو سکتے۔ کسی اتوار اس کی دھرم پتنی کی خاطر جمع نہ ہوتی۔ آج یہ چوکڑی بھی جم گئی۔ برج موہن خود امرتسر کا رہنے والا ہے۔ دھرم پتنی کاشی کی ہاتھ آئی ہے یہاں بالوگنج میں ایک چھوٹے سے چوبی مکان میں رہتا ہے۔ جو اتنی ہی چھوٹی سی ایک ٹیکری پر واقع ہے۔ آندھی میں ڈر رہتا ہے کہ برج موہن کا مکان اڑ گیا ہوگا یا اس کے پاؤں تلے سے ٹیلہ نکل گیا ہوگا۔

برج نے بڑی چاہت کا بھوجن کھلایا۔ ہر طرح کے دستوں کا جمگھٹا تھا۔ تھال میں آٹھ دس "کولیاں" چنی ہوئی تھیں۔ دہی پکوڑیاں، سبزیاں، چٹنیاں، اچار، پوریاں کڑاہی سے نکل کر سیدھی ہمارے تھالوں میں آ کر گرتیں۔ کڑاہی میں جو بھاپ ان کے اندر بھرتی وہ ہمارے منہ سے نکلتی۔ برج سے ہمارا ناطہ فارسی شاعری کے ناطے سے بھی تھا۔ وہ نوجوان ہندو شاعروں کا تلوک چند محروم ہے۔

ریلوائی مشاعرہ

غلام ربانی ربانی ریلوے اسٹیشن پر "گڈز کلرک" ہے۔ جب ملے شاعری کا "پارسل" کھول کر بیٹھ جاتے ہیں۔ جاکھلی کے رہنے والے ہیں۔ کھڑی اردو میں کھڑکھڑاتا ہوا شعر کہتے ہیں۔ دوسرے تیسرے مہینے اپنے کوارٹر میں مشاعرے کی محفل سجاتے ہیں تین بجے کالکا میل پہنچتی ہے۔ چار بجے مشاعرہ چل پڑتا ہے۔ "کالکا سے شملہ تک" جس جس اسٹیشن پر کوئی ریلوے ملازم شعر کہتا ہے وہ اس روز کالکا میل سے ان کے مشاعرے میں پہنچ

جاتا۔ مہمانوں کی تواضع تازہ موسمی میووں سے کی جاتی ہے جن کے پارسل کالکا میل ہی سے آتے ہیں ــــ آج ان کے ہاں میرا دوسرا اور عبدالسلام کوثر لدھیانوی کا چوتھا مشاعرہ تھا سب سے زیادہ داد جھنگ کے اسٹیشن ماسٹر پنڈت مرلی دھر مرلی کو ملی۔ ایک تو وہ سب میں سینئر تھے دوسرے وہ اپنے ساتھ امرتیوں کا تحفہ لائے تھے۔

حفیظ رومانی

جہلم چھوڑنے کا ہمیں ایک صدمہ یہ بھی ہے کہ ہم حفیظ رومانی سے بچھڑ گئے۔ رومانی نہر کے محکمے میں ملازم ہیں۔ اس کے تازہ خط سے معلوم ہوا کہ ان کی سرکاری نہر تو مرمت کے لئے بند ہے البتہ ان کی ادبی نہر طغیانی پہ جا رہی ہے۔ آج کل ایک فلمی ڈرامہ لکھ رہے ہیں۔ حمید کے تعاون کے ساتھ ایک ڈرامہ مقامی سینما میں اسٹیج کر رہے ہیں۔ جو معیار میں کامیاب اور دینار یعنی آمدنی کے لحاظ سے ناکام رہا۔ ڈپٹی کمشنر کو الگ خفا کر بیٹھے ہیں کہ ڈرامے میں ایک منظر کچہری کا بھی دکھا دیا۔ اپنی تازہ تصویر بھی بھیجی ہے قلمیں لمبی ہو گئی ہیں طبیعت ایکٹری کی طرف جھکی ہوئی ہے۔ یوں خوش ہیں۔ گورنمنٹ گرلز ہائی سکول کا ایک طواف کرنا روزانہ کا معمول ہے۔ بڑے بھائی کی داڑھی لمبی اور نمازیں بھی لمبی ہوتی جا رہی ہیں۔ دونوں بھائی اپنی آل اولاد کے ساتھ ایک ہی گھر میں رہتے ہیں۔

وار فرنٹ

ڈپٹی کمشنر مسٹر ٹنڈن نے گیتی تھیٹر میں کچھ لوگوں کو اس مشورے کے لئے طلب کیا ہے کہ "وار فرنٹ" کی سرگرمیوں کو کیونکہ تیز کیا جائے۔ محاذ پہ تو جنگ سرد پڑتی جا رہی ہے مگر یہاں سرگرمیاں گرم کی جا رہی ہیں ؎

دریا کو اپنی موج کی طغیانیوں سے کام
کشتی کسی کی پار ہو یا درمیاں رہے

میٹنگ میں چند سرکاری افسر، چند ادیب، شاعر، فن کار اور پانچ چھ خان بہادر اور رائے بہادر۔ دو رائے بہادروں کو دہلی سے خاص طور پر بلوایا گیا۔ سردیوں میں رائے بہادر اور خان بہادر نیچے میدانی شہروں میں چلے جاتے ہیں۔ ان میں سے ایک رائے بہادر پورن چند تھے۔ سکھوں کی نمائندگی سردار بہادر کیپٹن فتح جنگ سنگھ ایم ایل اے آنریری ریکروٹنگ آفیسر کر رہے تھے۔ ٹنڈن صاحب نے انہیں پوچھا کہ گورمکھ آپ ہی بتائیے کہ وار فرنٹ کو کیونکر تیز کیا جائے۔ انہوں نے کہا "آہاں" کی سمجھ میں تو ایک ہی تجویز آئی ہے کہ ریلوے اسٹیشن پر فوجیوں کے لئے تیز چائے کی ایک اور کنٹین کھول دی جائے۔ اس پر ٹنڈن صاحب نے رائے بہادر پورن چند کی طرف دیکھا۔ رائے بہادر نے اُٹھ کر نمسکار کیا اور ایوان کو خوشخبری دی کہ کنٹین کل ہی سے کھل جائے گی۔ خان بہادر مہدی علی شاہ نے جن کا شملہ میں ہوٹل ہے ہنستے ہنستے کنٹین پر اپنی بیکری کے بسکٹ بھجوانے کا وعدہ کیا۔ آج کی چائے پر بھی نمونے کے بسکٹ کھلائے گئے۔

ادیبوں کے نمائندوں میں راولپنڈی کے خورشید علی بٹ بھی شامل تھے۔ ایک منہ پھٹ شخص۔ چائے پر اس نے ٹنڈن صاحب سے کہہ ہی دیا کہ جناب شملے میں فوجیوں کے لئے کنٹین تو کھل جائے گی مگر فوجی کہاں سے آئیں گے؟

رسالہ زیب النساء

لاہور سے رسالہ زیب النساء کا نیا شمارہ موصول ہوا۔ یہ عورتوں کا رسالہ ہے جس کو ایک مرد چلا رہا ہے۔ ان کا نام شیخ نواب ہے۔ آپ شاعر رومان حضرت اختر شیرانی کے مشہور و مقبول رسالے "رومان" کے منیجر ہوا کرتے تھے۔ منیجر کیا رسالے کے

کرتا دھرتا وہی تھے۔ فلیمنگ روڈ پر دفتر رومان میں ان سے اکثر ملاقات رہتی۔ مرنجاں مرنج انسان، اختر شیرانی کی ٹہل سیوا کرنے میں مستعد، پانچ وقت کے نمازی، مگر ان کی کوشش ہوتی کہ اختر شراب ان کے سامنے پیا کریں تاکہ نوبت چوتھے پیگ سے آگے نہ بڑھ سکے۔ کاروباری لحاظ سے آپ نے نقصان اٹھانے کے لئے رومان اور نفع کمانے کے لئے زیب النسأ جاری کیا۔ مجھے اپنا پرچہ برابر بھجواتے رہتے ہیں۔ خود ادیب نہیں ہیں مگر مضمون کی خوشبو سونگھ لیتے ہیں کہ کون سی تحریر چلنے والی ہے اور کون سی بیٹھ جانے والی۔

حکیم محمد یوسف حسن

حکیم محمد یوسف حسن صاحب ایڈیٹر نیرنگِ خیال کا خط آیا۔ میں نے ان کے رسالے کے لئے ایک چیز بھیجی تھی، آپ کو پسند آئی۔ حکیم صاحب کو بھی لاہور میں فلیمنگ روڈ پر دیکھتا تو رہا ہوں مگر دُور ہی دُور سے۔ ملاقات کا موقع کبھی پیدا نہ ہوا۔ آج ان کے ہاتھ کی تحریر مل گئی۔ رسمی سا، چار لفظی خط ہے!!۔

رہ گیا،، صوبہ بہار سے رسالہ" ندیم" کا تازہ پرچہ ملا۔ اُردو زبان کے جھنڈے کہاں کہاں تک گڑے ہیں؟

ریڈیو کا مشاعرہ

دہلی ریڈیو سے مشاعرہ سُنا۔ حفیظ جالندھری، جگر مراد آبادی، جوش ملیح آبادی، سکھ دیو پرشاد، بسمل اور بعض دوسرے شعرأ۔ بسمل کے پڑھنے کی ادا نے بسمل کر دیا۔ حفیظ صاحب کی اپنی چھاپ ہے۔ وہ بیچ بیچ میں نثر بھی بولتے جاتے .... جوش سنو! جگر عرض کیا ہے۔ وغیرہ، نوجوان شعرأ میں شکیل بدایونی نے سماں باندھ دیا۔ (۱۹ مارچ)

بریگیڈیئر حنّا

ہمارے ایڈجوٹنٹ جنرل ہمیں کبھی نظر نہیں آئے سُنا ہے ان کی ایک ٹانگ لکڑی کی ہے۔ البتہ ہمارے ڈائریکٹر بریگیڈیئر حنا صاحب ایم بی اے برآمدے میں آتے جاتے نظر آتے ہیں۔ سُرخ چہرہ، سُرخ بال، سرخ فیتہ، حنا رنگ وحنا بند۔ شملے کی مشہور شخصیت' خان بہادر مہدی علی شاہ کے نام پر' ہم ان کو بریگیڈیئر مہدی علی شاہ کہتے ہیں۔ آج ان سے گفتگو کی نوبت بھی آ گئی۔ میرے سویلین ڈی۔ اے۔ اے۔ جی کو جو میجر کے برابر ہوتا ہے۔ "صاحب" سے کچھ فائلوں پر "سپیک SPEAK کرنا تھا" "ڈی۔ اے۔ اے۔ جی صاحب" نے ہمیں بار برداری کے لئے استعمال کیا۔ فائلوں کا پشتارہ اٹھوا کر اپنے ہمراہ لے گئے۔ "ڈی۔ اے۔ اے۔ جی" جاتے ہوئے بھی کانپ رہے تھے۔ اندر جا کر پہلی "سپیک" پر ہی ایسی ڈانٹ پڑی کہ ان کے قدم زمین سے اُکھڑ گئے۔ بریگیڈیئر نے چنگھاڑ کر حکم دیا "جی ون" (G-1) کو بلا لاؤ۔ ڈی اے اے جی کے ساتھ مَیں بھی الٹے پاؤں گھومنے لگا۔ تو بریگیڈیئر نے پوچھا تم کون ہو؟ —— نئے چہرے میں مزید دلچسپی لیتے ہوئے ایک ہی سانس میں مزید تین سوالات پوچھ لئے —— کہاں کے رہنے والے ہو! ذات کیا ہے! تعلیم کتنی ہے؟ اس پر مَیں بھی کانپنے لگا۔ مگر اس نے مہربان ہو کر۔ پردے کی آڑ میں بیٹھی ہوئی ایک ویکائی کو "کوفی" بنانے کو اور مجھے سامنے کرسی پر بیٹھنے کے لئے کہا۔ یہ معلوم کر کے کہ مَیں جہلم کا رہنے والا تھا فرمایا —— مَیں ۸۵ سکھ کے ساتھ جہلم چھاؤنی میں رہ چکا ہوں۔ روہتاس لائنز کے قریب اس کوٹھڑی میں رہتا تھا جہاں "آک" (فیلڈ مارشل آنلک) نے لفٹیننی کا زمانہ گزارا تھا۔ کوفی آئی تو مجھے بھی ایک پیالہ اصرار سے دیا۔ پہلے گھونٹ پر کہا تم تو مارشل علاقے سے تعلق رکھتے ہو۔ دفتری گھِس گھِس میں کہاں آن پڑے ہو۔ کمیشن کے لئے درخواست دو۔ میں تمہارے

ڈپٹی کمشنر کو لکھوں گا۔ سوائے اس کے کہ سید ہو بظاہر تم میں کوئی اور کمی مجھے دکھائی نہیں دیتی۔ میں نے اپنے کمیشن کو زیادہ پختہ کرنے کے خیال سے عرض کیا۔ جناب میں پوئٹ (POET) ہوں۔ یہ لفظ سنتے ہی اچھے بھلے پائپ کے مرغولے اڑاتے ہوئے بریگیڈیئر کا رنگ اور لہجہ دفعتاً تبدیل ہو گیا۔ کہا ——— آئی سی۔ ویل اب ہم سمجھا SO THIS IS THE SONG (یہ گڑبڑ ہے تمہارے ساتھ) چنانچہ کل کی طرح آج بھی۔ ع

تڑپے ہے مرغ قبلہ نما آشیانے میں

اُنیس زندگی

گجرات سے اُنیس (میری مرحومہ بیوی) کا خط آیا۔ طویل خط۔ یوں تو اس کا مختصر خط بھی طویل ہو جاتا ہے کہ لفظوں کے درمیان لمبے لمبے فاصلے چھوڑتی جاتی ہے مثلاً ڈبل روٹی کو " ڈ بل ر و ٹی " لکھے گی۔ لباس بھی کھلا کھلا پہنتی ہے۔ آج کے خط میں کوائفِ خانہ کی روداد کچھ تھی بھی طویل۔ وہی مقدمہ کہ میں کہتا ہوں کہ آ بھی جاؤ اور والدین کہتے ہیں ہماری آنکھوں کے سامنے رہو۔ اکلوتی اولاد کا یہ بڑا مسئلہ ہوتا ہے۔ ان کو تو سمجھا نہیں سکتی۔ میرے نام لمبے لمبے "درسِ نظامی" لکھتی رہتی ہے۔ طوطے کی تصویروں والی چینی کی نفیس پلیٹوں کے بارے میں بار بار تاکید لکھی ہے کہ خبردار! خبردار جو ان کو ہاتھ لگاؤ۔ آئے گی تو پتہ چلے گا کہ چھ میں سے چار پلیٹیں ہنرے خان (ملازم) کے ہاتھوں لوٹ چکی ہیں۔ یہ پلیٹیں ان کے چچا جو کوئٹہ میں سیشن جج تھے، ایران سے لائے تھے۔

شیش محل

بازار میں شوکت تھانوی کی نئی کتاب "شیش محل" مل گئی۔ خرید لایا۔ ایک سانس میں

پڑھ گیا۔ شخصیات کے خاکے ہیں، بے حد دلچسپ، سطر سطر سے ظرافت کا چشمہ ابل رہا ہے۔ مجھے ان کی یہ کتاب بطور خاص پسند آئی۔ جی چاہتا ہے ہمارا تذکرہ بھی اس میں ہوتا۔ مگر آج تک ان سے ملاقات ہی نہیں ہوئی۔ "شیش محل" "سرپٹ مزاح" کی ایک لذیذ تصنیف ہے۔

محفلِ سرود

کل رات جلیل صاحب کے یہاں محفلِ سرود میں رتجگا رہا۔ جلیل اتنے خوبصورت ہیں کہ ان کا نام شکیل ہونا چاہیئے تھا۔ اکثر سارنگی نواز اور موسیقار، دفتروں کے اہل کار تھے۔ دو اُستاد انبالہ سے بلوائے گئے۔ سامعین میں دہلی سے کنور مہندر سنگھ بیدی بھی متوقع تھے۔ مگر وہ نہ آسکے۔

مئی جون

جنگلی انار

پچھلے چند دنوں سے ہمارے ہاں ایک نیا ملازم لڑکا کام کر رہا ہے۔ آغا جی نے بھجوایا تھا۔ تیرہ چودہ برس کا ہوگا۔ مگر جوانی کی جوالا بڑی شدّت سے پھوٹ پڑی ہے، روپڑ کا باشندہ۔ بے انتہا خوش شکل۔ نام انار خان۔ چہرہ سڈول قندھاری انار۔ میں اس کو جنگلی انار کہتا ہوں۔ دو تین مہینے بلتی محلے میں لکھ پتی رئیس سید نجف شاہ کے ہاں ملازم رہا۔ شاہ صاحب، جو اسّی نوّے برس کے پیٹے میں ہوں گے۔ اس "بچونگڑے" سے میٹھی چاپی کی ڈیوٹی لیتے تھے۔ حیران ہوں، وہاں سے بھاگ کر، ہم قلندروں کے ہاں کیسے آگیا۔ سامنے ویدجی کی دکان پر جوشاندہ کی پڑیا لینے گیا تو ویدجی نے اس کو سونف کی لفافیاں بنانے کے لئے بٹھا لیا۔ ایک درجن لفافیوں کا ہدیہ دو روپے اس کی نذر کیا۔ جوشاندہ مفت۔ دو روپے روز کا یہ وظیفہ بندھ گیا ہے۔ ویدانی جی بھی، جو ایک تھل تھل کرتی کامنی نار ہے، دوسری تمام سیڑھیاں چھوڑ کر، ہماری سیڑھیوں ہی سے اوپر نیچے جاتی ہیں۔ دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت، حُسن کچھ شاہی محلوں ہی کی میراث تو نہیں ہے؟

چھٹی کا دن بیکار گیا۔ نہ کوئی شعر ہوا۔ نہ کوئی کتاب پڑھی۔ نہ کسی یارِ دلنواز کا کوئی خط آیا۔ نہ سیر ہی کو نکل سکے۔ انیس کی طبیعت ناساز تھی۔ ہم بھی جمادات بنے رہے۔

پنجاب کی سیاست

پنجاب کی سیاست کا اونٹ کسی کروٹ بیٹھنے میں نہیں آ رہا۔ مسٹر جناح اور خضر حیات ٹوانہ کے مذاکرات ناکام ہو گئے۔ کابینہ میں سردار شوکت حیات کی جگہ خالی پڑی ہے۔ حکومت خضر کے ساتھ ہے۔ رائے عامہ ان کے خلاف ہے۔ وزارت کے سلسلے میں بہت سے نام لئے جا رہے ہیں۔ اچنبھے کی بات ہے کہ بعض لوگ وزارت سے انکار کر رہے ہیں۔ راجہ غضنفر علی خان اور میر مقبول محمود نے وزارتی پارٹی سے استعفا دے دیا۔ حالانکہ راجہ صاحب وزارت کے لبِ بام تک پہنچ گئے تھے۔ راجہ صاحب کی طبیعت میں بغاوت کی لکیر ابتداء ہی سے موجود رہی ہے۔ گورنمنٹ کالج لاہور میں پڑھتے تھے تو کسی بات پر کالج سے نکالے گئے۔ وہ پیدا تو پنڈ دادنخان میں ہوئے ہیں مگر طبیعت موچی دروازہ لاہور کی پائی ہے۔ مسلم لیگ زور پکڑ رہی ہے۔

ایک اعلان نظر آیا چوہدری چھوٹو رام (وزیر پنجاب) شملے میں کالی باڑی ہال میں کیمونل ہارمنی (COMMUNAL HARMONY) کے موضوع پر تقریر کریں گے۔ جاٹ آدمی انگریزی میں کیا تقریر کرے گا۔ یہ تماشا بھی دیکھنا چاہیئے۔ چھوٹو رام کی تقریر بجا، مگر ہندو کے چھوٹے دل کا علاج ؟

مسٹر جناح

پنجاب کی وزارتی الجھن مزید اُلجھتی جا رہی ہے۔ مسلم لیگ کا وزن بڑھ رہا ہے مسٹر محمد علی جناح پنجاب کا دَورہ کر رہے ہیں۔ سیالکوٹ میں ان کے جلسے میں بہت بڑا اجتماع تھا۔ مہاشے کرشن کا اخبار (پرتاب) واویلا مچا رہا ہے۔ اس کے یہ معنے ہیں کہ خضر حیات کی مخالفت زور پکڑ رہی ہے۔

بریگیڈیئر برین

بریگیڈیئر برین نے بلوا بھیجا۔ آج سہ پہر چھوٹے شملے میں ان کی کوٹھی پر ملاقات ہوئی۔ وہ ہمارے ضلع (جہلم) میں ڈپٹی کمشنر رہ چکے ہیں۔ دیہات سدھار تحریک کو اپنا مشن بنا رکھا ہے۔ اس موضوع پر سقراط کے قلمی نام سے کئی کتابیں لکھ چکے ہیں۔ آج کل فوج کی وردی پہن رکھی ہے۔ شملے میں نواب مشتاق احمد گورمانی کے توسط سے ان تک رسائی ہوئی۔ نواب صاحب نے ان سے میری سفارش کی ہے کہ فوج میں میرے "کمیشن" کے لیے وہ کچھ سعی کریں۔ آج جب دفتر میں ان کا پیغام ملا تو حیرت ہوئی۔ جب میں پہنچا تو بریگیڈیئر صاحب صرف ایک خاکی نیکر پہنے کوٹھی کے لان میں اکیلے بیٹھے تھے۔ سامنے تپائی پر دو خالی پیالیاں چائے کی اور ایک پلیٹ میں چند دانے خوبانیوں کے رکھے تھے۔ پاس ایک متوسط قامت کا جھبا کتا، ان کے ایک ہاتھ کی ہتھیلی چاٹ رہا تھا۔ میں "گڈ ایوننگ سر" کہہ کر بیٹھا تھا کہ بیرا (نام نادر خان) چائے اور بسکٹ لے کر آ گیا۔ نادر خان ان کے مزاج میں بہت دخیل نظر آیا۔ بریگیڈیئر صاحب نے ایک بسکٹ کتے کے منہ میں رکھا تو نادر خان نے تقریباً ڈانٹتے ہوئے کہا۔ "آپ اس کا دماغ خراب کر دے گا۔" غالباً اس کی مراد کتے کے معدے سے تھی۔

مجھ کو انہوں نے یوں طلب کیا تھا کہ میں دیہات سدھار کے سلسلے میں ان کے انگریزی میں لکھے ہوئے پمفلٹ کو اردو میں منتقل کر دوں۔ اس پمفلٹ میں مکانوں میں روشن دان رکھنے کے فوائد پر روشنی ڈالی گئی ہے میں یہ مسودہ لے آیا ہوں۔ آپ کے اس قسم کے کام کوئی خان وصیت یاب خان کیا کرتے تھے۔ مگر وہ گڑھ گاؤں میں رہتے تھے۔ (۱۹۵۲ء میں ان وصیت یاب خان صاحب سے کراچی میں ملاقات ہوئی۔ آپ اب ابوالاثر حفیظ جالندھری کے لٹریری اسسٹنٹ تھے)

بریگیڈیئر صاحب کی مونچھیں تو مونچھیں، بھنویں تک سفید ہو گئی ہیں۔ سر پہ کانوں کی لوؤں کے اوپر دو چار بال رہ گئے ہیں باقی تمام رقبہ صفا چٹ۔ فوج کی ویلفیئر برانچ سے وابستہ ہیں۔ فوجی افسروں والی پھوں پھاں چھو کر بھی نہیں گئی۔ اردو ہمارے پٹواریوں، گرداوروں کی طرح بول لیتے ہیں۔ نادر خان کو میرے سامنے کہا ـــــ "طوطے کو پانی پلانا ـــــ"
جب میں کوٹھی سے نکلا تو نادر خان گھوڑے کو پانی پلا رہا تھا۔ مجھے دیکھا تو ہنس کر بولا "ہمارا صاحب وی عجیب مرغا ہے۔ گھوڑے کو طوطا کہتا ہے۔" پانی کے نلکے پر ایک دوسرا گھوڑا بھی کھڑا تھا معلوم ہوا یہ حافظ عبدالمجید (آئی سی ایس) کا گھوڑا ہے۔ آپ حکومت پنجاب میں کچھ لگے ہوئے ہیں۔ حکومت پنجاب اگلے ہفتے آ رہی ہے۔ گھوڑا پچھلے ہفتے پہنچ گیا (حافظ عبدالمجید صاحب حکومتِ پاکستان کے فنانس سیکرٹری رہے)

پانچ روپے فی بیٹا

شہر میں آج کل ڈاکٹر حمید ایک نجومی کی بڑی دھوم ہے۔ انیس کو وہم ہے اس پر کسی نے جادو کر کے اولاد کی "پڑی" بند کر رکھی ہے، جہاں کسی نجومی جوتشی کی خبر سنتی ہے ضرور وہاں پہنچتی ہے۔ مہینے میں ہمارا اتنا خرچ دودھ دہی پر نہیں اٹھتا جتنا جوتشی نجومی پر اٹھتا ہے۔ سوال ہمیشہ وہی۔ میرے ہاتھ میں اولاد ہے یا نہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے چار بیٹوں کی خوشخبری دی ہے اور اس خوشخبری کے بیس روپے وصول کیے۔ گویا پانچ روپے فی بیٹا۔ ڈاکٹر صاحب امپریل ہوٹل میں مقیم ہیں۔ مرد و زن کا ایک میلہ ان کے کمرے کے سامنے لگا دیکھا۔ وہ خود کمرے کے اندر اولادِ نرینہ کا خوانچہ لگائے بیٹھے تھے (کوئی دو اڑھائی ماہ بعد انیس کا انتقال ہو گیا اس کے بطن سے کوئی اولاد نہ ہوئی۔)

احمد ندیم قاسمی

احمد ندیم قاسمی کے خط کا جواب آیا۔ اس شخص سے رابطہ رکھنے کو دل چاہتا ہے۔ لاہور میں ہم دونوں اختر شیرانی کے پاس بیٹھا کرتے تھے (۳۹-۱۹۳۸ء) ان دنوں کی یاد تازہ ہوگئی۔ کیا ہما ہمی تھی۔ اختر کا حجرہ کیسے کیسے لوگوں کا آستانۂ ارادت تھا۔ ندیم زینوں سے نیچے اتر رہا ہے تو راجہ مہدی علی خان اوپر چڑھ رہا ہے۔ اختر شیرانی بستر میں لیٹے ہیں اور اپندر ناتھ اشک ان کے سامنے اپنا افسانہ پھیلائے بیٹھا ہے۔ عبدالمجید بھٹی کے قہقہے گونج رہے ہیں اور شیخ نواب کی ناک کے اندر ہلکی غٹرغوں، غٹرغوں (رسالہ زیب النساء کے بانی)۔ اختر ہوشیار پوری آج کل مجھ سے کچھ خفا سا رہتا ہے۔ میں نے خورشید علی بٹ اور عزیزیہ ملک سے کہا ہے۔ یارو! میری صلح کرا دو، ——— اختر شیرانی سے اختر ہوشیار پوری تک۔

کچھ پنجاب کچھ علی گڑھ

سر محمد جمال خان لغاری اور ملتان کے نواب عاشق حسین (۱۹۷۶ء میں پنجاب کے وزیر اعلیٰ نواب صادق حسین قریشی کے والد ماجد) خضر حیات خان کی کابینہ میں شامل ہو گئے۔ چلئے، اونٹ کسی کروٹ تو بیٹھا۔ (۱۶ رمئی)

علی گڑھ میگزین کا نیا شمارہ ہاتھ آگیا۔ اچھے اچھے علمی جرائد سے آگے دم رکھتا ہے۔ ورق ورق علی گڑھ کی خوشبو سے معطر۔ ہمارے حلقے میں خان حکمت اللہ خان علی گڑھ کے "سفیر" ہیں۔ آپ ہمیں دن میں دو چار مرتبہ "علی گڑھ" سونگھاتے رہتے ہیں۔

ڈاکٹر تاثیر

اکرم قریشی اور کوثر نے امسال پھر آل انڈیا مشاعرے کا ڈول ڈال دیا۔ کوثر مال روڈ کے درزیوں سے دو دو سو روپے کے دو عطیات کا وعدہ بھی لے آیا۔ ایک درزی نے ساغر نظامی کی اور دوسرے نے کیف دہلوی کی فرمائش کی ہے۔ ساغر تو مشہور شاعر ہیں۔ مگر یہ کیف کون ہیں؟ کوثر کی اطلاع ہے کہ وہ دہلی کے کوئی حکیم ہیں۔ حکمت سے زیادہ شاعری چلا رہے ہیں۔ اکرم کا خیال ہے کہ ان کے چار سو روپوں میں سے ہم پچاس ساٹھ روپے کا ایک تیسرا شاعر بھی دہلی یا لدھیانے سے بلوا لیں گے۔

ڈاکٹر تاثیر شملے میں ادیبوں کے قطب ہیں۔ آج ہم لوگ ان سے بھی ملے۔ انہوں نے گرمجوشی سے تعاون کا وعدہ کیا۔ ململ کے کرتے پر پشمینے کی چادر اوڑھ رکھی تھی۔ کہنے لگے فیض سے میں کہہ دوں گا۔ لاہور کی پوری پوری نمائندگی ہو۔ صوفی اور عابد سے ملے بہت دن ہو گئے۔ قیوم نظر کو ضرور بلوائیے۔ مصرعہ طرح کی تجویز کو ناپسند کیا۔ "شاعری کو زنجیروں سے نکلنے دو" وہ باتیں کرنے کے موڈ میں تھے۔ ہماری آمد پر ایک نیا، بہت لمبا اور موٹا سگار سلگا کر بیٹھے تھے۔ مگر ان کی والدہ محترمہ آج ان کے پاس ٹھہری ہوئی ہیں جو اندر سے "محمد دین، محمد دین" کہہ کر بار بار ان کو آوازیں دے رہی تھیں۔ اور محمد دین ہر آواز پہ "آیا جی، آیا جی" کہہ کر بار بار اندر بھاگ رہا تھا۔

مولوی فتح محمد

روہتاس سے مولوی فتح محمد صاحب کا خط آیا۔ مولوی صاحب ہمارے علاقے کی ایک بے حد محترم شخصیت ہیں۔ لوگ ان کی پارسائی اور راست بازی کی قسم کھاتے

ہیں۔ مقدس صورت، اخلاق و شرافت کا نمونہ۔ خدمتِ خلق کے لئے وقف۔ علاقے میں بے شمار خاندانوں کے اندرونی تنازعے ان کی مصالحت کی برکت سے سمٹے رہتے ہیں۔ ان دنوں میرا ایک ہم جماعت تھانہ دینہ میں چھوٹا تھانیدار ہے۔ اس نے روہتاس کے ایک نواحی گاؤں کے ایک "ملیار" کو خواہ مخواہ پھانس رکھا ہے۔ مولوی صاحب نے مجھے خط لکھا ہے کہ یہ شخص بے گناہ نہ ہوتا تو میں کبھی اس کی سعی و سفارش کی تحریک نہ کرتا ـــــ خط میں قرآن کریم کی ایک دعا بھی لکھ بھیجی ہے کہ نماز فجر کے بعد پڑھا کرو۔

سر عزیز الحق

ہم لوگ مشاعرے کا صدر ڈھونڈ رہے ہیں۔ آج سر عزیز الحق ممبر کامرس سے ملے۔ انہوں نے کانوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے معذرت چاہی۔ کہنے لگے مشاعرے میں میرا کیا کام۔ البتہ کوئی مذہبی تقریب ہو تو "دلِ ما روشن چشم ما شاد" فرمایا مشاعروں میں وقت ضائع نہ کرو۔ مسلمانوں کو فنی علوم کی تحصیل کی ترغیب دو۔ تم اگر اس قسم کی انجمن قائم کرو تو میں تمہارے ساتھ ہوں۔ اکرم قریشی نے وہیں ایک دوسری انجمن کی بنیاد ڈال کر سر عزیز الحق کو اس کا سرپرست بنا دیا۔ ساتھ ہی ان سے استدعا کی کہ ذرا اپنا سٹینوگرافر بلوا کر انجمن کے اغراض و مقاصد بھی آپ ہی لکھوا دیں۔ سر عزیز الحق نے اغراض و مقاصد کا ایک ہی جملہ بولا تھا کہ منٹگمری (ساہیوال) کے سر دتار سنگھ آ گئے۔ ان کے پیچھے پیچھے بھائی فتح جنگ سنگھ ایم ایل اے (پنجاب)۔ سر دتار سنگھ کو جب معلوم ہوا کہ فنی سوسائٹی کی داغ بیل ڈالی جا رہی ہے تو انہوں نے کہا۔ اغراض و مقاصد میں مونگ پھلی کی کاشت کو بھی شامل کر لیجئے۔ پھر سر عزیز الحق سے کہا۔ بھائی فتح جنگ کی مونگ پھلی سڑ رہی ہے حضور کچھ اس کا سہارا کیجئے۔ ہم لوگوں نے اجازت چاہی تو سر عزیز الحق نے مشورہ دیا۔ مشاعرے کا صدر درکار ہے تو سر سلطان احمد کو پکڑو۔ پٹنہ ہائی کورٹ کے چیف

جسٹس سر فضل علی بھی آج کل شملہ میں ہیں۔ ڈاکٹر کھارے بھی اردو کے بڑے تیراک ہیں اور سر مہاراج سنگھ تو بات چیت ہی شعروں میں کرتے ہیں۔

چوہدری محمد اویس

جہلم سے ہمارے علاقے کے ممبر ڈسٹرکٹ بورڈ چوہدری محمد اویس صاحب میرے پاس ٹھہرے ہوئے ہیں۔ کسی کام کے سلسلہ میں وزیر اعظم پنجاب سے ملنا چاہتے ہیں مگر دو روز سے ملاقات کا وقت نہیں مل رہا۔ چوہدری اویس بھی وزیر اعظم پنجاب کے اسٹائل کی اونچے شملے والی سفید پگڑی باندھتے ہیں۔ اچکن اور شلوار کی چھب بھی وہی۔ قد بُت بھی ویسا ہی۔ شام کو جب مال روڈ پہ نکلتے ہیں تو مدراس اور دکن کے لوگ ان کو وزیر اعظم پنجاب سمجھتے ہیں۔ اتفاق دیکھیے کہ چوہدری صاحب کی آج اصلی وزیر اعظم سے ملاقات بھی ہوئی تو مال روڈ پہ ہوئی۔

خطابات

یکم جنوری اور یکم جون۔ سال میں دو مرتبہ خطابات کی بارش ہوتی ہے۔ یکم جنوری کو کیلنڈر کا نیا سال شروع ہوتا ہے اور یکم جون کو ملک معظم قیصر ہند کی زندگی کا نیا سال شروع ہوتا ہے۔

ہمارے گورمانی صاحب (مشتاق احمد) ویسے بھی نواب تھے۔ اب سرکاری طور پہ بھی نواب بنا دیئے گئے ہیں۔ پران ناتھ تھاپر (آئی سی ایس) کو ع۔ا۔ح کا خالص انگریزی خطاب ملا ہے۔

اتحادی فوج نے ساحل فرانس پہ حملہ کر دیا۔ ایک اخبار میں حملے کا جو فوٹو شائع ہوا ہے اس سے لگتا ہے کہ حملہ آور فوج ہنوز پانی میں تیر رہی ہے۔ البتہ کچھ دستوں نے ساحل پہ اُتر کر مورچہ (BRIDGE HEAD) قائم کر لیا ہے۔

جگر مراد آبادی

مشاعرے کے سلسلے میں حضرت جگر مراد آبادی کا خط آیا۔ حضرت سے ملاقات تو پچھلی گرمیوں کے مشاعرے میں بھی ہوئی تھی مگر ان کا خط پہلی مرتبہ دیکھا۔ کوئی مین میخ نہیں نکالی۔ حاضر جناب۔ خط سے سادگی اور درویشی ٹپکتی ہے۔ سنا ہے کہ مے و مینا سے تانک جھانک چھوڑ چکے ہیں۔ خوش خط منشی آدمی۔ ایک ایک لفظ موتیوں کی طرح نکھرا ہوا۔ بس ایک شرط رکھی ہے کہ کالکا تک تو وہ ریل سے پہنچ جائیں گے مگر وہاں سے کوئی ہمارا آدمی ان کو موٹر میں شملہ لے جائے۔ لکھتے ہیں کہ میں چھوٹی بحر میں غزل تو کہہ لیتا ہوں مگر چھوٹی پٹری کی ریل میں سفر نہیں کر سکتا۔

بھائیا انور شاہ

کبھی کبھی اپنے پرانے کاغذات "پھولتا" رہتا ہوں۔ آج بھائیا انور شاہ مرحوم کے خطوط دیکھتا رہا۔ ان کے انتقال پر ڈھائی برس گزر گئے۔ وطن اسلامیہ ہائی سکول لاہور میں ٹیچر تھے۔ ہنس مکھ، لطیفہ باز۔ سید امتیاز علی تاج (مشہور ادیب و مصنف) ان کو بلوا کر پہروں ان کی باتیں سنا کرتے۔ شاہ خرچ۔ عمر بھر مقروض رہے۔ سود خور کابلیوں کے پھندے میں ایسے پھنسے کہ مر کر ہی رہا ہوئے۔ مجھ سے عمر میں بہت بڑے تھے مگر دوستوں کی سی بے تکلفی روا رکھتے۔ جب بھی ان کی قبر پر جاتا ہوں آنکھوں میں آنسو اور ہونٹوں پر ہنسی آجاتی ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ وہ لحد میں پڑے پڑے بھی مسکرا رہے ہوں گے۔

خطوط سے اقتباسات (انور شاہ)

۱۹۴۲ء

۱

"چھڑی قیمتی موازی ۱۲ر کے تحفے کا بہت بہت شکریہ۔ آپ نے میری بے پری کو تو محسوس کر لیا۔ مگر جناب آپ نے مجھے چھڑی اس وقت بھیجی جب بندہ چلنے پھرنے سے معذور ہو گیا۔ خیر۔ بستر میں پڑے پڑے چھڑی گھماتے رہنے میں ایک لطف بلکہ اپنے اندر زندگی کی تحریک کا احساس ہوتا ہے۔"

۲

"آپ نے لکھا ہے کہ میں آپ کے پاس آ جاؤں۔ آپ یونانی دواؤں اور پہاڑی ناشپاتیوں سے میرا دارو کریں گے۔ شکریہ! گپ بازی بھی آدھا مرض دور کر دیتی۔ مگر پیارے تم بہت دور جا بسے ہو۔ پھر شہروں کے اخراجات؟"

۳

"میرے پاس جب تک پیسے تھے دن بھر لوگوں کی منڈلی جمی رہتی تھی۔ اب کھتیاں ہمدم و غمگسار ہیں جو چند عزیز تیمارداری کئے جا رہے ہیں رب ان کا بھلا کرے۔ موت مجھے آوازیں دے رہی ہے۔ بیوی بچے کچھ مانگتے نہیں مگر مجھے تو معلوم ہے کہ میں ان کے لئے کچھ چھوڑ کر نہیں جا رہا۔ فرشتہ اجل میری مجبوریوں کے خیال سے اللہ کے حکم کی نافرمانی کر رہا ہے۔ مگر ڈیوٹی میں کتنی کچھ کوتاہی کر سکے گا، بیچارہ ـــ!

چھٹی ملے تو مجھے دیکھ جاؤ۔ وعدہ کرتا ہوں، جیسے کیسے بھی ہوگا واپسی پر تمہیں ریلوے سٹیشن پر چھوڑ کر آؤں گا۔ خواہ تم گھوڑی پر سوار ہوگے اور میں چارپائی پر۔"

اشرف ریاض

اشرف ریاض کلکتے جا پہنچا۔ لائلپور اس کے لئے بہت چھوٹا شہر تھا۔ ہمارا یہ سانولا سونا یار آج کل بنگالی زبان سیکھ رہا ہے۔ فارسی کا ذوق کالج میں گہرا ہو چکا تھا۔ رضا علی وحشت کے حلقے میں بیٹھا تھا اُن کی غزل کا گرویدہ ہے۔ حسین شہید سہروردی سے بھی راہ و رسم پیدا کر لی ہے۔ اس کے خطوط سے معلوم ہوتا ہے کہ کلکتے کے مسلمانوں کو شعر و شاعری کی مجلسیں برپا کرنے کے سوا اور کوئی کام نہیں ہے۔ خط میں اس نے فارسی کے چند شعر بھی لکھے ہیں۔ مجھ سے کچھ ٹھیک سے پڑھے بھی نہیں گئے جیسے سمجھ میں آئے نقل کر لئے۔

چہ گرمے، چہ خوبے، شرابے چہ ہستی — بہارے، گلے، ماہتابے چہ ہستی

چہ ہستی کہ آتش بیانم کشیدی — سرودِ خوشے، شعرِ نابے چہ ہستی

چہ شیریں نشستی بہ تختِ وجودم — خدارا غمے التہابے چہ ہستی

فروغے کہ از چشمِ من می گریزد — ...... خوب خوابِ چہ ہستی

(افسوس کہ ۱۹۷۵ء میں اٹلی کی سیاحت کے دوران میں ان کا انتقال ہو گیا)

(اگست)

میجر شہباز خان

میجر شہباز خان نے ایک عسکری نوعیت کا ڈرامہ لکھنے کی فرمائش کی ہے۔ وہ فوج کی "ویلفیئر آرگنائزیشن" (WELFARE ORGANISATION) سے وابستہ ہیں۔ جس کا دفتر جالندھر چھاؤنی میں ہے۔ مساعی جنگ کے سلسلے میں بھانت بھانت کے محکمے قائم ہو گئے ہیں۔ انگریز کے کیا کہنے؟ جنگ بھی لڑ رہا ہے، ڈرامے بھی کھیل رہا ہے۔ دہلی میں ابوالاثر حفیظ کا محکمہ نغموں سے دلوں کو گرما رہا ہے ——— تم مرد ہو تم میدان میں گئے، تم شیر ہو تم نے کام کیا! کوہی جسیم الدین اور شوکت تھانوی اور ہری چند اختر ان کے ہمنواؤں (یعنی ماتحتوں) میں شامل ہیں۔ میجر شہباز خان کو میں نے پہلے پہل جہلم چھاؤنی میں "ٹیری ٹوریل فورس" TERRITORIAL FORCE کی پریڈ میں دیکھا۔ میں ان دنوں گورنمنٹ ہائی سکول جہلم میں پڑھتا تھا۔

جمشید (اب ریٹائرڈ میجر جمشید عالم مقیم کراچی) اور خلیل (حال مقیم نیروبی) اور میں ہم تینوں دوست عموماً اسکول سے بھاگ کر چھاؤنی کی طرف نکل جاتے اور ایک بنگلے کی بیرونی دیوار پر بیٹھ کر ایک انگریز کپتان کی میم، ان کے کتوں اور مرغیوں کو دور ہی دور سے دیکھتے رہتے۔ (اتفاق دیکھئے کہ ۱۹۴۸ء میں جب میں خود کپتان ہو کر جہلم چھاؤنی میں متعین ہوا تو رہائش کے لئے یہی بنگلہ مجھے الاٹ ہوا) ایک روز چھاؤنی میں پریڈ ہو رہی تھی جس میں ایک وجیہہ نوجوان افسر خاص طور پر نمایاں نظر آیا۔ چھریرا۔ چٹک مٹک۔ طرحدار گورں کی طرح گورا۔ اتنا گورا کہ انگریزوں میں سے اس کو چھانٹ کر باہر نکالنا مشکل معلوم ہوتا۔ یہ شہباز خان تھا۔ آپ چھاؤنی کے ایگزیکٹو افسر تھے اور جز وقتی سپاہی بھی۔ (قیام پاکستان

کے بعد آپ کرنل ہو کر کچھ مدت تک جنرل ہیڈ کوارٹر راولپنڈی میں انٹر سروسز پبلک ریلیشنز (ISPR) کے ڈائریکٹر اور پھر چھاؤنیوں کے محکمے کے سربراہ رہے)

حفیظ رومانی کو صدمہ

امرتسر سے یہ اندوہناک خبر آئی کہ حفیظ رومانی معروف افسانہ نگار اور فلم پروڈیوسر کی بیوی کا انتقال ہو گیا ——— بُرا حال ہو گا بے چارے کا۔ اب اس کو قمیض، رومال اور موزے کون ڈھونڈ کر دیتا ہو گا؟ ——— بھابی بڑی صابرو شاکرہ خاتون تھیں۔ رومانی ——— بڑی مستانی عادتوں کا آدمی ہے۔ جہلم میں شام کو جب عدمؔ (سید عبدالحمید عدمؔ) ملک عبدالحمید، ڈاکٹر جمیل احمد خان اور اس خاکسار کی چوکڑی ہیں گھر سے باہر نکلتا تو بھابی ڈیوڑھی کی چوکھاٹ سے لگ کر ہلکی سی آواز میں کہا کرتیں۔

"اِک وجے دے پچھوں میں کنڈی نئیں کھولنی"

"ایک بجے رات کے بعد میں دروازہ نہیں کھولوں گی"

اور اب وہ گھر کا دروازہ ہمیشہ کھلا چھوڑ کر اس دُنیا ہی سے رخصت ہو گئی۔

میر حسن محمود

پنڈ دادنخان کے سیٹھ عباس ہانگ کانگ میں کاروبار کرتے ہیں۔ وہ وطن آکر کلر کہار کے قریب بھیڑ بکریوں کا ایک ماڈرن فارم قائم کرنا چاہتے ہیں۔ جہلم سے آنریری لیفٹیننٹ دوست محمد خان آف اڈرانہ نے مجھے لکھا کہ میں میر حسن محمود صاحب ڈائریکٹر صنعت پنجاب سے مل کر معلوم کروں کہ حکومت پنجاب اس قسم کے منصوبے کی کتنی حوصلہ افزائی کرے گی۔ میری تقویت کے لئے انہوں نے ساتھ ایک سفارشی خط بھی بھیجا۔ یہ خط میر حسن محمود کے بڑے بھائی میر مقبول محمود صاحب (پارلیمنٹری سیکرٹری پنجاب) نے

کسی زمانے میں سیٹھ عابد کے نام ہانگ کانگ میں لکھا تھا۔ دو تین سطروں میں صرف اتنی بات لکھی تھی کہ "عید کارڈ کا شکریہ"۔ میر حسن محمود کے پی اے (پرسنل اسسٹنٹ) نے مجھے سر سے پاؤں تک دیکھ کر کہا۔ صاحب میٹنگ میں ہیں مسٹر قریشی آئی سی ایس (غالباً بی اے قریشی سابق چیف سیکرٹری مغربی پاکستان) اندر بیٹھے ہیں۔ میں نے پی اے سے کہا بھئی میں میر مقبول حسن کی سفارش لایا ہوں۔ پھر یہ بھی کہا کہ ـــ "میرے یار میں بھی ایک دوسرے دفتر میں تیری ہی طرح ایک بابو ہوں۔ ایک بابو کو دوسرے بابو کے کام آنا چاہیئے۔ ورنہ ہم لوگ مارے جائیں گے"۔

وہ میرا نام پتا۔ جغرافیہ وغیرہ معلوم کر کے اندر گیا اور تھوڑی دیر بعد مجھے بھی اندر لے گیا۔ میر صاحب کی پیشانی پر بل دیکھ کر میں نے جلدی سے میر مقبول محمود صاحب کا خط کھول کر ان کے سامنے رکھ دیا۔ بھائی کا خط دیکھ کر وہ مسکرا پڑے۔ منصوبے کی نوعیت سن کر فرمایا۔ بھیڑ بکری سے میرا کوئی واسطہ نہیں۔ بھیڑ بکریوں کے ڈائریکٹر لاہور میں ہوتے ہیں۔ آپ ان سے ملیں، میری چٹھی لے جائیے۔

ب جی

انیس (میری اہلیہ) کی وفات کے بعد ب جی (والدہ محترمہ) گاؤں کی ایک کامی عورت کو ساتھ لے کر میرے ساتھ ہی شملے آ گئی تھیں۔ شملے کا برفانی موسم سر پہ تلا ہوا ہے۔ وہ تکلیف جھیل رہی ہیں تاکہ مجھے تکلیف نہ ہو۔ مگر اب اگلے ہفتے میں ان کو واپس بھیج ہی دوں گا۔ "ب جی" نے آنے کے ساتھ پہلا کام یہ کیا کہ میرے ملازم کو چلتا کر دیا۔ فرمایا! گھر کا کام ہی کتنا ہے جو اس کو ناحق بارہ روپے ماہوار بھرتے ہو۔ گھی۔ شکر۔ دال کے توڑے وہ گاؤں سے اپنے ساتھ لے آئی تھیں۔ روزانہ کا سودا سلف پاس کی دکانوں سے چوہدری عبدالغفور صاحب (لیفٹیننٹ جنرل اختر حسین ملک کے خسر

جو ہمارے پڑوس میں رہتے تھے) کے بچے لا دیتے ہیں۔ آج میں نے ب جی کو شملے کی سیر بھی کرائی۔ میں نے کہا چلو آغاجی (ہمارے ایک عزیز سید محمد افضل شاہ صاحب) کے ہاں چلیں۔ اسی بہانے میں ان کو مال روڈ پہ لے گیا۔ رکشا پر وہ بیٹھتی نہیں کہ اس کے آگے آدمی جُتے ہوتے ہیں۔ میں ہزار کہتا ہوں۔ "ب جی" رکشا کو آپ شملے کا تانگہ سمجھئے مگر ان کا دل نہیں مانتا۔ چنانچہ جہاں بھی جاؤ سر سے پاؤں تک، لٹھے کے سفید برقعے میں لپٹی۔ میرے پیچھے پیچھے پیدل چلتی ہیں۔ مال روڈ پہ تھوڑی دُور گئے ہوں گے کہ انگریز مرد عورتوں کا ایک جھنڈ کلکاریاں کرتا ہوا سامنے سے گزرا۔ جن کو دیکھ کر استغفار پڑھتے ہوئے فرمایا۔

"فِٹے مُونہہ ——— چل جمرو گھر چلیئے"

کُشتی کا اثر

بلتستانی شملے سے آغاجی کا آدمی آیا کہ فوراً پہنچو۔ اکمل (ان کا نوجوان گریجویٹ فرزند) کو کچھ ہو گیا ہے۔ معلوم ہوا۔ پرسوں جب وہ وار فرنٹ کا دنگل دیکھ کر آیا۔ جس میں گوالیار کے ہربنس سنگھ پہلوان نے یار خان پہلوان کو چت کر دیا تھا، تب سے یہ بھی گھر میں چت پڑا ہے۔ کچھ کھاتا ہے نہ بولتا ہے۔ کسی کسی وقت کرب کی حالت میں نعرہ لگاتا ہے۔

"رب جی! یہ کیا ہو گیا!"

میں نے تو یہ دنگل نہیں دیکھا۔ مگر شہرہ ضرور سُنا کہ ہزاروں لوگ الہ یار اور ہربنس سنگھ کی کشتی دیکھنے گئے۔ یہ دیسی پہلوان ولائتی طرز کی کشتی لڑنے میں کلکتے، بمبئی تک مشہور ہیں۔ دونوں پہلوانوں میں زبردست مقابلہ ہوا۔ مگر آخر میں ہربنس چند نمبروں پر جیت گیا۔ مسلمانوں کا خیال ہے کہ ریفری پیسے کھا گیا۔ اکمل نے اس واقعے سے اتنا صدمہ قبول کیا کہ اٹوانٹی کھٹوانٹی لئے پڑا ہے ——— کتنا احمق لڑکا ہے۔

رفیق ملک

دہلی سے رفیق ملک آئے ہوئے ہیں۔ (پٹھوار کے بابائے اُردو عبدالعزیز فطرت مرحوم کے برادرِ نسبتی۔ قیامِ پاکستان کے بعد جنرل ہیڈ کوارٹر راولپنڈی میں سویلین افسر تھے۔ عنفوانِ شباب میں انتقال ہوا۔) رفیق کی آمد سے میرے کاشانۂ ویران میں بھی زندگی جاگ اٹھی۔ ورنہ جب سے والدہ محترمہ وطن گئی ہیں، گمان ہوتا ہے جیسے مَیں گھر میں نہیں ہوں، قبر میں ہوں۔ جس میں بجلی کے بلب روشن ہیں اور ہانڈی روٹی پکتی ہے۔ شام کو ایک چھوٹی سی مشاعرہ کا بھی اہتمام کیا۔ چار چھ شاعر تو لوٹی کنڈی میں فروکش ہیں۔ اختر ہوشیارپوری۔ عبدالسلام کوثر اور صدیق نشتر لدھیانوی شملے سے آ گئے۔ نسیم نقشبندی کو ایسے موقعوں پر ہم خود شاعر بنا لیتے ہیں۔ اور خان حکمت اللہ خان کہ علی گڑھ کے پڑھے ہوئے ہیں، شاعری سے زور آزمائی پر اُتر آئیں تو اچھی خاصی زبان کی غزل کہہ سکتے ہیں۔ خود رفیق ملک کا یہ حال ہے کہ اگرچہ اپنے بزرگ عبدالعزیز فطرت کے خوف یا لحاظ سے شعر نہیں کہتے، مگر چاہیں تو شعر کہہ سکتے ہیں۔ دوست کبھی اصرار کرتے ہیں تو کہتے ہیں۔ خانہ خرابی کے لئے گھر میں ایک شاعر ہی بہت کافی ہے۔ آج انہوں نے بڑی ہی نشیلی سبک سی نظم سنائی۔ چھٹی کے وقت اندرا پرست کالج کے پھاٹک کے سامنے سے گزر رہے تھے۔ جتنی بجلیاں ان کے دل پر گریں انہوں نے اس نظم میں چن دی ہیں۔ ؎

اُودھے اُودھے، نیلے نیلے، پیلے پیلے، پیرہن

دو فوجی دوست

ضیا کا خط آیا۔ لوگانگ میں لفٹ رائٹ، لفٹ رائٹ کر رہا ہے۔ سیکنڈ لیفٹیننٹ ضیا لدھیانوی کا یہ گلفام شہزادہ کیمبل پور کالج میں مجھ سے دو کلاس پیچھے تھا۔ اب آگے

نکل گیا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ضیا جیسا لاڈلا بردا، بھاری بھرکم فوجی بوٹ پہن کر پاؤں کیونکر اٹھاتا ہوگا؟ —— صوبیدار غلام علی بلبلؔ کاشمیری بھی ان دنوں میرے پاس آئے ہوئے ہیں۔ آپ پچھلے دو تین برسوں سے برما کے فرنٹ پر دادِ شجاعت دے رہے ہیں۔ ایراوتی سے پسپا ہوتے ہوتے کوہیما پہنچے تو یہ انفرادی طور پر دہلی تک پسپا ہو آئے اور کل اچانک یہاں میرے پاس پہنچ گئے۔ "لام" پر گئے تھے تو مشکل سے ۱۲۰ پونڈ وزن تھا ڈر رہتا تھا کسی دن آندھی میں اُڑ جائیں گے۔ محاذِ جنگ سے واپس آئے ہیں تو ۱۸۰ پونڈ کو چھو رہے ہیں کہ آخر اپنی یونٹ کے کوارٹر ماسٹر ہیں "بُلی بیف" شہد اور مشین میں سے نکلے ہوئے پھلوں کے کئی ڈبے میرے واسطے بھی لے آئے ہیں۔ شاعری بھول گئے ہیں۔ اب میجر جنرل ڈوڈلے رسّل (RUSSELL) کی باتوں کے سوا کوئی بات یاد نہیں۔ جنرل رسّل ان پر بہت مہربان ہیں بلکہ ان پر اتنا بھروسہ کرتے ہیں کہ لڑائی کا پینترہ بھی گویا بلبل سے پوچھ کر باندھتے ہیں۔ ایک اور سارجنٹ واٹسن دم نہیں لینے دیتا۔ وہ ایک مدت تک انہیں کے خیمے میں مقیم رہا۔ ایک کمبل میں بلبل دوسرے میں واٹسن۔ اس کی عادت تھی کہ وہ رات کو سوتے میں عشقیہ نظمیں پڑھتا ہوا ٹہلنے لگتا اور چہل قدمی کرتا ہوا عموماً خیمے سے باہر نکل جاتا۔ بلبل کی آنکھ کھلتی تو یہ اس کو پکڑ کر لاتا۔ مَیں نے پوچھا۔ اب کہ تم چھٹی پر یہاں بیٹھے ہو تو وہاں واٹسن کو کون پکڑتا ہوگا۔ اس پر بلبل نے بتایا۔ دو مہینے ہوئے ایک رات میری آنکھ نہ کھلی اور واٹسن اتنی دُور نکل گیا کہ پھر لوٹ کر نہ آیا۔ ہمیں شروع سے خطرہ تھا کہ وہ کسی روز جاپانیوں کے مورچے میں جا مرے گا یا قید ہو جائے گا۔ ممکن ہے قید ہو۔ بہرحال اس کی بوڑھی ماں کو جو یارک شائر میں رہتی ہے۔ یہ تار دے دیا گیا۔ WATION MISSING

BELIEVED TO BE KILLED اور بلبل جب تار کا مضمون بول رہا تھا تو اس کی آواز بھرائی ہوئی معلوم ہوئی —— بلبل کو فوجی وردی بھلی لگتی ہے۔

میں آئندہ بلبل کو ہمیشہ مذکر باندھوں گا۔

وقار انبالوی

لاہور سے حضرت وقار انبالوی کا خط آیا۔ ان کی بعض نظموں میں پنجاب کی دیہی زندگی کی جو توانا اور سچی عکاسی نظر آتی ہے میں اس کا معترف ہوں۔ فاخر ہریانوی اس میدان میں پیش رو ہیں۔ مگر فاخر ہمیں چند نظمیں دے کر کہیں گم ہو گئے۔ وقار انبالوی کو بھی صحافت نے ادب سے چھین لیا۔ ورنہ یہ شخص بڑی من موہنی شاعری کرتا۔

زندگی کی طرف

گھر والے میرے لئے رشتے دیکھ رہے ہیں۔ بعض احباب بھی چارہ سازی پر کمربستہ ہیں۔ ایک عزیز نے جو کراچی میں ملازم ہیں، ایک روشن خیال رشتے کی نشاندہی کی ہے۔ یہ لوگ چھ ماہ بمبئی اور چھ ماہ کراچی رہتے ہیں۔ چلن کاملاً مغربی طرز کا اپنا رکھا ہے۔ پردہ "لڑکی" کی والدہ نے اپنی جوانی میں اٹھا دیا۔ لڑکی کانونٹ سکولوں کی پڑھی ہوئی، بی اے پاس۔ موسیقی سے گہرا شغف ہے۔ پیانو، ستار بجا لیتی ہے۔ بیاہ سردیوں میں کرو تو بارات کراچی جائے گی گرمیوں میں بمبئی —— نہ معلوم ان حضرت نے ہمارے بارے میں لڑکی والوں کو کیا سبز باغ کھینچ کر دکھایا ہے۔ ہنسی بھی آ رہی ہے اور رونا بھی۔ ہنسی اس بات پر کہ بارات بمبئی تک چلی جا رہی ہے۔ رونا اس بات پر کہ چچا جی کا آنسوؤں میں بھیگا خط آج ہی گجرات سے آیا ہے اور خود میرے اندر بھی آنسوؤں کا سیلاب ہنوز کب تھما ہے؟

دیوالی

شملہ، رات کو چراغوں کا پہاڑ ہوتا ہے۔ مگر دیوالی کی شب تو گویا درختوں پر بھی

چراغ جل اُٹھتے ہیں ۔ میں نے دہلی کی دیوالی بھی دیکھی ہے ۔ شملہ ہندوستان بھر کے نمائندہ چہروں کا درشن جھروکا ہے ۔ بلکہ حسنِ افرنگ کی آمیزش سے دو آتشہ بھی ہے مگر لاہور کی دیوالی کا جواب کہاں ؟ انار کلی میں آج پھر گل رخ برہمن دختروں کا سیلاب چل رہا ہوگا ۔ مولانا غلام قادر گرامی نے بھی تو "آتشِ پنجاب" کا ذکر بڑے للچائے ہوئے انداز میں کیا ہے ۔ روشنی زمین سے اُٹھ کر آسمان پر چلی گئی ہوگی ۔ ہندو جاتی کے تہوار بھی تہوارے ہیں ۔

ادبی رسالے

"شاہکار" اور "زیب النساء" کے تازہ پرچے ڈاک سے ملے ۔ لاہور سے کوئی رسالہ آتا ہے تو میں کچھ وقت کے لئے لاہور پہنچ جاتا ہوں "شاہکار" کے ورق ورق پر علامہ تاجور نجیب آبادی کی تصویر دکھائی دیتی ہے ۔ جیسے علامہ اپنے چہرے پر اپنی مخصوص مسکراہٹ بکھرائے، بٹوے سے پانوں کی گلوری نکال کر مجھے دے رہے ہوں "سدا بہار" آتا ہے تو ڈاکٹر انصاری ایم مسعود کھدر پوش کمشنر کے بڑے بھائی عبدالحلیم انصاری آپ نے مولانا تاجور سے رسالہ "شاہکار" بھی خرید لیا تھا) اپنے دفتر میں لپٹن کمپنی کے ایجنٹ سے مصروفِ گفتگو دکھائی دیتے ہیں ۔ "زیب النساء" کی آمد پر شیخ محمد نواب کی آمد لازمی ہے ۔ اور ان کی آمد پر شاعرِ رومان حضرت اختر شیرانی کے حضور ان کے فلیمنگ روڈ کے حجرے میں پہنچ جاتا ہوں (شیخ محمد نواب اختر شیرانی کے رسالہ رومان کے منیجر تھے) کبھی کبھی علامہ پروفیسر محمود شیرانی (اختر شیرانی کے والد "پنجاب میں اردو" کے مصنف) بھی آہستہ آہستہ مکان کے نیم روشن زینوں پر اترتے چڑھتے نظر آجاتے ہیں اور فلیمنگ روڈ تو ساری کی ساری گویا میرے دل میں چلنے لگتی ہے ۔ حکیم محمد حسن قرشی، حکیم عبدالمجید علیقی، مولانا علم الدین سالک، حکیم محمد یوسف حسن (ایڈیٹر نیرنگِ خیال) مولانا چراغ حسن حسرت اور پروفیسر عبدالواحد —— اس سڑک کے چند چراغِ راہ ہیں ۔ پھر ادھر برف خانے کی طرف عنایت پہلوان کا تھڑا، گرمی

کے موسم میں جس کے فالودے کا پیالہ ہم ریواز ہاسٹل (اسلامیہ کالج لاہور) کے باسیوں کے لئے ایک فرحت بخش مشروب تھا ـــــــــــــ

"ادبی دنیا" میں مولانا صلاح الدین احمد کی زیارت ہو جاتی ہے اور "ادبِ لطیف" کی سطر سطر سے مرزا ادیب جھانکتا نظر آتا ہے۔ "ہمایوں" میں یوسف ظفر کی خوشبو ہی ہوتی ہے۔ میاں بشیر احمد کی چھاپ بھی اگرچہ اس میں نمایاں ہے۔ مگر ان سے مجھے صرف ایک مرتبہ ملنے کا اتفاق ہوا۔ یوسف ظفر ہی ان تک لے گئے تھے۔ میاں صاحب اپنی "اسٹڈی" میں بیٹھے کچھ لکھ رہے تھے۔ ایئر فورس کے پائلٹ حسین کی باتیں کرتے رہے جو اپنے طیارے کو ہوا میں گیند کی طرح اچھالتا ہے۔ فرمایا۔ مسلمانوں کو حسین جیسے جیالوں کی ضرورت ہے۔ (یہ نوجوان پائلٹ غالباً عبدالعزیز فلک پیما کے فرزند تھے) "بیسوی صدی" واقعی "بیسویں صدی" کا رسالہ ہے کہ اس میں ہر مزاج کا مسالہ موجود ہے۔ پگڑی کو دیکھو تو انیسویں صدی میں، قدم بیسویں صدی میں، نظر اگلی صدی پر۔ یہ ہیں لالہ خوشتر گرامی ایڈیٹر بیسویں صدی ـــــــ ان کے تیر و نشتر پڑھنے کی چیز ہوتے ہیں۔

سومی

ہمارا پہاڑی گوالا درشن ڈیڑھ روپے میں کتّے کا ایک پلّا دے گیا۔ زورا زوری گھر میں باندھ گیا کہ بابو جی بڑی اونچی ذات کا کتا ہے۔ مشوبرے کی ایک میم کی نسل سے ہے۔ ہم نے اس کا نام سومی رکھا ہے۔ تین چار مہینے کا ہوگا۔ مجال ہے جو ایک لحظ بھی ٹک کر بیٹھے۔ دوڑنے سے زیادہ کودتا ہے۔ بھورا رنگ، لمبے لمبے ملائم بال، گول مٹول ـــــ دامانِ نگہ تنگ و گلِ حسنِ تو بسیار ـــــ ذرا مذاق تو دیکھئے۔ شوخی تماشا ہے نہیں

گورا قبرستان

سنجولی کی طرف گھومتے ہوئے گورا قبرستان بھی دیکھ آئے۔ شملے میں بھی بے شمار

انگریز آکر مرے ہیں۔ فوجی افسر، سول افسر، کپتان، میجر، کرنل، کمشنر، ریذیڈنٹ، چیف انجینیر۔ قبرستان کیا ہے گورنمنٹ آف انڈیا کا سابق سکرٹریٹ ہے ــــــ ایک سوئی ہوئی چھاؤنی ہے۔ مرقدوں کی لوحوں پہ کیا عمدہ عمدہ ادب پارے لکھے ہوئے ہیں۔ یہ لوگ بھی کبھی گھوڑوں پہ سوار ہو کر مال روڈ سے گزرتے ہوں گے؟

کنور مہندر سنگھ بیدی

عزیزم اکمل کی ملازمت کے سلسلے میں کنور مہندر سنگھ بیدی سے ملنے دہلی آیا ہوں۔ راجپورہ روڈ پہ ان سے ملاقات ہوئی۔ بڑے تپاک سے ملے۔ محفل شعروسخن جم رہی تھی۔ چھ سات شعراء جن میں دکن کے ماہرالقادری بھی شامل تھے، صوفوں پہ بیٹھے تھے۔ ماہر صاحب کے عین سر کے اوپر دیوار پہ سالم شیر کی کھال آویزاں تھی ــــــ کنور صاحب نے پوچھا کیسے آنا ہوا؟ ــــــ عرض کیا۔ الیف۔ ایم۔ انز (INNS) کے نام سفارش مطلوب ہے۔ جواب دیا ــــــ تعمیل ہوگی۔ انز باہر سے کھُردرا، اندر سے ملائم ہے۔ تم پہلے شاملِ مشاعرہ ہو جاؤ، پھر "شاملِ مثل" کر دیں گے۔ کنور مہندر سنگھ ۱۹۴۰ء میں ہمارے ضلعے کے افسرِ مال تھے۔ ادب و شعر سے لگاؤ تھا۔ پنجاب کے بڑے زمینداروں میں سے ہیں۔ بڑی زرق برق شیروانی پہن کر مشاعروں اور کوی سمیلنوں کی صدارت کیا کرتے۔ موسیقی کی محفلوں میں ہارمونیم سنبھال کر گانے بھی لگ جاتے۔ لمبے تربوز کی طرح کی نوکدار پگڑی باندھتے۔ شملے میں جب تک میں نے مہاراجہ فرید کوٹ کو نہیں دیکھا، میں نے کنور مہندر سنگھ جیسا طرحدار کوئی دوسرا سِکھ نہیں دیکھا تھا۔ جہلم تک تو شاعر دوست رہے، دہلی میں آکر خود بھی شاعر ہو گئے۔ سحر تخلص کرتے ہیں۔

برفانی مشاعرہ

وائی ایم۔ سی اے میں یار لوگوں نے ان جاڑوں میں بھی ایک مشاعرہ کر ڈالا۔ پندرہ

بیس شاعر کوئی پچاس ساٹھ سامعین - اتنی ہی کانگڑیاں - سب لوگ کوٹوں اور کمبلوں میں گٹھری بنے ہوئے - بجلی کے ہیٹروں کے علاوہ وائی ایم سی اے والوں نے درمیان میں لکڑیوں کا ایک الاؤ بھی روشن کر رکھا تھا - شعراء میں اختر ہوشیار پوری - حافظ الہ آبادی خوب چمکے - صدارت کا قرعہ اس خاکسار کے نام پڑا - اس برفانی موسم میں ہم دو چار شاعر ہی رہ گئے ہیں - ویرانی ہو تو ایسی ہو - عربی کی ضرب المثل یاد آتی ہے ــــ بڑوں کی موت نے ہمیں بڑا بنا دیا - فی الحال یہ کہنا چاہیئے کہ بڑوں کے دہلی اور لاہور چلے جانے سے ہم بڑے بن گئے - ورنہ گرمیوں میں ڈاکٹر تاثیر یہاں تھے - سر رضا علی - سر سلطان احمد - احمد شاہ بخاری - مشتاق احمد گورمانی - گوکل چند نارنگ - ایک سے ایک انجمن ساز صدر شملے کی مال روڈ پر ٹہلتا ہوا پکڑ لو - شملے میں سامعین نہیں ملتے، صدر بہت ملتے ہیں ۔

خان بہادر راجہ محمد اکبر خان

جہلم سے خان بہادر راجہ محمد اکبر خان صاحب کا خط ملا - نہایت باریک نب سے لکھی ہوئی بارہ چودہ بڑے صفحات پر پھیلی ہوئی دستاویز - آپ نے اپنے خاندان کی تاریخ سپردِ قلم کی ہے - مجھے لکھا ہے کہ میں ان کی تحریر کے بقول ان کے "انجر پنجر سیدھے" کر دوں - راجہ صاحب نے تکلف سے کام لیا ورنہ جیسی ان کی تاریخ ہے ویسی ان کی تحریر ہے - راجہ صاحب کے دادا ریاست بھمبر کے حکمران تھے - گلاب سنگھ نے کشمیر ہتھیایا تو اس نے ان کو بھی نکال باہر کیا - تب سے اس خاندان کا "ٹِکّا" (سربراہ) کوئی پندرہ سو روپے ماہوار کی موروثی پنشن پاتا ہے - خاندان کی تاریخ خانہ جنگی کی تاریخ ہے - اس روداد کو پڑھ کر مجھے تو اس بات پر حیرت ہوئی ہے کہ اس خاندان کی تاریخ راجہ محمد اکبر خان صاحب تک پہنچ کیونکر گئی - پچھلے پچاس ساٹھ برس میں یہ خاندان اگرچہ عام لوگوں کی صف میں آن ملا ہے - تاہم نشست و برخاست، میل جول اور وضع داری پر ان کی الگ چھاپ اب بھی نظر آتی ہے - ان کے

بیٹے تو زندگی کے رواں دھارے میں جذب ہو جائیں گے مگر خان بہادر صاحب تاہنوز ایک چٹان کی طرح اپنی روش پر قائم ہیں۔ وہ اپنی بیٹھک کو دربارِ عام یا دربارِ خاص کہہ کر پکارتے تو نہیں، مگر دل میں یہی سمجھتے ہیں کہ اب دربار عام میں بیٹھے ہیں ...... اب دربارِ خاص میں نشست کر رہے ہیں .... اور اب محلِ سرا میں تشریف رکھتے ہیں۔ ان کی والدہ محترمہ کو تو خیر سبھی لوگ رانی صاحب۔ رانی صاحب کہتے ہیں۔ میں جب کبھی ان کے ہاں گیا، مجھے ایسا لگا جیسے راجہ صاحب تاریخ میں تیر رہے ہیں۔ خان بہادر صاحب میرے بزرگ ہیں۔ میری ایک چچی ان کی خالہ زاد بہن ہیں۔ ان کی خدمت کو میں اپنے لیے باعثِ سعادت سمجھتا ہوں۔ راجہ صاحب کو فارسی کے اتنے شعر یاد ہونگے؟ اس کی مجھے امید نہ تھی۔ اس شعر نے تو تڑپا ہی دیا۔

اے متاعِ درد در بازارِ جاں انداختہ
گوہرِ ہر سود در جیبِ زیاں انداختہ

یہ شاید پنجاب کونسل میں علامہ اقبال کی ہم نشینی کا اثر ہے !!

نسیم کی کرسی

میں اور نسیم اور کمال دین ملازم آج لمبی گشت پہ نکلے رہے۔ جتوگ۔ گلٹن جس طرف بھی کوئی پگڈنڈی اترتی چڑھتی ملی۔ ہم اس پر اترتے چڑھتے چلے گئے۔ عجیب عجیب صورتوں کے بندروں سے ملاقات ہوئی۔ کیسے کیسے چاند چہرے پہاڑی لڑکیوں کی نگاہوں سے گزرے۔ چاند چہرے مگر غربت کے گہن میں ڈوبے ہوئے۔ بیس میل سے کم کیا چلے ہوں گے۔ کھانے دانے کا سامان ساتھ تھا۔ جہاں بھوک لگتی کچھ کھا لیتے۔ پینے کو جابجا چشموں کا پانی رواں۔ نسیم کچھ دنوں سے ٹوٹی کنڈی میں میرے پاس ہی اٹھ آیا ہے اپنے ساتھ اپنی میز کرسی بھی اٹھا لایا ہے۔ کہتا ہے رات کو اگر میں اپنے میز کرسی پر

نہ بیٹھوں تو میں لکھ پڑھ نہیں سکتا۔ چھوٹے شملے سے جس روز ہم اس کا سامان لائے تو کارٹ روڈ تک ہمیں کوئی قلی ملا نہ رکشا۔ سو وہاں تک میز نسیم کے سر پہ اور کرسی میرے سر پہ رہی، جہاں تھک جاتے میز کرسی لگا کر بیٹھ جاتے! ——— کل عید الفطر ہے۔

دفتر میں ہندو مسلم فساد

ٹفن کے وقت اچانک شفیع راجہ اور مسٹر دوبے اُلجھ پڑے۔ مسٹر دوبے رائے بہادر دوبے کے بیٹے ہیں اور رائے بہادر ہمارے محکمے (ڈیفنس) میں انڈر سیکرٹری ہیں۔ ہمارے سیکشن (D-۴) میں شفیع راجہ اور میں ہم دو اہل کار ہی مسلمان ہیں۔ باقی سب برادرانِ وطن، جن میں ایک سکھ سرجیت سنگھ، ایک عیسائی جن کو ہم لارڈ منٹو مارلے کہتے ہیں، باقی سب ہندو۔ لکھنؤ کا سری واستو ایم اے ایل ایل بی۔ چھپن چھری۔ وہ آج کمیونل ہارمونی (COMMUNAL HARMONY) کی ایک ٹی پارٹی کے ٹکٹ دفتر میں بیچ رہا تھا۔ اِدھر شفیع راجہ نے دفتر میں اپنے "ڈیسک" کو مسلم لیگ کا "ڈیسک" بنا رکھا ہے۔ اس نے سری واستو سے کہا "کمیونل ہارمونی" کے نام پہ تم لوگ نیا جال بچھا رہے ہو۔ مسلمان اب اس جال میں نہیں پھنسے گا۔ اس پہ بات بڑھ گئی۔ ہم نے بارہا دیکھا ہے کہ جب بات بڑھتی ہے تو سری واستو درمیان سے نکل جاتا ہے۔ آج بھی یہی ہوا۔ دیکھا تو شفیع کا ہاتھ دوبے کے گریبان پہ تھا۔ لارڈ منٹو مارلے نے بیچ بچاؤ کرا دیا۔ ورنہ راجہ صاحب کی آواز اتنی بلند ہو رہی تھی کہ کرنل گرانٹ (ہمارے افسرِ اعلیٰ) ہزار لنگڑے سہی، لنگڑاتے لنگڑاتے بھی سیکشن میں آ دھمکتے۔ سپرنٹنڈنٹ گھوش بابو چھٹی پہ تھے۔ وہ دفتر میں ہوتے بھی تو شاید ہی مداخلت کرتے۔ کیونکہ وہ اپنے کسی بھی ماتحت سے خوش نہیں ہیں۔ ان کی خواہش یہ ہوتی کہ دوبے کی پٹائی ہو اور شفیع ملازمت سے موقوف ہو۔ راجہ شفیع دفتر کے علاوہ اپنی تحصیل کھاریاں (گجرات) میں بھی مسلم لیگ ہیں۔ گجرات کے ہر بلنے جلنے والوں

کو تاکید کرتے رہتے ہیں کہ خبردار اگر الیکشن میں میاں کولیاں والا یونینسٹ کو ووٹ دیا۔ (۱۹۴۶ء کے انتخابات میں صدرِ پاکستان چوہدری فضل الٰہی صاحب نے انہی میاں کولیاں والا کو شکست دی تھی۔)

جنرل آکنلک

آج کل چھٹی پہ گاؤں آیا ہوا ہوں۔ باجرے کی روٹی پہ گندلوں کا ساگ اور گھر کا مکھن۔ سہ پہر جہلم گیا تھا سر شیر محمد خان نے اپنی کوٹھی "الطارق" میں کمانڈر انچیف کو "ری سیپشن" RECEPTION دے رکھا تھا۔ اس تقریب سے ہم نے بھی کمانڈر انچیف کو قریب سے دیکھ لیا۔ سر شیر محمد خان نے ضلع کے کونے کونے سے کوئی ڈیڑھ دو سو سابق فوجیوں کو بلا لیا۔ دعوت کیا تھی سابق فوجیوں کا میلہ تھا۔ ان میں سے اکثر "ویٹرن" (VETRENS) پہلی جنگ عظیم سے بھی پہلے کی لڑائیوں میں، جو سوڈان اور تبت وغیرہ میں ہوا کرتی تھیں، لڑ چکے تھے۔ جو غالباً ۱۹۲۰ء میں پنشن پر آئے اور جن کی بڑی بڑی بارعب مونچھوں کے فوٹو نہ جانے کن کن ولایتوں میں لوگوں کے البموں میں محفوظ ہیں۔ یہ بوڑھے سپاہی زنگار رنگ پرانی وردیوں میں ملبوس تھے۔ موضع گڈاری کے آنریری کیپٹن محمد عربی خان (راجہ سلطان مقصود سابق ڈپٹی کمشنر شیخوپورہ کے والد) اپنی نورانی داڑھی اور باوقار تقریباتی وردی اور اپنے سینے پہ جگمگاتے ہوئے تمغوں کی لمبی قطار کے باعث سب میں نمایاں تھے ـــــ ایک صاحب کے بارے میں کسی نے بتایا کہ آپ لارڈ لارنس کے ساتھ خدمت انجام دے چکے ہیں۔ بلکہ لارڈ موصوف ان کے گھر بھی آئے تھے۔ کمانڈر انچیف خاصی رواں اردو بولتے ہیں۔ سر شیر محمد خان سے (جو راؤنڈ ٹیبل کانفرنس کے مندوبوں میں شامل تھے) اس زمانے کے لندن کی زندگی کی باتیں کرتے رہے۔ کچھ وقت ان کی کوٹھی کے وسیع احاطے میں گوبھی کی کیاریوں میں بھی گھومتے پھرے۔ دل میں سوچتے ہوں گے کہ وہ کمانڈر انچیف ہیں۔ مگر ریٹائرڈ ہونے کے بعد

ولایت میں ان کو اتنی وسیع کوٹھی کہاں نصیب ہو سکتی ہے۔ بار بار کہہ رہے تھے دھوپ بڑی نعمت ہے دھوپ؟

ہم ہیں بیزار اور وہ مشتاق
یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے؟

بیشتر سردار صاحبان کو وہ ذاتی طور پر جانتے تھے۔ جن کو نہیں جانتے تھے ان کی پلٹنوں کو جانتے تھے کہ کس پلٹن کے کتنے جوان کس معرکے میں، کس ملک میں کھیت رہے۔ زندوں سے زیادہ مردوں کو جانتے تھے۔ فصلوں کی بوائی کا اصول پوچھا۔ اولاد کے بارے فرداً فرداً دریافت کیا۔ شاید یہ اندازہ کر رہے ہوں کہ سپاہیوں کے بیٹے فوج ہی میں جا رہے ہیں نا، کوئی اور پیشہ تو اختیار نہیں کر رہے —— جنرل آکنلک کی جو ادا مجھے سب سے زیادہ پسند آئی وہ یہ ہے کہ دعوت کے بعد وہ سیدھے چھاؤنی کی ۹س بارک کو دیکھنے چلے گئے جہاں وہ ۱۹۰۱ء میں سیکنڈ لفٹین کی حیثیت سے ٹھہرے تھے۔ سچ ہے۔

کبھی چھوڑی ہوئی منزل بھی یاد آتی ہے راہی کو

الوداع ۱۹۴۴ء

سال کا آخری دن برف آلود تھا۔ سائیں سائیں کرتی رات، سانحات کا ایک سلسلہ ذہن میں گھوم رہا ہے میٹھی میٹھی یادیں ذہن میں تا دیر چکر کاٹتی رہتی ہیں —— کچھ دیر پہلے نیند سے۔ مجھ سے جہاں تک ہو سکتا ہے، غم انگیز واقعات کو دور دور رکھتا ہوں مگر بقول مرزا غالب

قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی، غم سے نجات پائے کیوں

(ستمبر)

اشکوں کی برسات

پورے دو مہینے تک ڈائری کا ایک لفظ نہ لکھ سکا۔ آج اس کے ویران صفحات کو کھولا ہے مگر کچھ لکھتے ہوئے دل کانپ رہا ہے، لفظ کانپ رہے ہیں، ہاتھ کانپ رہے ہیں۔ جون میں انیس (اہلیہ) کی صحت اکھڑنے لگی اور ۲۹/۳۰، جولائی کی درمیانی شب کو موت کے بے رحم ہاتھوں نے میری انیس زندگی کو مجھ سے چھین لیا۔ میری چاندنی کی مشعل دفعتاً بجھ گئی، زندگی تاریک ہو گئی، روح میں ایک ایسا تیر پیوست ہو گیا جس کی کسک جان کے ساتھ ہی جائے گی۔ ہائے! کیسے یقین کرلوں کہ وہ پیاری پیاری آنکھیں جو میرے لئے روتی اور مسکراتی تھیں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بند ہو گئیں۔! —— وہ "پیکرِ انتظار" جو مجھے ایک لمحے کے لئے اوجھل نہ ہونے دیتی، اب خود مجھ کو چھوڑ کر چلی گئی۔ مگر نہیں نہیں۔ محبت کبھی مر نہیں سکتی، تو میری دھڑکنوں میں، میرے خیالوں میں، میرے شعروں میں ہمیشہ زندہ رہے گی، زندگی کے یہ چار پانچ برس جو ہم نے اکٹھے رفاقت میں گزارے، میری پوری زندگی پر جب تک کہ زندگی ہے محیط رہیں گے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا میرا جسم میری روح کے کرب کو کیونکر سمیٹ سکے گا، سہار سکے گا۔ "کتنا دلکش خواب تھا کہ اچانک ٹوٹ گیا۔" دارالسلام (لوٹی کنڈی شملہ میں میرے مکان کا نام) نے میری سلامتی کو غارت کر دیا۔

تجھے اولاد کی کیا کیا حسرت نہ تھی، دوسروں کے بچوں کو کس چاہت سے اٹھا کر پہروں ان کو چومتی چاٹتی رہتی تھی۔ کسی کا بچہ میلا نظر آئے تو جھنجھلا کر کہا کرتی — "ہائے ہائے ان کو تو بچے کی پرورش کا سلیقہ ہی نہیں آتا۔" مگر جب تم خود "امید" سے ہوئیں تو بچے

کو پیٹ ہی میں لے کر قبر کے پیٹ میں اُتر گئیں۔ تم تو پہروں مجھ سے اپنے ہونے والے منے کی باتیں کیا کرتی تھیں، میں اس تذکرے سے اکتانے لگتا تو مجھ سے لڑ پڑتیں۔ بچے کے آٹھ دس نام تجویز کر رکھے تھے اپنے چچا زاد بھائی سید سجاد حیدر کی اولاد کے وزن پر۔ اور ہر روز کسی نئے فراک کا ڈیزائن کاپی پر اترا ہوا ملتا۔؟

میں تیری علالت میں تیری کوئی خدمت بھی نہ کر سکا تیمارداری کا ارمان دل میں رہ گیا، تو نے اس کی مہلت ہی کب دی۔ سات بجے شام درد کی لہر اُٹھی اور نو بجے تو اپنے رب کی بارگاہ میں جا پہنچی، میں ——— کم وسیلہ، پردیس، یکہ و تنہا ——— تیرے تڑپنے پر تڑپنے کے سوا کچھ بھی تو نہ کر سکا۔ تاریک رات، موسلا دھار بارش، چار پانچ میل دُور، شملہ شہر سے ایک ڈاکٹر صاحب، ساٹھ روپے پیشگی لے کر، رکشا میں سوار ہو کر جب پہنچے تو تیری نبضِ حیات ٹھہر چکی تھی۔ تو یاسمن کی کلی کی طرح اپنی خوشبو میں لپٹ کر ابدی نیند میں سوئی پڑی تھی۔

موت کا کانٹا تیرے دل میں بچپن ہی سے کھٹک رہا تھا، موت کا ذکر تو عام کیا کرتی تھی۔

"مرنا جوانی ہی میں چاہیئے"

میں اپنے ماں باپ کے سامنے ہی مر جاؤں تو بہتر ہے۔

اس قسم کی باتیں تم اکثر کہا کرتی تھیں۔ تمہارے والد نے اپنی وسیع جائداد تمہارے نام ہبہ کر رکھی تھی، تمہیں اندیشہ تھا کہ تمہارے والد کی وفات کے بعد جائداد کے جھگڑے بکھیڑے تمہیں پریشان کریں گے۔ جائداد کی قیمت پر اپنے عزیزوں کی رنجش تمہیں گوارا نہ تھی۔ قضا و قدر نے تیری بات پوری کر دی۔ مگر ہمیں جیتے جی مار ڈالا۔ قبرستانوں میں گھومنا، ایک ایک قبر کی لوحِ مزار کو دیکھنا، دعا مانگنا تجھے بہت مرغوب تھا۔ میری اکتاہٹ پر تو اکثر کہا کرتی ——— "پیارے جی۔ ہمارا اصل ٹھکانا تو یہی ہے" ——— ایک مرتبہ یہ بھی کہا تھا ——— "میں اگر شملے میں مر گئی تو چاہے ہزار روپیہ لگ جائے، میری میت کو ضرور گجرات میرے ماں باپ کے پاس لے جانا" ——— میں نے تیری خواہش پوری کر دی (انہیں کے والدین بعد میں

بیٹی کے پہلو میں دفن ہوئے۔ ۱۹۷۶ء)

میری شاعری پر تو اکثر کڑھا کرتی، اُلجھتی ــــ خفا ہوتی، پوچھا کرتی ــــ "تمہاری شاعری اتنی اداس کیوں ہے! ایسا لگتا ہے جیسے ہر شعر میں آنسوؤں کی گھٹا تلی کھڑی ہو ــــ انسان کو محبت مِل جائے تو پھر اور کیا چاہیئے؟ مجھے دیکھو، میں تمہارے گھر میں برتن مانجھ کر بھی کتنی خوش ہوں۔"

میں جواب دیا کرتا "پگلی۔ آٹھ جماعت پڑھی لڑکی تو زندگی کے فلسفۂ غم کو کیا سمجھے؟ تو نہ غالب سے واقف نہ کیٹس اور بائرن سے۔ یہ میرا غم نہیں، کائنات کا غم ہے۔ میرے آنسوؤں میں تمہارے خاندانی ملازم مھتے کے آنسو بھی شامل ہیں۔ تو یہ کتھا سُن کر ہنس پڑتی اور چھٹے کو ہاتھ میں اس طرح گھمانے لگتی کہ بائرن یا غالب جو بھی سامنے آ جائے اس کو وہیں ڈھیر کر ڈالے گی ــــ مگر! میری پیاری! یہ شعر میرے ذاتی غم کا پیازی رنگ تو اب حاصل کرے گا۔ دردِ فراق کی وہ لکیر میری شاعری میں اب جاگی ہے کہ اگر میں ان لکیروں کو مرتب کروں تو تیری تصویر بن جائے، وہی مسکراتے ہوئے گلابی لب و رخسار۔ افسوس! اب تو ان گیتوں کو نہ سُن سکے گی۔

تجھے نئے نئے کپڑے پہننے کا شوق تھا۔ ملبوسات کے صندوق بھرے ہوتے مگر تو پھر بھی نت نئے نئے کپڑے سلواتی رہتی۔ گھر میں سلائی کی مشین کو تھمنے نہ دیا۔ مگر جب کوئی نیا جوڑا زیبِ تن کر کے "دادِ حسن" لینے کے لئے تو میرے پاس آتی، تو نے اکثر کہا۔

"مجھے اتنے بہت سارے کپڑے کیا کرنے ہیں۔ یہ تو مَیں آپ کی دُلہن کے لئے "بَری" بنا رہی ہوں۔"

میں پوچھتا ـــ "کون سی دلہن"

تم کہتیں ـــ "وہ جس سے آپ میری موت کے بعد بیاہ کرو گے۔"

چاچاجی (انیس کے والد۔ سردار بہادر رسالدار میجر سید محمد اشرف شاہ۔ او بی آئی۔ آئی

ڈی۔ ایم۔ ایس آف کالری گیٹ گجرات) بھاری جائداد کے مالک تھے۔ تیرا کوئی بھائی نہ تھا۔ باپ نے تمام جائداد تیرے نام لکھ رکھی تھی۔ تیری پرورش انتہائی نازونعم میں ہوئی۔ تجھے آلو چھیلنا بھی نہ آتا تھا۔ ماں باپ تجھے ایک پل آنکھوں سے اوجھل نہ ہونے دیتے۔ مگر تو ان سے لڑ بھڑ کر ان کو آزردہ و رنجیدہ کر کے میرے ساتھ دہلی میں پھاٹک حبش خان کے کوچوں اور شملے کی دور اُفتادہ سنجولیوں اور ٹوٹی کنڈیوں میں رہنے کو پسند کرتی۔ حالانکہ میں اپنی قلیل تنخواہ میں نہ ڈھنگ کا مکان لے سکتا نہ زندگی کی دوسری آسائشیں مہیا کر سکتا تھا۔

جون کے آخری ہفتے میں تیری طبیعت تواتر سے کچھ "کچی کچی" رہنے لگی تھی۔ ایسی تشویش کی بات تو کوئی نہ تھی تاہم جولائی میں مَیں نے جہلم میں بھائی صاحب کو لکھ بھیجا کہ وہ اور بھاوجہ آجائیں تاکہ تیری "سنگت" ہو جائے۔ مگر وہ اس روز سہ پہر کو پہنچے، جس رات تیرے کوچ کی ساعت مقرر ہو چکی تھی۔ مجھے یاد ہے کہ جب ریلوے سٹیشن سے بھائی اور بھاوجہ اور ننھی بھتیجی عزیزہ کو لے کر "دارالسلام" پہنچا تو تُو! نہائے دھوئے نیا جوڑا پہنے سیڑھیوں پر کھڑی تھی، پھر تو نے کس چاہت سے آموں اور ناشپاتیوں سے ان کی مدارت کی، ان کے بستر لگائے، پھر بھاوجہ کو گھر کا چارج دیا، کس کو خبر تھی کہ چند گھڑی بعد تم سارا گھر مہمانوں کے سپرد کر کے خود سفرِ آخرت پر روانہ ہو جاؤ گی۔ جیسے تم انہی لوگوں کا انتظار کر رہی تھیں کہ تمہارے بعد مجھے ڈھنگ کی روٹی کون پکا کر دے گا۔ عزیز دین ملازم تو پھلکا توے پر جلا دیتا تھا۔!

اگلی رات! موت سے ۲۴ گھنٹے قبل ــــــ تم دیر تک جاگتی اور چہکتی رہی تھیں۔ ظرافت کی حس بڑی چمکی ہوئی تھی، ہنسنے، بولنے کی امنگ جوانی پر تھی۔ حالانکہ تمہارا معمول تھا کہ دس بجے کے بعد اچک کر بجلی آف کر دیتی اور میرا لکھنا پڑھنا حکماً موقوف کر دیا جاتا مگر اس رات ہم بارہ ایک بجے تک جاگتے رہے۔ تو نے کہا تھا۔

"کل بھائی جان اور بھابی آجائیں گی تو ہم کھل کر پیار بھی نہیں کر سکیں گے۔"

اور وہ تیری شبِ مرگ ، وہ میری شبِ فراق ؛

تجھ پہ درد کے دو حملے ہوئے ۔ درد کہیں بھی تھا یہ سیلِ درد تیری شمعِ حیات گل کر گیا ۔ تو نے پچھلے دو تین مہینوں میں اپنے "شکم کے بچے" کو پالنے کی آرزو میں اپنے آپ کو بے حد کمزور کر لیا تھا ۔ درد کا پہلا حملہ بھی شدید تھا مگر دوسرا حملہ تو جان لے کر ٹلا ۔ تجھ کو شاید احساس ہو گیا تھا کہ تیری جوانا مرگی والی خواہش پوری ہونے والی تھی ۔ کہ تو آغاز کرب ہی سے بار بار کہہ رہی تھی ۔

"آج میں مر جاؤں گی ۔ آج مَیں نہیں بچتی ۔"

ایک مرتبہ تو نے مجھ سے کہا —— "آپ میرے پاس بیٹھ جائیں ۔ میرے نچلے دھڑ کو کچھ ہو گیا ہے ۔" —— تھوڑی دیر بعد پھر کہا —— "آپ میرے پاس لیٹ جائیں ۔ آپ میرے پاس ہوتے ہیں تو مجھے تسکین محسوس ہوتی ہے ۔ شرم نہ کریں ۔ یہ شرم کا وقت نہیں ، میں جا رہی ہوں ۔" پھر چند ثانیوں کے بعد تم تلملا کر اٹھیں اور دو چار تیز ڈگ بھر کر فرش پر گر گئیں ۔ ہم سب نے اٹھا کر بستر پہ لٹایا ۔ کرب کی لہریں شدید تھیں ۔ تجھے چو عرقہ پلانا چاہا ۔ مگر تو نے انکار کرتے ہوئے کہا ۔ "اب کیا ٹھیک ہوں گی" ۔ میں نے قدرے جھڑک کر اصرار کیا تو دوا پیتے ہوئے کہا —— "اچھا پی لیتی ہوں مگر میرا کلیجہ تو پھٹ گیا ہے ۔" پھر تم ہمت کر کے بھابی کی گود میں بیٹھ گئیں ۔ میں سامنے بیٹھا تھا تو اپنی آنکھوں کی پتلیوں کو بڑی کوشش سے پھیلاتے ہوئے اپنی نگاہیں میرے چہرے پر گاڑ دیں اور کہا ،

"پیارے جی ! یہ کیا ہو گیا ۔"

یہ تھا آخری جملہ جو تیرے ہونٹوں سے ادا ہوا یا ہم سن سکے —— پیاری انیس ! تو شام کے اندھیرے میں ڈر جاتی تھی ۔ کیا اب قبر کے اندھیرے میں تجھے ڈر نہیں لگتا ۔ ! اچھا خدا حافظ —— اللہ اور اللہ کا رسولؐ تیرے ضامن ہوں ۔ پنجتن پاک تیرا سہارا

بنیں، دامانِ بتول کے سائے میں تجھ کو جگہ ملے۔ اچھا میری جان۔ اب قیامت کو ملاقات ہوگی۔ دیکھنا اس روز بھول نہ جانا اپنے پیارے کو۔

تم اور کہیں، ہم اور کہیں، جو ناممکن تھا، ممکن ہے
جب سنتے تھے تب ڈرتے تھے، اب پڑتی ہے تو سہتے ہیں

(۷ ہر اگست)

سر شیر محمدؒ

میجر سر شیر محمد خان (آف دومیلی ضلع جہلم) اور ان کے احباب کے لیے مال روڈ کے فیشن ایبل ریستوراں "ڈی ویکو" میں افطاری کا اہتمام کیا ع

میں کہاں اور یہ وبال کہاں

اگلے روز دہلی سے بارہ کھمبا روڈ والے خان بہادر راجہ اکبر علی خان نے فون پر پیغام بھجوایا تھا کہ سر شیر محمد خان اور ان کے دو تین احباب، فوجی افسر، یکم ستمبر افطاری کے وقت سیدھے "ڈی ویکو" پہنچیں گے، کچھ اہتمام کر رکھنا۔ (راجہ اکبر علی دہلی کے کروڑ پتی ٹھیکیدار تھے۔ نئی دہلی کی بعض عظیم الشان سرکاری عمارات انہی کی تعمیر کردہ ہیں۔ اصلاً وہ موضع سرائے عالمگیر ضلع گجرات کے رہنے والے تھے)

میں نے اہتمام کیا کرنا تھا "ڈی ویکو" میں ایک میز ریزرو کرا کے سرِ شام وہاں جا بیٹھا، اپنی طرف سے خان بہادر بدرالدین، کیپٹن راحت سعید چھتاری اور میجر محمد مسعود کو مدعو کر لیا (خان بہادر بدرالدین ایک ممتاز تاجر تھے۔ قیامِ پاکستان کے بعد وہ کچھ عرصہ لاہور کا نیڈوز ہوٹل چلاتے رہے۔ کیپٹن چھتاری پاکستان آرمی میں کرنل ہوئے۔ بیرونی ممالک میں پاکستان کے سفیر بھی رہے۔ میجر مسعود بھی کرنل ہوئے۔ اور جنرل ہیڈ کوارٹر راولپنڈی میں "ری مونٹ" کے ڈائریکٹر رہے۔ ۱۹۴۴ء میں کیپٹن چھتاری اور میجر مسعود بس یہی دو ہندوستانی فوجی افسر جنرل ہیڈ کوارٹر شملہ میں

نظر آتے تھے۔ اور یہ دونوں کبھی کبھی ہمارے حلقۂ ادب کی مجلسوں میں بھی آنکلتے تھے۔ ص ۲۰۷، ۲۰۸

راجہ اکبر علی کے پیغام سے میں نے یہی تاثر لیا کہ سر شیر محمد خان کے ساتھ مسلمان احباب افطاری پر آ رہے تھے۔ مگر جب مہمان آئے تو سر شیر کے سوا سبھی غیر مسلم۔ ایک انگریز لیفٹیننٹ کرنل برڈوڈ (ہندوستان کے ایک سابق کمانڈر انچیف کا بیٹا) اور باقی تین لیفٹیننٹ کرنل ہمت سنگھ، لیفٹیننٹ کرنل رُوورا اور کیپٹن وزیا نگرم۔ جن کو وزی وزی کہہ کر پکارا جاتا۔ ہمت سنگھ اور رُوورا سینڈھرسٹ کے باقاعدہ تربیت یافتہ انفنٹری کے افسر تھے "وزی" نے جو ریاست وزیا نگر کے راجکمار تھے شہزادگی کی وجہ سے اعزازی وردی پہن رکھی تھی۔ ہمت سنگھ جی بھی غالباً کسی ریاست (غالباً نواں نگر) کے رولنگ چیف کے بھائی بھتیجے تھے۔ مگر وزیا نگر کی دھج، ان کی الھڑ جوانی کے صدقے میں دیدنی تھی۔ رُوورا انگریزی کے شاعر ہیں، اردو بھی نک سک سے درست بولتے ہیں۔ ان کے پتا جی دہلی کے کسی کالج کے پرنسپل تھے۔ رُوورا نے مجھ سے اردو کی غزل سُنی اور اپنا ایک انگریزی کا سانیٹ سنایا۔ جس میں ایک اجنبی فوجی افسر سائپرس کی ایک لڑکی سے عشق کرتا ہے۔ ہمت سنگھ جی، رُوورا اور سر شیر، یہ تینوں کھڑپینچ پچھلے دنوں جنرل منٹگمری کی آٹھویں فوج کو "ہلا شیری" کہنے کے لئے مشرقِ وسطیٰ کے دَورے پر گئے تھے۔ ان باتوں سے اندازہ ہوا کہ اگر آٹھویں فوج کی کمان ان کے ہاتھ میں ہوتی تو یہ منٹگمری کی بہ نسبت آدھے ہندوستانیوں کو مروا کر وہی نتائج حاصل کر لیتے جو منٹگمری نے حاصل کئے۔ برڈوڈ سمیت یہ تینوں چارروں منٹگمری کے مخالف "اٹلک کیمپ" سے تعلق رکھتے ہیں۔ وزیا نگرم اپنی ریاستی فوج کی ایک کمپنی کو دیکھنے گئے تھے جو مرسا مطروح میں لڑنے گئی تھی۔ کمپنی کے صرف ایک جمعدار ان کو زندہ ملے جن کو شہزادہ اپنے ساتھ وطن واپس لے آیا۔ برڈوڈ بھی غالباً کوئی درشنی سپاہی تھے کہ ان کے نام کے ساتھ چھ سات القاب و خطابات لگے ہوئے ہیں۔ ان کو ہمارے ملک میں ٹنگروٹ کا مقام پسند تھا جہاں بچپن میں آپ اپنے والد لارڈ برڈوڈ

کے ساتھ مچھلی کا شکار کھیلنے گئے تھے۔ (منگروٹ اب منگلا جھیل میں زیرِ آب ہے) رُدورا ان سب میں ذہین نظر آئے۔ جنگ پر تبصرہ کرتے ہوئے انگریز جیت جائیں گے مگر انگریز تھک چکا ہے ـــــ (جہاں تک مجھے معلوم ہے ہمّت سنگھ جی اور رُدورا دونوں انڈین آرمی میں لیفٹیننٹ جنرل کے رینک تک پہنچے)

چاچاجی

گجرات سے دوسرے تیسرے دن چاچا جی (انیس کے والد) کا خط آجاتا ہے۔ بیٹی کی موت کے صدمے نے بے قرار کر رکھا ہے۔ لمبے لمبے خط لکھتے ہیں جن سے مجھے بھی تسکین ملتی ہے۔ صرف میں ہی ان کے دُکھ میں براہِ راست شریک ہوں۔ چاچا جی بڑے سخت گیر شخص تھے۔ غصہ ہر وقت ناک پر دھرا رہتا تھا۔ غسل خانے میں بھی جائیں تو ریوالور ساتھ رکھتے تھے۔ لوگ ان سے بات کرتے ڈرتے تھے مگر اب موم کی طرح پگھل گئے ہیں۔ طبیعت میں رقت کا یہ عالم ہے کہ بات بات پر آنکھوں میں آنسو بھر آتے ہیں۔ ان کے اکثر خطوط پر ان کے آنسوؤں کے نشان نظر آتے ہیں۔ اس خط میں نہج البلاغہ کا ایک پورا باب نقل کر دیا ہے۔

بیوی جی (والدہ انیس) کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ گھر میں نہیں بیٹھتیں۔ بیٹھتی ہیں تو محلے بھر کی عورتوں کو جمع کر کے بیٹھتی ہیں۔

دہلی سے شکیل بدایونی کا تعزیت نامہ پہنچا۔ ان سے شاید مولانا رازق الخیری نے میرے صدمے کا ذکر کیا ہو۔ شکیل سے میرے کچھ ایسے گہرے مراسم تو نہ تھے۔ ان کے حسنِ اخلاق کا ممنون ہوں۔ (۲۴ ستمبر)

افسر کی بے گار

گوئٹہ صاحب کو اپنے "کاکے کاکیوں" کے لئے دو پونڈ اون درکار تھی۔ لالہ جی نے

یہ ڈیوٹی میرے سپرد کر رکھی تھی - کہنے لگے - تم کوی ہو - سبھاؤں میں کوتائیں پڑھتے ہو لوگ تمہارا آدر کرتے ہیں - مجھے دو پونڈ اون "کنٹرول ریٹ" پر لا دو - آج میں نے اُن کو اُون لا دی - مگر کنٹرول ریٹ پر نہیں بازار کے ریٹ پر - یوں لالہ جی کو کنٹرول ریٹ ہی بتایا - دام اپنے پلّے سے دے آیا ہوں - اگلی تنخواہ پر وصول ہوں گے - شاید دبابد - ڈپو سے جہاں اون کنٹرول پر ملتی ہے اتنا ہجوم تھا کہ آدمی کی اپنی اون اتر جائے - بہرحال دو تین روز دفتر کی بک بک سے چھٹکارا رہا - عزیز ملک کے ہاں اچھی اچھی کتابوں کا ذخیرہ موجود ہے - یہ شخص ہر ماہ اپنی آدھی تنخواہ کتابوں اور سگرٹوں پر خرچ کرتا ہے - مَیں صبح اُون کی تلاش میں نکلتا اور عزیز ملک کے ہاں جا کر کتابوں میں کھو جاتا - آج کل میری کوشش رہتی ہے کہ میں کسی نہ کسی کام میں کھویا رہوں - فرصت میں دِل گھبرانے لگتا ہے - دن میں کئی بار آنسو چھلک پڑتے ہیں —— یارب، زندگی میرے کس جرم کی سزا ہے ؟

دسہرہ

تارہ دیوی کے گھاٹ پر دسہرے کا میلہ لگا ہوگا - حسن و جوانی کا سیلاب امنڈا ہوگا - پارسال ہم بھی گئے تھے - اب وہ دماغ کہاں - دِل بجھ جائے تو بازار کے سارے چراغ بجھ جاتے ہیں - میاں محمد صاحب نے سیف الملوک میں اس مضمون کو بڑے دلگداز انداز میں بیان کیا ہے - (۲۵ ستمبر)

سر محمد نواز خان

مال روڈ پر سردار سر محمد نواز خان (آف کوٹ فتح خان ضلع کیمبل پور) مِل گئے - ان سے میری ۱۹۳۳ء کی شناسائی ہے - جب میں کیمبل پور کالج میں پڑھتا تھا - ایک مرتبہ انہوں نے کالج کے آٹھ دس ممتاز طلبا کو اپنے گاؤں میں ضیافت دی تھی - انگریزی

کے پروفیسر الیش کمار ہمارے ساتھ تھے۔ ہم لوگ ان کے مہمان خانے اور ان کی لائبریری سے بہت متاثر ہوئے۔ ان کی لائبریری ہمارے کالج کی لائبریری سے زیادہ بڑی اور زیادہ منظم تھی۔ ان کا مطالعہ بہت وسیع ہے۔ دیکھنے میں بلکہ گفتگو میں ان کے لہجے سے بھی اس بات کا اندازہ نہیں ہوتا کہ کوئی پڑھے لکھے شخص ہوں گے۔ وزیر اعظم پنجاب (خضر حیات ٹوانہ) کے بلاوے پر شملہ آئے ہیں۔ میں نے پوچھا —— "وزارت کی پیش کش ہوگی" —— جواب دیا —— "میں گوشہ نشین رہنا پسند کرتا ہوں۔ میں وزیر بننے پر تیار نہیں ہوں۔ مگر وزیر اعظم کے بلاوے پر تو آنا پڑتا ہے۔"

لباس وہی کلاہ دار پگڑی۔ سفید لٹھے کی شلوار، پاؤں میں سیاہ پمپ، جسم پر ریشمی شیروانی، بلند قامت وجیہہ آدمی، خوبصورت بھری بھری مونچھیں، لوگ ان کو دیکھنے کے لئے سڑک پر ٹھٹک ٹھٹک جاتے۔ ایک خوب رو نوجوان بھی ان کے ہمراہ تھا شاید مسٹر گول آئی سی ایس تھے۔ کچھ ہجوم ان کو بھی دیکھ رہا ہوگا کہ دیکھنے کی چیز ہیں (قیام پاکستان کے بعد سر محمد نواز خان، وزیر اعظم لیاقت علی خان کی کابینہ میں ڈپٹی منسٹر برائے دفاع رہے، فرانس میں پاکستان کے سفیر بھی مقرر ہوئے۔ ص ۱۹۷۶ء)

مہدی علی شاہ

سنٹرل ہوٹل کے مالک خان صاحب سید مہدی علی شاہ شملے کے بڑے رئیس اور میونسپل کمیٹی کے نائب رئیس ہیں۔ ہمارے آغا جی سے ان کی جگری دوستی ہے بزرگ کے دوست ہمارے بزرگ۔ کل حکم دیا تھا۔ کل گرجا میدان میں وار فرنٹ کا بہت بڑا جلسہ ہوگا۔ میں انگریزی میں تقریر کروں گا۔ کیونکہ جلسے میں یونس صاحب (معلوم نہیں کون) بھی ہوں گے۔ آٹھ دس منٹ کا سپاسنامہ لکھ لاؤ۔ گورنر اور وائسرائے کی تعریف ہو۔ ڈپٹی کمشنر کا شکریہ ضرور ادا کرنا۔ شام کی چائے ہوٹل میں میرے ساتھ پیو۔ تقریر

کی ریہرسل بھی کرا جائے۔ آسان انگریزی چھوٹے چھوٹے فقرے۔
مجھے معلوم نہیں شاہ صاحب کتنے پڑھے ہوئے ہیں۔ جماعتوں کے حساب سے مشکل اردو شناس معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن یہ دیکھ کر حیرانی ہوئی کہ دو تین ریہرسلوں میں رواں ہو گئے۔ یہ ٹھیک ہے کہ سپاسنامے میں شکریے ہی شکریے تھے۔ تحصیلدار کا شکریہ، ڈپٹی کمشنر کا شکریہ، شامیانے والے کا شکریہ۔ تاہم انگریزی تو تھی۔ (۲۶ ستمبر)

اشعار

زندگی کی وادیوں میں ہر طرف
سرمئی افسردگی لہرا گئی

فصلِ گُل میں لُٹ گیا میرا چمن
شام سے پہلے مری شام آ گئی
(۲۸ ستمبر)

ہنستے ہوئے وہ دن رات کہاں
یہ اشکوں کی برسات کہاں
لے آئی اسیرِ وحشت کو
نیرنگیِ محسوسات کہاں
(۲۹ ستمبر)

جنگ رنگ

کبھی کبھی تو میدانِ جنگ سے کوئی ایسی خبر بلکہ خوشبو آجاتی ہے کہ میرا دل بھی جنگ میں کودنے کے لئے اچھلتا ہے۔ صوبیدار شیر محمد اطالیوں سے دو دو ہاتھ کرنے کے بعد گزشتہ چھ ماہ سے قاہرہ میں دریائے نیل کی غواصی کر رہے ہیں۔ ان کے خطوط سے معلوم ہوتا ہے کہ امن اور جنس کے مضامین میں اتارو ہو گئے ہیں۔ افریقہ کے صحراؤں نے ان کے ذہن کو شاداب کر دیا ہے۔ تازہ خط میں لکھتے ہیں —— جنگ کا منشا دشمن کو تباہ کرنا ہے۔ غارتگری انسان کی جبلت میں شامل ہے۔ اسی طرح "جنسی سفاکی" کا جذبہ بھی جنگ میں کھل کھیلتا ہے۔ مرد قلعوں کے علاوہ عورتوں کو بھی سَر کرنا چاہتا ہے۔ ایسے لوگ بھی موجود ہیں جو آرٹ کی خوبصورت چیزوں کو پارہ پارہ کرنے میں انتہائی حظ محسوس کرتے ہیں —— جہاں جہاں عورت کا جسم خریدا جا سکتا ہے وہاں وہاں زنا بالجبر کی وارداتیں کم ہوتی ہیں ——!

یہ حضرت جب محاذِ جنگ سے واپس آئیں گے تو ہمیں سپاہی کی وردی میں ایک فلسفی کا خیر مقدم کرنا پڑے گا —— سوختنی نہ فروختنی!!

کنارِ چناب و جہلم

ایک دوڑتا بھاگتا چکّر گاؤں، گجرات اور لاہور کا ہو گیا۔ دس روز کی چھٹی مانگی تھی۔ گھوش بابو (سپرنٹنڈنٹ) نے کانوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا —— "نا بابا! لڑائی لگا ہے۔ تم دس دن کی چھٹی مانگتا —— بس بس چار یا پانچ روج" —— شکریہ کے علاوہ چھٹی کا بھی راشن ہو گیا۔

گاؤں کی وادی میں دینہ سے منگلا سلطان پور تک کھیتوں کے مسلسل خیابان

گندم کی ننھی مُنّی سبز بالیوں کو لہلہاتا ہوا دیکھا۔ یہ کھیت نہ جانے کب سے ہمیں اناج کھلا رہے ہیں۔ اس علاقے کے ہزارہا فرزند "لام" پہ سمندر پار کی دُور دُور ولایتوں میں گئے ہوئے ہیں۔ میں سوچ رہا ہوں کہ وہ ــــــ بصرہ، بغداد، سائپرس، یونان جہاں کہیں بھی ہیں، یہ کھیت ہر وقت اُن کی آنکھوں کے سامنے رہتے ہوں گے۔

مَیں اور منظور (میرے چچا زاد بھائی سید منظور حسین جعفری ریٹائرڈ ڈسٹرکٹ انسپکٹر آف سکولز) جن دِنوں (۳۸-۱۹۳۷ء) اسلامیہ کالج لاہور میں پڑھتے تھے۔ لاری بس کے ذریعے لاہور جاتے یا گھر آتے ہوئے دریائے چناب کے کنارے رائے بہادر کیدار ناتھ کے باغ کے قریب ایک چھوٹی سی مسجد زیرِ تعمیر دیکھا کرتے۔ یہ مسجد اب تک تعمیر ہو رہی ہے۔ بلکہ ایک شخص جو ۱۹۳۷ء میں صندوقچی کھڑکھڑا کر بس کے مسافروں سے چندہ مانگا کرتا تھا، میں سمجھتا ہوں آج بھی شخص اُسی صندوقچی کے سمیت آنے جانے والی لاریوں کی تاک میں اس ناکے پر موجود ہے۔ گجرات میں دو ہی امیر کبیر خاندان ہیں۔ رائے بہادر کیدار ناتھ اور شریمتی رام پیاری۔ شریمتی بھی کسی رائے بہادر کی بیوی ہے۔ دونوں خاندانوں میں دولت جمع کرنے اور اونچی سے اونچی حویلیاں بنوانے کی "برد" لگی ہوئی ہے۔

آنکھ کی شرم

ایک روز لاہور ٹھہرا تو وہاں سردار سر سندر سنگھ مجیٹھیا کی کوٹھی میں ایک تقریب میں جا نکلا۔ (سر سندر سنگھ پنجاب میں سر سکندر حیات کی کابینہ میں وزیر رہے) تقریب کے دو حصے تھے۔ پہلے گرنتھ صاحب کا پاٹ پھر "کڑاہ پرشاد" کی دعوت جس میں چودھری چھوٹو رام، ابناشا سنگھ، رائے بہادر، کیپٹن لال چند اور ملک اللہ بخش ٹوانہ جیسے

مسلمان، ہندو اور سکھ "یونینسٹ" اکابرین بڑی تعداد میں مدعو تھے، مسلمانوں کے واسطے "کڑاہ پرشاد" مسلمان باورچیوں سے پکوایا گیا تھا۔ مجھے پروفیسر سید عابد علی عابد اپنے ساتھ لے گئے تھے۔ اور عابد صاحب کو اللہ یار خان دولتانہ ساتھ لے گئے تھے۔ ہم تو اسی خیال سے گئے تھے کہ جاتے ہی "کڑاہ پرشاد" پر ہاتھ صاف کریں گے۔ مگر وہاں ایک گرنتھی شیر سنگھ کی تقریر ابھی ختم نہیں ہوئی تھی۔ گرنتھی شیر سنگھ نابینا تھے، بوڑھے بھی تھے۔ مگر آواز ابھی تک گرجدار تھی۔ آپ پہلے تو کچھ دیر ماسٹر تارا سنگھ کو للکارتے رہے، پھر تارا سنگھ کو چھوڑ کر اورنگ زیب عالمگیر کو پکڑ لیا۔ میزبانوں کے چہرے پر ایک رنگ آتا ایک جاتا۔ مگر گرنتھی جی کو درمیان میں کس طرح روکا جاتا؟ بعد میں سردار سندر سنگھ کے پریوار کے لوگوں نے مہمانوں سے معذرت کرتے ہوئے کہا ــــ سجنو معاف کرنا۔ گیانی جی کی آنکھیں نہ تھیں۔ ورنہ کچھ آنکھ کی شرم ہی آ جاتی۔

وکٹوریہ کراس

"وکٹوریہ کراس میڈل" بھی دیکھ لیا کہ کیسا ہوتا ہے۔ ضلع جہلم کا جو آدمی لاہور آتا ہے، وہ چکوال کے ڈاکٹر حق نواز (مشہور ویٹرنری سرجن) سے ملے بغیر واپس نہیں جاتا۔ میں بھی ان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ وہاں اس وقت خان سرفراز خان (جو مدتوں چکوال سے صوبائی اسمبلی کے رکن رہے) اور صوبیدار خدا داد خان صاحب تشریف رکھتے تھے۔ صوبیدار صاحب نے وردی پہن رکھی تھی جس پر "وکٹوریہ کراس" کے زیر سایہ گیارہ دوسرے چھوٹے بڑے سفید اور سنہرے، گول اور کنگرے دار تمغے جگمگا رہے تھے۔ ایسے لگتا تھا جیسے انگریزوں نے بہت سے ملک انہی کے سینے کے زور سے فتح کئے ہوں۔ صوبیدار صاحب اپنے مربعوں پر گئے ہوئے تھے۔ وہاں سے گورنر کو خط لکھا کہ ملنا چاہتا ہوں۔ گورنر نے ضلع کے ڈپٹی کمشنر کی زبانی پیغام بھجوایا کہ آئیے بلکہ

اتنی جلدی آیئے کہ آپ روٹی لائل پور میں کھائیں تو پانی گورنمنٹ ہاؤس میں آکر پیجیے۔ ریلوے سٹیشن پہ گورنر کا ایڈی کانگ موجود تھا۔ صوبیدار صاحب ابھی ابھی گورنر کے ساتھ چائے پی کر آئے تھے۔ کام کچھ بھی نہ تھا ___ "وکٹوریہ کراس" کا بھی دیدار ہو گیا۔

؎ جو چیرا تو اِک قطرہ خوں نکلا

داڑھی

شفیع راجہ اور میں نے اپنی داڑھیاں منڈوا ڈالیں۔ جاتے جاتے داڑھی کی ایک الوداعی تصویر فوٹو گرافر سے کھینچوا لی۔ شفیع کی داڑھی میری داڑھی سے کوئی تین ہفتے "سینئر" تھی۔ مگر روئیدگی میں وہ میری داڑھی کی گرد کو نہ پہنچ سکی۔ ہماری دیکھا دیکھی کوثر لدھیانوی نے بھی داڑھی رکھ لی۔ کاہلی بھی چھوت کی بیماری ہے۔ کوثر کی داڑھی اب اکیلی رہ جائے گی۔ ممکن ہے جاڑے کا سیزن وہ داڑھی سمیت نکال جائے۔ شفیع اور کوثر کے داڑھی خوب سجتی ہے۔ گورے چٹے آدمی۔ داڑھی کی "ناز برداری" کا بھی پورا پورا خیال رکھتے ہیں ___ چلو! یہ بھی ایک تجربہ رہا۔ مجھے اپنے اندر سب سے زیادہ تکلیف اس احساس پہ ہو رہی تھی کہ لوگ مجھے پارسا سمجھنے لگ گئے تھے۔ بعض لوگ تو مسئلے مسائل پوچھنے آجاتے۔ عالمِ اشکال بھی کتنی مبالغہ آفریں چیز ہے ___! کیا کیا امید بندھتی ہے اک اک نگاہ پر؟

سیاسی چہل پہل

شملے کی سیاسی چہل پہل کا موسم ختم ہو چکا ہے۔ یوں بھی یہاں سیاست کی بہت زیادہ گرمی کبھی دیکھنے میں نہیں آئی۔ یہ انگریز افسروں، دیسی کلرکوں اور دولت مند ٹھیکیداروں کا شہر ہے۔ جن لیڈروں کو دیکھ کر نعرے لگانے کو جی چاہتا ہے ان میں

سے اکثر جیلوں یا گھروں میں بند ہیں ۔ یا وہ، حکومت کی راہ سے ہو کر گزرتے ہی نہیں ۔ تاہم چنداں ایک مرنجاں مرنج ہیں جو بیچ بچاؤ کے سلسلے میں، کبھی کبھار، اس موسم میں بھی یہاں آ نکلتے ہیں ۔ وائسرائے کے بلاوے پر، یا وائسرائے کے تعاقب میں ۔ انگریز ۔ ان کی بات سنتا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ مگر لوگ ان کی بات نہیں سنتے ـــــ سر تیج بہادر سپرو ۔ جیکر ۔ اور کئی دوسرے !

شفیع منصور

اگر کسی شاعر کی تخلیقی صلاحیت کا اندازہ اس کی غزل کے تیور، گہرائی اور گیرائی وغیرہ سے لگایا جاسکتا ہے تو شفیع منصور کی غزل کی چمک دمک کو ماننا پڑتا ہے ۔ ہم نے تو حضرت مولانا افضلی صاحب کی زبانی ان کی زبان دانی ہی کی تعریف سنی تھی ۔ مگر اصل چونکا دینے والی چیز تو ان کی شاعری ہے ۔ بالخصوص ان کی زبان کی مٹھاس اور سوچ کے درد میں ڈوبی ہوئی غزل ۔ وہ انگریزی سے اردو میں ترجمہ بھی خوب کرتے ہوں گے، مگر شعر میں انسانی جذبات کی ترجمانی بھی خوب کرتے ہیں ۔ دیکھنے میں غم آلودہ محفلِ احباب میں پھلجھڑی ـــــ (مولانا افضلی مرحوم لسانیات اور علومِ مشرقی کے جید عالم اور فرشتہ سیرت انسان تھے ۔ معروف دانشور پروفیسر قدرت اللہ فاطمی مولانا مرحوم کے فرزندِ ارجمند ہیں) شفیع منصور جنرل ہیڈ کوارٹر میں اعلیٰ سویلین مناصب پر فائز رہے ۔ اگرچہ اپنے کثرتِ مطالعہ کے معمول اور علمی انہماک کار کی مصروفیت کے باعث وہ شعر گوئی پر کم توجہ دے سکے ہیں اور مجالس شعری میں اس سے بھی کم آتے جاتے ہیں ۔ بلکہ سوائے مجی ۔ محبِ عارفی کے ہاں کی نشست کے جو اسلام آباد میں ہر سنیچر کی شام کو منعقد ہوتی ہے آپ کسی دوسری ادبی محفل میں شریک نہیں ہوتے ۔ بہر حال اہلِ نظر اُن کے مرتبۂ فکر و فن سے بے خبر نہیں ہیں) (۱۹۷۷ء)

باوا پرتھوی چند

شاباش اکرم قریشی! ـــــ قربان جاؤں تیرے کہ تو نے "اسٹڈی سرکل" کے جلسوں کے لئے ہندوؤں میں سے بھی ایک فاروق حمیری ڈھونڈ لیا۔ اب ہم ایک اتوار کو حمیری صاحب کے ہاں شعر سناتے اور جالندھری گجریلے اور دہلی کے شاہی ٹکڑے اڑاتے ہیں تو دوسری اتوار باوا پرتھوی چند کے ہاں آگرہ کی امرتیوں اور کلکتے کے رس گلوں کو آنکھوں کے سامنے رکھ کر مصرعے اٹھاتے ہیں۔

باوا پرتھوی چند اسسٹنٹ انچارج ہیں، میری سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ ملازمت کیوں کر رہے ہیں۔ جاکھو پہاڑی پر جتنے شاندار ذاتی بنگلے میں وہ رہتے ہیں، ویسا بنگلہ ان کے انگریز ڈپٹی سیکرٹری کو بھی میسّر نہیں ہے۔ یہ ایک بنگلہ کیا۔ ہم نے سُنا ہے کہ ان کے پتاجی کو جو بہت بڑے سَنت مہنت مہاپرش تھے۔ اُن کے شردھالوؤں نے کئی دوسرے شہروں میں بھی کوٹھیاں بنوا کر دے رکھی ہیں۔ اب باوا پرتھوی چند اُن کا کرایہ کھا رہے ہیں۔ سنجولی کی طرف ایک پوری بستی میں ان کے شردھالو رہتے ہیں۔ سنیچر کے سنیچر گاؤں کا سارا دودھ ان کے چرنوں پر چڑھ جاتا ہے جس کی اتوار کو کھیر پکتی ہے جو ہم لوگ شڑپ شڑپ کھاتے ہیں۔ اکرم قریشی کا خدا بھلا کرے کہ اُس نے فاروق حمیری کا بوجھ بٹانے کے لئے باوا پرتھوی چند مہیا کر لیا۔ ورنہ حمیری صاحب اپنے شوق اور وضع داری کے ہاتھوں اپنا ایک آبائی مکان بیچ کر اردو شاعری پر نچھاور کر چکے ہیں۔ باوا اور حمیری میں ایک یہ خوبی مشترک ہے کہ دونوں اُردو شاعری سے تو محبت کرتے ہیں مگر خود شعر نہیں کہتے۔ باوا پرتھوی چند کھیر گاڑھی مگر شعر پتلا (یعنی آسان) پسند کرتے ہیں منشی مہاراج پرشاد برق دہلوی سے شردھا رکھتے ہیں۔ ان کے ہاں محفل ہوتی ہے۔

تو اس کی ابتدا رمہاراج برشاد برق ہی کی غزل سے ہوتی ہے، جو بادا پرتھوی چند خود ہارمونیم پر گا کر سناتے ہیں ــــ ٹھیٹھ ہندوانہ کیرتن کی فضا میں اردو شعروادب کا یہ چرچا کتنا غنیمت ہے ۔ پاسباں مل گئے کعبہ کو صنم خانے سے ــــ کچھ کارفرمائی اس میں نقش کی بھی شامل ہے ۔

(فاروق حمیری صاحب جنرل ہیڈ کوارٹر راولپنڈی میں سویلین سٹاف افسر(۲) کے عہدے سے ریٹائرڈ ہوئے ۔ چونگی ۲۲ کی ایک کشادہ حویلی میں رہائش رہی چند برس پہلے انتقال ہوا ــــ نقش ــ عبداللطیف نقش، جوائنٹ سیکرٹری وفاقی وزارت زراعت ۔ ۱۹۷۷ء)

پرنسپل صدرلینڈ

انسانی رشتوں میں ایک رشتہ درسگاہ کا بھی ہوتا ہے ۔ یہ رشتہ کچھ ہم جماعت طلباء تک ہی محدود نہیں ہوتا بلکہ مختلف اوقات میں آگے پیچھے پڑھنے والے طلباء کے درمیان بھی شجرہ نسب کے سلسلے کی طرح چلتا رہتا ہے ۔ ڈاکٹر رشید ہم سے بہت پہلے اسلامیہ کالج لاہور میں زیرِ تعلیم رہے ۔ مگر ان سے جب کبھی ملاقات ہوئی وہ ڈاکٹری کو طاق پر رکھ کر اپنے عہدِ طالب علمی کی دبی چنگاریاں سلگانے بیٹھ جاتے ہیں ۔ ان کے بقول ان دنوں رات کے وقت ریلوے سٹیشن سے کالج آتے ہوئے ڈر لگتا تھا کیونکہ اس وقت کی برانڈرتھ روڈ شہر سے نہیں کھیتوں سے گزرتی تھی ۔ آج وہ یہ بتانے آئے تھے کہ "ہملوگ" (یعنی وہ لوگ) گرمیاں ہوں یا سردیاں ۔ صبح کے وقت دہی کی لسّی کے پیالے کے ساتھ ۔ نان کلچے کا ناشتہ کرتے تھے ۔ کلچے کی بات کرتے ہوئے ــــ دوسرا "نوالہ" انہوں نے ۔ میڈیکل کالج لاہور میں جاکر ــــ "کھایا" اب وہ اپنے انگریز پرنسپل صدرلینڈ کی باتیں کر رہے تھے ۔

کرنل صدر لینڈ اپنی کوٹھی سے بائیسکل پہ کالج آیا کرتے۔ وقت کے اتنے پابند کہ جب وہ راجہ نرندرا ناتھ کی کوٹھی کے سامنے سے گزرتے تو راجہ صاحب کا کوچوان بگھی جوتنے لگ جاتا۔ ڈاکٹر رشید کی باتوں سے ایسا لگتا ہے جیسے وہ دوسری بائیسکل پہ ڈاکٹر صدر لینڈ کے پیچھے پیچھے لاہور کی سڑکوں سے گزر رہے ہوں۔ ایک واقعہ سناتے ہوئے کہا — "ایک روز چوبرجی میں کرکٹ کا میچ تھا ہم لوگوں نے چھٹی مانگی تو کرنل صدر لینڈ نے جواب دیا — میرے پیارے بچو! مجھے جو تنخواہ ملتی ہے اس میں تمہارے والدین کا "انکم ٹیکس" بھی شامل ہے۔ میں نے اگر آج کا سبق نہ پڑھایا تو میں ان کو کیا جواب دوں گا"

جعفر زٹلی سے تعارف

جعفر زٹلی کو میں ایک "ہرزہ گو" شاعر سمجھتا تھا۔ میر تقی میر نے تو موصوف کو "نادرہ زبان" اور "عجوبہ دوران" کہا ہے۔ آپ بڑے بہادر شخص تھے۔ فرخ سیر بادشاہ کے حکم پر قتل ہوئے۔ چوری ڈاکے کے الزام میں نہیں، حق گوئی کے جرم میں۔ بادشاہ کے ایک مخالف رئیس نواب زادہ ذوالفقار خان سے ان کی گاڑھی چھنتی تھی۔ نواب کا انتقال ہوا تو آپ نے مرثیہ لکھتے لکھتے فرخ سیر کی خبر لے ڈالی۔

سکہ زد، بر گندم و موٹھ و مٹر   بادشاہے تسمہ کش فرخ سیر

یہ شعر ان کو بہت مہنگا پڑا۔

آپ کا قیام دہلی میں تھا۔ کچھ زمانہ اورنگ زیب عالمگیر کے عہد کا بھی دیکھا۔ مرزا بیدل کے ہمعصر تھے۔ بیدل کی حمایت میں ان کا ایک مصرع بہت مشہور ہے ؏

چہ عرفی، چہ فیضی بہ بیدل تو ہیچ

چلتے چلتے حضرت کے دو شعر در بیان زوجہ اپنی گرہ میں باندھ لوں۔

بات بات میں کنھٹی دابے — ہڈی، کڈی میری چابے
ہاتھی ہو کر مجھ کو پیلا — چیل جھپٹا مجھ سے کھیلا

نرساد صاحب (شملے میں میرے پڑوسی) کے کتب خانے سے بھی کیسے کیسے تذکرے پڑھنے کو مل جاتے ہیں۔ نواب ذوالفقار خان ؟ معلوم ہوتا ہے اس نام نے نوابی کا پٹہ لکھوا رکھا ہے۔ فرخ سیر کے زمانے میں وہ نواب ذوالفقار خان اور ہمارے زمانے میں نواب سر ذوالفقار علی آف مالیر کوٹلہ جن کے بارے میں علامہ اقبال نے فرمایا تھا۔ ع

موٹر ہے ذوالفقار علی خاں کا کیا خموش

گھوش بابو

گھوش بابو نے آج کل چھاؤنیوں کا شجرہ نسب چھلنی میں ڈال رکھا ہے (آپ ڈی یم سیکشن میں جو چھائونیوں کے محکمے سے متعلق تھا۔ ہمارے سپرنٹنڈنٹ تھے) کو میلا کے پاس ایک گاؤں کے رہنے والے، جہاں ان کے والد مدرس تھے۔ میٹرک کے بعد کلکتے اور وہاں سے انگریزوں کا دار الحکومت لے کر دہلی آگئے۔ ملازمت سے ریٹائر ہونے لگے تو جنگ چھڑ گئی۔ اب جنگ ختم ہو گی تو ملازمت بھی ختم ہو گی۔ آٹھ سو روپیہ تنخواہ پاتے ہیں۔ روزانہ لوگوں سے پوچھتے رہتے ہیں "بابا یہ لام کب ختم ہو گا"

چھاؤنیوں کی چھان پھٹک کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ کون سی چھاؤنی کس لارڈ کے زمانے میں آباد ہوئی۔ "لارڈ ولزلی، لارڈ ڈلہوزی، لارڈ... "ماتحت کمانڈ آفسوں" میں جتنا پرانا ریکارڈ اس موضوع پہ پڑا سڑ رہا تھا آپ نے صدر دفتر میں منگوا لیا ہے۔ جو دفتر میں جا بجا بوریوں میں اس طرح بندھا پڑا ہے کہ نئے ریکارڈ کا کھولنا دشوار ہو گیا ہے۔ ایک ایک چھاؤنی ایک ایک کلرک کے سپرد کر رکھی ہے۔ میں آگرہ چھاؤنی کا انچارج ہوں۔ آگرہ کے ایگزیکٹو آفیسر اور ملٹری اسسٹنٹ آفیسر

نے جو ملبہ بھجوایا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے "تاج محل" تک آگرے کی ہر چیز صاف کر دی ہے۔ تمام آگرہ ــــ یہاں "آ گرا"۔

اگلے دن ــــ حکم دیا ــــ "آج ــــ دفتر بند ہونے پر آگرہ کا بورا کھلے گا" ــــ میں نے عرض کیا ــــ "دس بوری مال ہے"

بولے ــــ "کوئی بات نہیں، کام شروع کرے گا تو کام ختم کرے گا" پہلی بوری کھولی تو اس میں سے کسی کیپٹن ڈاؤ لینڈ (DIWLAND) کی چٹھی نکلی۔ گھوش بابو تو اس کو دیکھتے ہی آگ بگولہ ہو گئے۔ گرج کر بولے "بورا بند"۔ پھر ڈاؤ لینڈ کو بنگلہ میں ادھ موئی سی گالیاں دیتے ہوئے بولے "اس سالے نے ہمارا کانفی ڈنشیل خراب کیا تھا۔ نہ تو آج ہم رائے بہادر ڈوبے کے مافق ہوتا"۔ دیکھئے اب یہ "بورے" دوبارہ کب کھلتے ہیں (رائے بہادر ڈوبے انڈر سیکرٹری تھے)

میجر ہمفرے کا جنازہ

شملہ کے انگریزوں نے میجر ہمفرے کا جنازہ بڑی دھوم سے اٹھایا۔ میری ذاتی معلومات کے مطابق تو یہ کسی انگریز فوجی افسر کا جنازہ تھا مگر ہمارے "ڈی اے جی"، لالہ دینا ناتھ کو اس کا نام بھی معلوم تھا۔ ہمفرے کی باڈی BODY "یونین جیک" میں لپیٹ کر، "توپ گاڑی" پر رکھ کر جلوس کی صورت میں، لفٹ رائٹ لفٹ رائٹ کرتے قبرستان تک لے جائی گئی۔ پورا جنرل ہیڈ کوارٹر، توپ گاڑی کے پیچھے پیچھے چل رہا تھا۔ کرنل، بریگیڈیئر اور جرنیل بازوؤں پر سیاہ پٹیاں باندھے سر جھکائے چلے جا رہے تھے۔ لالہ امرناتھ ہمفرے کے ساتھ نوکری کر چکے تھے۔ ہمفرے ان دنوں ابھی سارجنٹ تھا۔ نیا نیا "پائی فورس" سے زخمی ہو کر ہندوستان آیا تھا۔ ایک آنکھ جو پائی فورس میں زخمی ہوئی تھی ہندوستان میں نکالی گئی تھی۔ ۱۹۴۰ء کے زخم کی وجہ سے ۱۹۴۳ء میں اس کی

موت کو براہِ راست "میدانِ جنگ کی موت" کا مرتبہ دیا گیا۔ لالہ دینا ناتھ کے بقول۔" ہمفرے بڑا سادہ مزاج تھا۔ ہماری دال روٹی اس رغبت سے کھاتا کہ اس کو دیکھ کر ہماری بھوک بھی چمک اٹھتی"۔ کہا کرتے۔" اگر اس کا رنگ ٹینگر نی نہ ہوتا تو میں کہتا اس کا باپ ضرور بہ ضرور ہندوستانی ہوگا"

لالہ جی، ہمفرے کو دوست تو بہت رکھتے تھے مگر اس کے جنازے کی دھوم دھام پر کچھ خوش نہ تھے۔ کہتے۔" اس غریب کو کتنے پونڈ کا فائدہ ہوا؟ وہ تو چھ مربع فٹ کی "چھپری" (کوٹھڑی) میں دو برس سے اکیلا پڑا بیوی بچوں کی صورت کو ترس رہا تھا۔ بلکہ بچوں کو ہی ترس رہا تھا۔ کیونکہ بیوی تو جوانی ہی میں جنرل سمٹس کے اے ڈی سی کے ساتھ بھاگ گئی تھی۔ شملے سے اس کا سامان آرمی انسٹرکشن نمبر — کے تحت سربمہر کر کے وار آفس (WAR OFFICE) بھیجا جائے گا۔ پھر۔ جو چیز جس کے ہاتھ آئے —۔ ہائے رام! ہائے رام!!

بُلبل ٹیڈم روڈ پر

میرا پیارا بلبل آج کل —— امپھل۔ ٹیڈم روڈ پر اڑ رہا ہے۔ محاذِ جنگ سے اس کے لمبے لمبے خط پڑھ کر لطف بھی آتا ہے اور ہول بھی لگتا ہے۔ تازہ خط انگریزی میں لکھا ہے۔ کیوں نہ ہو آج کل وہ ایک گورا پلٹن کے پڑوس میں خیمہ زن ہیں بلکہ رائل آرڈی ننس کے ایک گورے کے" ہانڈی وال" —— بنے ہوئے ہیں۔ سری پرتاب کالج سرینگر کے میگزین کے ایڈیٹر رہ چکے ہیں۔ شاعر، ادیب، سپاہی، فنکار صوبیدار غلام علی بلبل بی اے۔

لکھتے ہیں —— امپھل —— ٹیڈم روڈ کا مائل سٹون ۱۶۵ (MILES STONE) میرے خیمے کے سامنے نصب ہے۔ ہماری چودھویں آرمی (14TH ARMY) پیچھے کئی میلوں

تک پھیلی ہوئی ہے۔ ہمارا سترہواں ڈویژن (17 DIVS) اس سنگِ میل کے آس پاس پڑا ہے جیسے ہم اسی "سنگِ میل" کی حفاظت پر مامور ہوں۔ چاروں طرف ایک وادی ہے جس میں ندی، پہاڑ، درخت، سبھی کچھ ہیں مگر ہائے وادیٔ کشمیر۔ ؟

ہمارے بازو سے وادی کا جو بازو لگا ہوا ہے اس کو گھنا جنگل کہنا چاہیئے کہ — افسر اپنے ماتحتوں کو نہیں دیکھ سکتا۔ نقصان یہ ہے کہ آتے ہوئے جاپانی بھی نظر نہیں آتے۔ کانٹے دار جھاڑیاں ہمارے "بنکر" (BUNKER) پر اس طرح جھکی ہوئی ہیں کہ "بنکر" میں بیٹھے بیٹھے ہاتھ بڑھا کر شاخوں کو توڑ لو۔

ہمارا "بنکر" گورا پلٹن کے "بنکروں" سے ملا ہوا ہے۔ سارجنٹ میجر "گھیلے گھان" (GALE GHAN) جس کو میں "کالا خان" کہہ کر پکارتا ہوں۔ میرا پڑوسی ہے۔ وہ اپنے "میس ٹین" (MESS TIN) میں اپنا سپر یا ڈنر لاتے ہوئے جب جھاڑیوں سے گزرتا ہے تو اس کے انگریزی بھوجن میں پھول پتوں کا بہت سا آمیزہ بھی شامل ہوتا ہے۔

ہمارا "پڑوسی جنگل" دن کو سوتا، رات کو جاگتا ہے۔ شام ہوتے ہی سانپ، درندے، کیڑے مکوڑے حرکت میں آجاتے ہیں۔ ہر درخت کے نیچے موت بیٹھی رہتی ہے۔ مگر اس "موت" کا خوف ہم برما میں چھوڑ آئے ہیں۔ جہاں ہم اپنے جسموں سے لپٹی ہوئی "جونکوں" کو جلتے ہوئے سگریٹوں سے مارتے تھے۔ کچھ دُور ایک بازو کی ٹیکری پر، جاپانیوں کے مورچے ہیں۔ وہ ٹوکیو اور یوکوہاما سے لڑتے ہوئے یہاں آئے ہیں اور ہم "باندی پور" سے۔ (بلبل باندی پور سری نگر کے رہنے والے ہیں۔)

پرسوں سے دھواں دھار بارش کا سلسلہ جاری ہے۔ مورچے پانی سے بھرتے جا رہے ہیں "میرا کٹ بیگ (KIT BAIG) جس میں ڈائری کے علاوہ "حسینوں کے چند خطوط" بھی محفوظ ہیں، پانی میں تیر رہا ہے۔ بارش چندے جاری رہی تو شاید میں بھی تیرنے لگوں۔ ڈوبنا نہیں تو — تیرنا ہی پڑے گا۔

تیرہ (۱۳) کا ہندسہ میرے لئے خاصا گڈ لا رہا ہے - ۱۳ مارچ (۱۹۴۴ء) کی رات کو جب بارش کے دوران، انگریزی محاورے کے مطابق "بلیاں اور کتے" (CAT & DOG) برس رہے تھے (اتفاق دیکھئے کہ ہمارے "فارمیشن" کا نشان بلّی ہے) تو جاپانی توپوں نے گولہ باری شروع کر دی - زبردست گولہ باری دھاں' دھم، دھاں، دھم - جتنے گولے اُدھر سے آ رہے تھے، اتنے ہماری طرف سے جا رہے تھے - حساب کتاب برابر - اس گھن گرج کے درمیان کسی نے بوکھلائی آواز میں پکارا -

"بِل مجھے اندر کھینچ لو"

یہ سبانگ تھا - وہ مجھے بِل (BILL) کہا کرتا - نام تو اس آسٹریلوی نژاد لڑکے کا کیپٹن اور وی - ایل - آسٹن تھا - مگر سماٹرا کے ایک خوبصورت جزیرے کے نام پر جہاں اس نے ایک یوریشین لڑکی کی زلفوں کی چھاؤں میں کچھ شاداب شب و روز گزارے اس نے اپنا تخلص سبانگ رکھ لیا تھا - مَیں نے سبانگ کو اپنے مورچے کے اندر کھینچ لیا - مَیں نے سوچا، سبانگ ضرور کچھ زیادہ پی گیا ہوگا ورنہ اس سمے مورچے سے باہر کون نکلتا ہے ؟

"خیر تو ہے سبانگ ؟"

مشرق کے زرد مَن گردن پر سوار ہوں تو خیریت کیسی ؟ — دیکھو — (ایک ننگی گالی دے کر) ان بارشوں میں کیا سوجھی ہے - ہوا کا رُخ میرے مورچے کی طرف تھا - میں نے سوچا تمہارے پاس جا بیٹھوں - میں نے جواب دیا "ہوا کا رُخ تمہاری طرف ہے مگر گولی کا رُخ ہماری طرف ہے - بہر حال - چشم ما روشن دلِ ما شاد" کہو تو کالا خان کو بھی بلوا لوں -

"ہرگز نہیں" سبانگ زور سے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا "ہرگز نہیں -

میں اس مردود کو سخت ناپسند کرتا ہوں - ۱۹۴۱ء میں ہم کنیڈی (سری لنکا)، سے بمبئی پہنچے تو حالانکہ اس "باسٹرڈ" کی سیاہ چشم وائف کرسچین عورتوں کے ہاسٹل میں اس کی راہ تک رہی تھی مگر اس "سن آف سو اینڈ سو (SON OF SO & SO) نے جہاز سے اترنے کے بعد پہلی رات بازارِ حسن کی ایک طوائف کے بستر پر گزاری۔

سانگ، گہری فلسفیانہ گفتگو کر رہا تھا۔ اس کیفیت میں جو بھی موضوع ایک بار اس کے سامنے آجائے وہ اسی پر چلے جاتا ہے۔ آج خیالات کا دھارا (SEX) "سیکس" کی طرف تھا۔ اس وقت اگر جاپانی ہمیں گرفتار کر لیتے تو سانگ اسی موضوع پر بولتے ہوئے پکڑا جاتا۔

"تمہیں معلوم ہے جنگ میں سب سے پہلے کون ہلاک ہوتا ہے"؟

میں نے جواب دیا" دشمن کا وہ سپاہی جو سب سے پہلے نشانے پر آجائے"۔

وہ جھنجھلا کر بولا" تمہارا آئی-کیو (i-Q) بہت لو (LOW) ہے۔ دشمن کا سپاہی نہیں" مورلیٹی (MORALITY) جنگ کی پہلی" کاژلٹی" (CASULITY) اخلاق! اخلاق !! اخلاق !!!

میں نے کہا" چلو یونہی سہی"۔ وہ تڑت بولا" ارے واہ تم نے بڑی آسانی سے کہہ دیا چلو یونہی سہی۔ ہماری تو سوسائٹی کی بنیاد اس کارن کھوکھلی ہو چکی ہے۔ مجھی کو دیکھو تین مرتبہ کا طلاق یافتہ ہوں۔ تینوں مرتبہ مجھے عدالت کے سامنے اپنی بیویوں پر زنا کا چارج ثابت کرنا پڑا"۔

آسٹن کی عادت ہے کہ وہ گفتگو میں اعداد و شمار بہت گنواتا ہے۔

کہنے لگا:-" ایک امریکی ڈاکٹر کی ریسرچ کی بنا پر ۱۹۳۶ء میں تین ملین سوزاک کے مریض اور نو ملین آتشک کے مریض موجود تھے آج اس ہندسے کو کم سے کم بھی بارہ یا چودہ سے ضرب دے سکتے ہیں۔

"نومیلین؟ ——— ارے ارے!!" میں ہڑبڑایا۔ (کچھ نیند بھی اچٹی تھی)

"ارے ارے کیا؟" سبانگ بولا "جنگ میں بھی مردِ آخر اپنی "مردانگی" کو تو نہیں بھول سکتا۔ میرا ایک دوست جم (JIM) ہے۔ آدھا سکاچ، آدھا نارتھ سائوتھ لینڈر۔ اس نے اپنی "مردانگی" کو ایک عرصہ تک بالائے طاق رکھا تو اچانک انکشاف ہوا کہ وہ "آدھا مرد" رہ گیا تھا۔

میں: "آدھا سکاچ تھا نا"؟

اس پہ ہم دونوں کھل کھلا کر ہنس پڑے اور دیر تک ہنستے رہے۔ گولہ باری بھی ختم چکی تھی۔

کلامِ نرم و نازک

خُلدِ کشمیر کے نازک خیال شاعر ——— غلام رسول نازکی (بی، اے، منشی فاضل) نے ازراہِ محبت مجھ ناچیز کے بارے میں اپنے منظومات تاثرات کا تحفہ بھیجا ہے۔ ایک شاعر کے لئے، کسی دوسرے شاعر کی طرف سے اس سے بڑا تحفہ کیا ہو سکتا ہے۔ ان اشعار میں دراصل اُن کے اپنے حسنِ ضمیر کا عکس جھلکتا ہے۔

نازکی میرے عزیز دوست، صوبیدار غلام علی بلبل کے جگری دوست ہیں۔ کشمیر کے یہ دونوں شاعرانِ شباب و گلاب ——— بانڈی پور کے رہنے والے ہیں۔ بلبل کے رشتے سے نازکی اور میں بھی ایک دوسرے کے قریب آ گئے۔ ایک عرصے سے خط و کتابت کا سلسلہ قائم ہے۔ بلبل ان کے محاسن میں ہمہ وقت چہکتا رہتا تھا۔ میں نے ان کو ایک درویش منش، محبت پرور انسان پایا۔ زبان شیریں ملک گیری۔ ان کی تحریروں سے مجھے ہمیشہ ایسا محسوس ہوا کہ ادب ——— لوگوں کے لئے ایک "ڈھال" کیونکر بن جاتا ہے۔ اور قدرت جس شخص کو شیریں بیانی کے ساتھ عاجزی

کا وصف بھی عطا کر دیتی ہے۔ وہ کتنا محترم انسان ہوتا ہے ــــــ

ــــــ مَیں اِن اشعار کو کمال عاجزی، کمال سپاس گزاری کے جذبے کے ساتھ اپنی یادداشتوں میں محفوظ کر رہا ہوں۔

ضمیر

وہ دلپذیر متانت کا رنگ باتوں میں
وہ پُر خلوص ادا بے درنگ باتوں میں

تکلّفات سے برتر، تصنّعات سے دُور
جہانِ مہر و وفا کائناتِ ذوق و شعور

ترا کلام، فرشتوں کے نغمہ ہائے لطیف
وہ تیری طرزِ ادا، مطربِ فلک بھی خفیف

کہیں شباب کا (اندھے شباب کا) طوفاں
کہیں دیہات کا (سادہ دیہات کا) روماں

کہیں وطن کا ترانہ، زبورِ آزادی
کہیں غریب کی غربت کا نقشِ فریادی

وہ چند لمحے جو یکجا تھے ہم، نہ بھولوں گا
وہ چند لمحے خدا کی قسم نہ بھولوں گا

لال قلعہ

لال قلعے کی سیر کے بعد کل جس وقت ہم اپنی "محل سرا" واقع سبزی منڈی میں پہنچے تو شام گہری ہو چکی تھی۔ روشن نگینوی شیروانی پہنے بیتابی کے عالم میں ہمارا انتظار کر رہا تھا۔ انتظار کی حالت میں اس کے لئے بیٹھنا یا کھڑا رہنا مشکل ہو جاتا۔ اس کیفیت میں پہلے آہستہ آہستہ ٹہلنے لگتا ہے۔ ٹہلنا خالی جائے تو کسی نہ کسی سمت دوڑنے لگتا ہے۔ آج ابھی اس پر ٹہلنے کی کیفیت طاری تھی۔ اضطراب دو آتشہ تھا۔ ایک ہمارا انتظار، دوسرے مشاعرے میں شرکت کی بے تابی۔ ہمیں دیکھ کر دُور ہی سے دھاڑا ؏

دوڑو زمانہ چال قیامت کی چل گیا



مشاعرے کا وقت نکلا جا رہا ہے۔ ہم نے کہا: میاں اچکن اتار دو۔ لال قلعے کی طاری کردہ رقّت ہی آج کے لئے بہت ہے۔ مشاعرے کی رقّت سے مزید دوچار ہونے کی تاب نہیں۔ بلکہ ؏

یہ تاب، یہ مجال یہ طاقت نہیں مجھے

وہ مایوس تو ہوا، برہم بھی ہوا، مگر آخر جگری دوست ہے نا، کوئی عذر کئے بغیر اچکن اتار کر کھونٹی پہ لگا دی اور شیرے ملازم کو آواز دی "آلو گوشت"

مشاعرے میں عدم شرکت کا ہمیں بھی افسوس تھا۔ یہ کوئی معمولی مشاعرہ نہ تھا۔ "وار فرنٹ" (WAR FRONT) کا آل انڈیا مشاعرہ تھا۔ اس کے مہتمم کنور مہندر سنگھ بیدی دہلی کے بڑے بارسوخ افسروں میں شمار ہوتے ہیں۔ ان سے میری ذاتی صاحب سلامت بھی تھی۔ اگرچہ ابھی تک دہلی میں ان سے ملاقات نہیں ہوئی۔ ۱۹۴۰ء میں یہ جہلم میں ہمارے افسرِ مال تھے۔ وجیہہ سکھ، داڑھی بڑی سُتری ہوئی، پگڑی بڑی سُتواں، پٹیالہ مارکہ بھنویں۔ ان کا تعلق منٹگمری اور کلر سیداں (راولپنڈی) کے زمیندار سکھ بیدیوں سے ہے۔

جہلم میں ان کی شاعری کا ہمیں علم نہ ہو سکا۔ جہلم میں کسی کی شاعری کا علم ہو بھی کیسے سکتا تھا؟ یہاں آ کر کنور مہندر سنگھ کی شاعری کی دھوم سننے میں آ رہی ہے۔ سحرؔ تخلص ہے۔ کوٹھی پر شام و سحر (بالعموم شام کو) شاعروں کا جمگھٹ لگا رہتا ہے۔ کل کے مشاعرے کی کارروائی سے معلوم ہوا کہ نواب سائل اور مولانا بیخود دونوں موجود تھے۔ حالانکہ یہ دونوں بزرگ ایک وقت، ایک گلی میں سے بھی نہیں گزرتے۔ جوشؔ اور حفیظؔ کی بھی آپس میں نہیں بنتی۔ ایک نیام میں دو تلواریں کیسے سما سکتی ہیں؟ دہلی کے انگریز چیف کمشنر نے مشاعرے کی صدارت کی۔ (۲۰ مارچ ۱۹۴۵ء)

دہلی کے مسلمانوں نے "یومِ پاکستان" منایا۔ شہر میں مسلمانوں کے علاقے خوبصورت جھنڈیوں، محرابوں اور دروازوں سے آراستہ کئے گئے تھے۔ جوش و خروش دیدنی تھا۔

(۲۳ مارچ ۱۹۴۵ء)

اشعار کا راشن

اتوار کا کلاسیکی مصرف تو یہ تھا کہ دن بھر بستر سے نہ اُٹھتے۔ ناشتہ، شیو، کھانا وغیرہ بستر پہ ہوتا۔ شیو کا تو جھنجھٹ ہی کون کرتا۔ مگر آج نعیم صاحب کی نہاری کے

باعث صبح صبح اٹھنا پڑا۔ نعیم قرول باغ میں رہتے ہیں۔ انہوں نے آٹھ بجے بلایا تھا۔ ہم دس بجے پہنچے۔ یہ بھی ہمارے لئے محال تھا۔

○

ایک مشکل یہ ہے کہ میں اور روشن نگینوی، روزانہ صبح کے وقت ایک دوسرے کے سامنے اپنی اپنی چارپائیوں پر لیٹے لیٹے فکرِ سخن کرتے ہیں۔ یومیہ دو یا زیادہ سے زیادہ تین اشعار کا "راشن" مقرر ہے۔ تعطیل کے دن البتہ جب تک پوری غزل اُتر نہیں لیتی اشعار کا ترشح جاری رہتا ہے۔ تازہ اشعار نہیں تو پرانے شعروں کو مانجھنے، اُن پر رندہ پھیرنے کا کام ہی سہی۔ شاعری میں پتھر کو پانی کرنا پڑتا ہے۔ یہ نکتہ ہمیں استاد جلال الدین حیدر دہلوی نے بتایا تھا کہ صبح کے وقت فکرِ سخن کرنے سے شعر میں آہِ سحر گاہی کا گداز در آتا ہے اور لفظوں میں ایک ریشمی غنودگی جھلکنے لگتی ہے۔ ہم نے استاد حیدر کے کہنے پر شعری سحر خیزی کو اپنا معمول تو بنا لیا مگر یہ نہ سوچا کہ استاد حیدر تو دن کو سوتے اور رات کو جاگتے تھے۔ نہ انہیں صبح صبح دفتر کے لئے تیار ہو کر بائیسکل پر سبزی منڈی سے نارتھ بلاک جانا ہوتا تھا۔

○

نعیم کی نہاری واقعی نعمت تھی۔ نعیم خود تو مرسہ (پنجاب) کے رہنے والے ہیں۔ البتہ شادی دہلی کے ایک ٹھیٹھ گھرانے میں کی ہے۔ سسرال والے کھاتے پیتے لوگ ہیں۔ قرول باغ کا مکان، جس کے "ہوادار" میں آج کی بساط بچھائی گئی تھی بیوی کے جہیز میں آیا ہے۔ اتوار کے اتوار نہاری بھی وہیں سے آتی ہے۔ دہلی کے بعض بڑے سوداگروں کے نام ان کے کاروبار کی نسبت سے معروف ہیں۔ مثلاً سوت والا، پالکی والا، بالٹی والا وغیرہ۔ مسز نعیم کے دادا جان "نہاری والا" تھے۔ نہاری ان کے خاندان میں مہارت سے زیادہ

وجاہت کی علامت بن چکی تھی۔

احباب میں نسیم نقشبندی، فاروق حمیری، (معروف شاعر) سید عطا حسین کلیم اور سعید صاحب (روزنامہ پاکستان ٹائمز کے سابق ایڈیٹر) کے علاوہ چتلی قبر سے آئے ہوئے چند مقامی اصحاب بھی موجود تھے۔ ہم پہنچے تو سب لوگ نہاری کھا کھا کر چٹائیوں پر تقریباً نڈھال پڑے تھے۔ ہماری آمد پر (مشاعروں کی طرح) نہاری کا دوسرا دور ہوا۔ عطا حسین کلیم اور سعید صاحب اس دور میں اپنے زعفرانی لطیفوں سے ہماری ہمت بڑھاتے رہے۔ نعیم کا خلوص اور نہاری کا ذائقہ، مدت تک ہماری زندگی اور ذہن میں پھیلا رہے گا۔ (دہلی۔ ۲۵ مارچ ۱۹۷۵ء)

بکری کی آواز

گاؤں سے کوئی ناموافق خبر آئے تو دل میں بڑی تیز ہوائیں چلنے لگتی ہیں۔ بڑے شہروں میں کچھ بھی ہو جائے، کان پر جوں تک نہیں رینگتی۔ دہلی کے اخبار کیسے کیسے جرائم سے نہیں بھرے ہوتے۔ ابھی پرسوں چاوڑی میں چھ آدمی مجرا سنتے سنتے ڈھیر کر دیئے گئے۔ اسی لئے غالب نے مے و نغمہ کو ہوش ربا کہا ہے۔ حالانکہ خود......



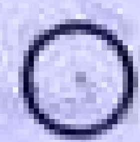
گاؤں کی ناگوار خبر شائد اس لئے زیادہ تکلیف دہ ہوتی ہے کہ گاؤں میں اپنائیت زیادہ ہے۔ گاؤں کی خبر سیدھی آپ کی طرف آتی ہے۔ آپ اس سے براہِ راست متاثر ہوتے ہیں۔ تازہ خبر ہماری طرف سیدھی ہی نہیں آئی، بلکہ تیر کی طرح لگی بھی ہے۔ اس خبر سے معلوم ہوتا ہے کہ اب ہمارے گاؤں سے موٹی موٹی خبریں بھی آسکتی ہیں۔ ورنہ اس سے پہلے یہی خبر علاقے کی بڑی خبر ہوتی تھی کہ فلاں کا

بیل چوری ہوگیا، فلاں کی گھوڑی کھل گئی۔ اب کے یہ خبر آئی ہے کہ ہمارے گھر میں چوری ہوگئی۔ فصل کے موسم میں ہمارے مکان کے دو طرف گیہوں یا باجرے کی فصل لہلہاتی رہتی ہے۔ چور کھیت کی طرف سے آئے، نقب لگائی، ظروف اور پارچات کی صورت میں جو کچھ اٹھا سکتے اٹھا کر لے گئے۔



گھر کے سب لوگ ایک شادی میں میرپور گئے ہوئے تھے۔ یوں بھی جب سے قبلہ والد صاحب کا انتقال ہوا ہے، ہمارے گھر میں کوئی ایسا آدمی نہیں رہ گیا جو شام سے لے کر صبح تک اٹوٹ نیند نہ سوتا ہو۔ حضرت سید کالے شاہ گھر پر موجود تھے، مگر ان کا عجب معاملہ ہے۔ بھاری روغنی "شام منڈھا سوٹا" ہر وقت ساتھ رکھتے ہیں۔ رات کو سوتے ہیں تو "سوٹے" کو بھی چارپائی پر ساتھ سلاتے ہیں۔ مویشی خانے پر بکری بھی ممیائے تو ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھتے ہیں جب تک بکری کو جاکر دیکھ نہیں لیتے دوبارہ ان کی آنکھ نہیں لگتی، مگر بکری کے علاوہ کوئی آواز ان کو نہیں جگا سکتی۔ خواہ اونٹ بلبلاتا رہے۔ چور دیوار توڑتے رہے، اطمینان سے خانہ تلاشی کرتے رہے۔ مثل مشہور ہے کہ گھر میں رکھے برتن بھی آپس میں ٹکرا جاتے ہیں۔ برتن ضرور جھنجھنائے ہوں گے۔ ہمارے علاقے کے چور اتنے ماہر کہاں کہ برتنوں کو جھنجھنانے بھی نہ دیں۔ مگر حضرت سید کالے شاہ صحن میں لمبی تانے سوئے رہے۔ ع

ان کی بلا سے بوم بسے یا ہما رہے



بھائیا سید سید کریم شاہ ہیڈ ماسٹر پرائمری سکول ساگری (ضلع جہلم) نے اطلاعی خط بھی اپنی شوخ طبیعت کے مطابق گدگداتا ہوا لکھا ہے۔ لکھتے ہیں: نقصان تو جو ہوا سو ہوا۔ دھڑکا اس بات کا ہے کہ چوروں نے گھر دیکھ لیا۔ علاقے میں

رسوائی الگ۔ لوگ کہہ رہے ہیں کہ لو "احمد شاہیوں" کے بھی چوری ہوگئی۔ مبکی یوں اچھی ہوئی کہ گھر سے نہ کوئی نقدی نکلی نہ روپیہ سونا۔ اب اگر چور پکڑے نہ گئے یا چوری برآمد نہ ہوئی تو بڑی تھڑتھڑی ہوگی۔ تھانہ (دینہ) اترا ہوا ہے۔ عملے کا کھانا الگ، تھانیدار کی گھوڑی کا دانہ الگ۔ سفید پوشانِ علاقہ کی ٹہل سیوا الگ۔ تین سو روپے بذریعہ تار بھجوا دیں۔

مشاعرے میں سامعین سے زیادہ ناظرین تھے

بیس دن کی چھٹی کاٹ کر دہلی واپس پہنچا۔

ع پھر وہی کنجِ قفس پھر وہی صیاد کا گھر

سفر مسلسل رہا۔ جہلم، گجرات، راولپنڈی اور ریاست جموں وکشمیر کے اندر وہ علاقہ جو "اندر ہل" کے نام سے موسوم ہے، گھوم آیا۔ شہروں کے بجائے زیادہ وقت دیہات کے رستوں میں گزارا، جو گیہوں کی پکی ہوئی فصلوں سے سنہرے ہو رہے تھے۔ ان مناظر کے سحر میں کھو رہنے کو جی چاہتا تھا، کیوں نہ چاہتا ع

ہوں اگر شہروں سے بن پیارے تو شہر اچھے کہ بن



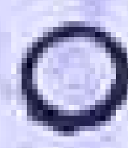
سفر کا حاصل، رئیس الاحرار اور رئیس المتغزلین مولانا سید فضل الحسن حسرت موہانی کی زیارت تھی۔ سوچتا ہوں کہ بخت نے کہاں اور کیسے یاوری کی۔ مولانا حسرت کو قریب سے دیکھنے کی حسرت ایک مدت سے دل میں کروٹیں لے رہی تھی۔ دیکھتے کیسے؟ ہم سرکار کے فدوی وہ سرکار کے باغی۔ عموماً ان کا بسیرا جیل میں رہتا ہے؟

ع کہ شاہین کے لئے ذلت ہے کارِ آشیاں بندی

ایک مرتبہ دہلی میں ان کی آمد کی خبر ملی۔ مولوی محمد سعید (سابق ایڈیٹر روزنامہ پاکستان ٹائمز)

کے ہمراہ کہ کھدر پہنتے اور مولانا ظفر علی کی طرح بولتے ہیں۔ مولانا کی خدمت میں حاضری کا پروگرام بنایا۔ مولانا سے ملنا کوئی مشکل نہ تھا۔ کوئی حاجب نہ دربان۔ فقیرِ بوریا نشین قیام عموماً کسی مسجد میں ہوتا۔ نماز بھی پڑھ لو، نیاز بھی حاصل کر لو۔ میری بدقسمتی کہ دہلی میں یہ آرزو پوری نہ ہوئی۔ کارسازِ حقیقی کی قدرتوں کے قربان جائیے کہ یہ آرزو اس سفر میں پوری ہوئی، اچانک پوری ہوئی اور وہاں پوری ہوئی۔ ؏

جہاں سے ہم کو خود اپنی خبر نہیں آتی

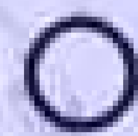


یہ یادگار ساعت راولپنڈی میں میسّر آئی۔ مزید یادگار بات یہ کہ ملاقات راولپنڈی کے دیسی معززینِ شہر مثلاً خان بہادر سردار فتح خان یا سردار بہادر سوہن سنگھ وغیرہ کی معرفت نہیں، بلکہ راولپنڈی کے انگریز ڈپٹی کمشنر مسٹر اسٹنٹن (STENTON) کے توسط سے میسّر آئی۔ بیرونِ جات سے ہم جب کبھی وطن آئے، راولپنڈی میں ربوٹھوار کے بابائے اُردو) عبدالعزیز فطرت اور یارانِ سرکل میں سے عزیز ملک اور کرم حیدری سے ملے بغیر واپسی گوارا نہ کی۔ اب کے راولپنڈی پہنچے تو اتفاقاً اگلے دن (۱۰ اپریل ۱۹۴۵ء) شہر میں تاریخی اہمیت کا ایک کُل ہند مشاعرہ برپا تھا۔ تاریخی اہمیت یوں کہ رئیس المتغزلین مولانا حسرت موہانی جو شاعروں کو کب کے چھوڑ کر جلسوں کے ہو رہے تھے، اس مشاعرے میں شمعِ شاعری کی حیثیت رکھتے تھے۔ مسٹر اسٹنٹن صوبہ جات متحدہ آگرہ اودھ کے کئی ضلعوں میں مجسٹریٹ رہ چکے تھے۔ وہ اُردو شاعری سے دلچسپی اور مولانا حسرت موہانی سے ارادت رکھتے تھے۔ اس مشاعرے کا اہتمام انہوں نے ہی کیا۔ مقصد محض مولانا کی دید۔ ہم راولپنڈی میں ٹھہر گئے۔ ہم تو معمولی سی محفلِ سخن کو بھی ذہنی من و سلویٰ سمجھتے تھے۔ اس تقریب میں تو مولانا حسرت موہانی کو قریب سے دیکھنے اور ان سے

مصافحہ کرنے اور ان کی زبان سے ان کے اشعارِ تابدار سننے کی سعادت حاصل ہو رہی تھی۔



مشاعرے کی شب امپیریل سینما کا وسیع ایوان شام ہی سے مشتاق سامعین سے کھچا کھچ بھر گیا۔ حاضرین میں ہندو اور سکھ بڑی تعداد میں موجود تھے۔ یوں بھی اس ہجوم میں سامعین سے زیادہ ناظرین تھے۔ یعنی اکثر لوگ مولانا حسرت موہانی کے درشنوں کے لئے کھچے چلے آتے تھے۔ مولانا کو مسٹر اسٹنٹن خود اسکاٹ (ESCORT) کر کے اسٹیج پر لائے۔ ہم نے اپنی زندگی میں پہلی مرتبہ کسی انگریز ڈپٹی کمشنر کو کسی دیسی شخص کی پیشی میں اردلیوں کی طرح چلتے دیکھا۔ دل خوش ہوا۔ مولانا حسرت وضع میں سادگی اور درویشی کا پیکر تھے۔ سر پر بے پھندنے کی وہی ٹوپی جو ان کی شخصیّت کا جزو بن چکی ہے۔ ہم سمجھتے تھے کہ ان کی شعر خوانی کے انداز میں بھی خطیبانہ طنطنہ ہو گا۔ خیال تھا کہ رئیس الاحرار شیر کی طرح دھاڑیں گے۔ فضا ان کی آواز کی گھن گرج سے گونج اٹھے گی۔ سچی بات یہ ہے کہ مولانا نے جب مصرع اٹھایا تو ہمارا دل بیٹھ گیا۔ بے شک ان کا شعر غزلِ بالیدگی اور چاندنی کی پھوار کی طرح ذہن پر اتر رہا تھا۔ لفظ لفظ میں ہزار معنی۔ حرف حرف میں ہزار دفتر۔ مگر مولانا کی آواز خلافِ توقع کچھ باریک سی معلوم ہوئی۔ حیرت ہوئی کہ اس آواز سے لاکھوں انسانوں کے سینوں میں جوش اور ولولے کی آگ کیونکر بیدار کر دیتے ہیں۔ شاید جلسوں میں ان کا لہجہ اور ہوتا ہو۔ غزل کے آہنگ کو سیاست کے ترنگ پر قربان نہیں کرتے۔



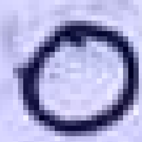
بہرحال اصل چیز آواز نہیں اعجاز ہے۔ مولانا کا اعجاز ان کا کردار تھا۔ ان کی عظمت کا سرچشمہ ان کی درویشی اور قلندری، ان کی جرأت اور بیباکی تھی۔ واقعہ یہ

ہے کہ اگر مولانا کے بجائے کوئی دوسرا شاعر ایسی باریک آواز میں شعر سناتا تو یقیناً ہُوٹ ہو جاتا، مگر اُس مردِ درویش کے رُعب کے سحر کا یہ عالم تھا کہ جیسے ایوان میں سناٹا چھا گیا ہو۔ جیسے فضا کی سانس رُک گئی ہو۔ جیسے پورا شہر حسرت موہانی کی آواز سننے کے لئے خاموش ہو گیا ہو۔

(۳۰ اپریل ۱۹۴۵ء کی ڈائری سے)

شاعر مریضوں کے نسخے

پچھلے چند دنوں سے طبیعت بوجھل بوجھل ہو رہی تھی۔ تھوڑی تھوڑی حرارت بھی۔ آج روشن نگینوی، ڈاکٹر سید ناصر عباسی کے مطب میں لے گئے۔ ان کی تعریف سن رکھی تھی کہ ادب دوست انسان ہیں۔ آج بذاتِ خود تجربہ بھی کریں۔ ہمارے علاوہ شکیل بدایوانی، ساحر ہوشیار پوری، سید محمد جعفری اور محلہ پُل بنگش کی مُسلم لائبریری کے تمام اراکین مریضوں کی قطار میں بیٹھے تھے۔ بلکہ منظر کچھ ایسا تھا جیسے ڈاکٹر صاحب خود شاعر مریضوں کے حلقے میں آ بیٹھے ہوں اور مریضوں کا علاج کرنے کی بجائے مریضوں سے شعر سُن رہے ہوں۔



دہلی میں ہماری شاعری سے کون واقف تھا۔ مگر روشن ان کے دیرینہ مریض تھے اُن کی زبانی اپنے تعارف کی وجہ سے بحیثیت شاعر ہمیں مریضوں کی صفِ اوّل میں جگہ مل گئی جہاں سید محمد جعفری کے کلماتِ خوش کی بدولت ہمارا مرتبہ مزید مستحکم ہو گیا۔ ڈاکٹر صاحب کا ایک ہاتھ شاعر کی نبض پر ہوتا اور دوسرا ہاتھ ان کی نبضِ شعر پر۔ درمیان میں جتنے ٹیلی فون آئے ان میں سے بیشتر شعراء کے تھے۔ یہیں بیٹھے بیٹھے ایک ٹیلی فون سے معلوم ہوا کہ آج کل الوالاثر حفیظ جالندھری علیل ہیں۔

شاعروں کی علالت ہی کی نہیں، شاعروں کی باہمی عداوت اور کدورت کی تازہ بہ تازہ خبریں اُن کے ہاں سُن لو۔ اُستاد حیدر دہلوی کے بعض زبان زدِ عام ہجویہ شعروں کے پس منظر سے ہمیں آگہی حاصل ہوئی۔ شعراء ہی نہیں مسلمانوں کے رفاہی اداروں کی دامے درمے خدمت بھی ڈاکٹر صاحب کا شیوہ ہے۔ دو اداروں کے مہتمم ہمارے سامنے ان سے اپنی مشکلات بیان کرتے رہے۔ مشکلات سننے کے بعد ڈاکٹر صاحب اُن حضرات کو باہر سڑک تک چھوڑنے گئے تاکہ تخلیئے میں ان کی خدمت کر سکیں۔ میرا اندازہ ہے کہ ڈاکٹر ناصر عباس روزانہ اپنے مطب کی نصف آمدنی انہی "خدمتوں" میں نذر کر دیتے ہیں۔ بعض نسخوں پر ایک ایسا نشان بنا دیتے کہ ان کا شعبۂ دواسازی اس نشان کو دیکھ کر دوا کے پیسے بھی نہیں لیتا۔ یہ نشان ہمارے نسخے پر بھی موجود تھا۔



آج کی "نشستِ مریضاں" میں زیادہ تر علاج سید محمد جعفری کے لطائف سے ہوتا رہا۔ یوں تو ہم دوا بھی لائے ہیں مگر طبیعت اس مسیحا نفس ڈاکٹر کے اخلاق اور ان کے مطب کے ادبی ماحول سے خود بخود اتنی چونک آئی ہے کہ جیسے شفا۔ دوا سے پہلے مل گئی ہو۔ لاہور میں یہ کیفیت کسی زمانے میں حکیم فقیر محمد چشتی کے مطب میں ہوتی تھی۔ یہ کیفیت ہم نے اپنی آنکھوں سے تو نہیں دیکھی۔ لیکن اس کا احوال مولانا عبدالمجید سالک (مدیر روزنامہ انقلاب) اور مولانا چراغ حسن حسرت (سندباد جہازی) کے مضامین میں بہت پڑھا ہے۔ جن شہروں کی تہذیب و تمدن کا کوئی اپنا مزاج ہوتا ہے وہاں ہر دور میں اس قسم کی شخصیتیں بھی موجود رہتی ہیں۔ شہر صرف اینٹ گارے کی عمارتوں ہی کا نام تو نہیں۔



ڈاکٹر ناصر عباس صاحب کے ہاں سے اُٹھ کر ہم لوگ شکیل کو لے کر قرول باغ میں نعیم کے "ہوا دائی" میں جا بیٹھے۔ جہاں رات گئے تک شعر خوانی کی ایک طویل نشست

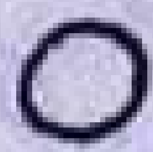
جمی رہی۔ شکیل کے ترنم کا سحر ایسا ہے کہ روح مسحور ہو جاتی ہے۔ اس کے ہاں شعر میں روایت کی پاسداری ضرورت سے زیادہ ہی سہی مگر عشق و محبت کی پُربلا واردات کا اظہار بہت پُرلطف ہوتا ہے۔

شکیل واٹر سپلائی ڈیپارٹمنٹ میں اسسٹنٹ ہیں۔ محاذِ جنگ پر طبلِ جنگ بج رہا ہے اور وار "ڈیپارٹمنٹ" میں شکیل کی غزل بج رہی ہے۔

(۲ مئی ۱۹۴۵ء)

چھ زبانوں کا ماہر

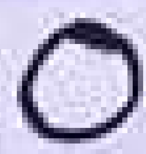
کپتان راجہ الطاف حسین کا ذکر کل ہوا تھا۔ آپ MODC کے انچارج ہیں۔ آغا رشید احمد (ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس) ان کے نائب ہیں۔ دونوں مل کر ڈیڑھ کپتان ہوئے۔ ان کا دستہ جنرل ہیڈکوارٹر کی حفاظت کرتا ہے۔ آغا صاحب، خان صاحب کا خطاب رکھتے ہیں۔ زیرک انسان ہیں۔ گفتگو کا سلیقہ خوب پایا ہے۔ اسناد فارسی شاعری سے لاتے ہیں۔ خان بہادر ہو کر رہیں گے۔ لارڈ اسمے (ISMAY) سے ٹیلیفون پر پوچھ رہے تھے کہ لندن میں اُن کے "بابا لوگ" کا کیا حال ہے۔



کیپٹن راجہ الطاف حسین غیر معمولی صلاحیتوں کے انسان ہیں۔ پنڈ دادنخان (ضلع جہلم) کے رہنے والے ہیں۔ پنڈ دادن خان خود دور افتادہ ہے۔ ان کا گاؤں مزید دور افتادہ ٹھہرا۔ تعلیم سے قطعاً گورے۔ مدرسے میں بیٹھے ہی نہیں۔ مدرسہ وہاں شاید تھا ہی نہیں۔ ۱۹۱۴ء کی جنگ میں سپاہی بھرتی ہو گئے۔ عسکریت ان کے خون میں تھی۔ بہادری کے کئی تمغے اور اسناد حاصل کیں۔ تمغوں پر ہمیں حیرت نہیں۔ حیرت اس بات پر ہے کہ پہلی جنگ سے نمٹنے تک، یہ "ان پڑھ رنگروٹ" انگریزی زبان

؂ آغا رشید احمد مرحوم سپرنٹنڈنٹ پولیس کے عہدے سے ریٹائر ہوئے۔ راولپنڈی میں کچھ عرصہ وکالت کرتے رہے بعد

ہیں ایسے مضامین لکھنے لگا کہ وہ اخبارات میں چھپتے رہے۔ عربی، فرانسیسی، اطالوی، جرمن اور ترکی زبانوں کا شناور ہو گیا۔ جس ملک میں خندق کھودی، اُس ملک کی زبان سیکھ لی۔ اس معاملے میں قدرت نے اُن کو اخذ و جذب کا عجیب ملکہ ودلیعت کر رکھا ہے۔



جنگ ختم ہونے تک "وائسرائے کمیشن" (VCO) مل چکا تھا۔ جنگ ختم ہوئی تو، انگریزی کے بل بوتے پر بنگال ناگپور ریلوے میں "سفید گریڈ" کے گارڈ ہو گئے۔ دو چار گاڑیاں اِدھر اُدھر لے گئے ہوں گے کہ بنگلہ زبان بھی فرفر بولنے لگے اور بہت جلد اس زبان میں اتنی مہارت پیدا کر لی کہ مرشد آباد کے ایک خاندان میں شادی بھی کر لی۔ دوسری جنگ عالمگیر چھڑی تو دوبارہ فوج میں آ گئے۔ آج کل کپتان ہیں ؏

کل کی خبر خدا جانے



کیپٹن الطاف حسین کا دفتر دہلی میں دیسی فوجی افسروں کا ہیڈ کوارٹر ہے۔ جو کوئی ہیڈ کوارٹر میں آتا ہے وہ اُن کے دفتر سے ہو کر گزرتا ہے۔ مجھے کرنل ناصر علی خان (پاکستان آرمی میں لیفٹیننٹ جنرل ہوئے۔ چیف آف سٹاف رہے) سے ملنا تھا۔ دو گھنٹے راجہ الطاف حسین کے پاس بلاوے کا انتظار کرنا پڑا۔ دو چار اخبار اُن کی میز پر پڑے رہتے ہیں چلائے کا دَور چلتا رہتا ہے۔ سیاسی موضوعات پر گرما گرم گفتگو ہوتی رہتی ہے۔ دفتر کیا ہے۔ ؎ راجہ صاحب نے جنرل ہیڈ کوارٹر کے سامنے "مسلم لیگ کی چوکی" قائم کر رکھی ہے۔



۲۸ر اپریل کو مسولینی کو میلان میں گولی کا نشانہ بنا دیا گیا۔ ڈوسے کی لاش ابھی تک شہر کے بڑے چوک میں نمائش کے لئے رکھی ہے کہ ؏

؎ کیپٹن راجہ الطاف حسین ریٹائرمنٹ کے بعد راولپنڈی میں مقیم رہے۔ ۱۹۸۱ء میں انتقال ہوا۔ ہفت روزہ "ہلال" میں اُن کے مضامین شائع ہوتے رہے ہیں۔ ض

دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہے

ابھی مسولینی کی لاش تازہ تھی کہ ۲ر مئی کو ہٹلر کی خودکشی کی خبر آگئی۔ دوسرے روز ڈاکٹر گوئبلز بھی ہٹلر کے نقشِ قدم پر روانہ ہوگیا۔ ہٹلر ہی نہ رہا تو اس کا دستِ راست دنیا میں رہ کر کیا کرتا۔ اٹلی میں ڈیڑھ لاکھ جرمن فوج نے ہتھیار ڈال دیئے۔ اب ہتھیار اُٹھائے رکھنے سے بھی کیا فائدہ۔ ناروے، ڈنمارک اور شمالی جرمن میں لڑائی جاری ہے۔ تا بہ کے؟ جرمنی جنگ ہار چکا۔ ۳ر مئی کو روسی دستے برلن میں داخل ہوگئے۔ ع

توبہ توبہ کس قدر ہنگامہ آرائی ہوئی

(دہلی۔ ۴ر مئی ۱۹۴۵ء)

۱۹۴۶

پردیس میں عید

سلامت پاگی ــــــ ہری رایاپوسا

میس (MESS) کا ملائی ملازم سلامتے، ملائی سے زیادہ ملائم اپنی ملائی زبان میں مجھے عید مبارک کہہ رہا تھا۔ وہ ہمارے لئے دودھ میں کڑھے ہوئے باداموں کا حریرہ بھی اپنے گھر سے بنوا لایا تھا۔ فجر کا وقت تھا۔ میں جاگ تو رہا تھا۔ مگر اٹھنا تو سلامتے کی "سلامتے پاگی" پر موقوف ہوتا تھا۔ وہ اٹھائے تو ہم اٹھیں۔ ــــــ

"تمہیں بھی ہری رایاپوسا اور ماگی" وغیرہ سلامت ہو سلامتے۔

ہم نے ٹوٹی پھوٹی ملائی میں جواب دیا۔

سلامتے بیس بائیس برس کا، سادہ، قبول صورت نوجوان تھا۔ ناخواندہ مگر انگریز افسروں کی اردل میں رہ رہ کر خاصا باخبر۔ اسی لئے پتلون پر بش شرٹ ڈالے رکھتا۔ آج سر سے پاؤں تک اپنے قومی لباس ــــــ باجو سارونگ ــــــ میں ملبوس تھا۔ اس کی چھب دیدنی تھی۔ پہلے سے قطعاً مختلف ــــــ معزز ملائی۔ جیسے انگلستان سے واپس اپنے

ملک میں واپس آگیا ہو۔

یہ ہری رایاپوسا ـــــــ عید رمضان کی صبح تھی۔ جنوب مشرق ایشیائی کمان میں آنے کے بعد ہم مسلمان فوجیوں کی ملایا میں یہ پہلی عید تھی۔ پروگرام کی تفصیلات اگلی شام ہم نے طے کر لی تھیں کہ لٹھے کی کھڑکھڑاتی شلوار اور وائل کے بانکے کرتے پر سفید شارک سکن کی شیروانی اور سر پر راجہ غضنفر علی خان کے انداز کی بلند و بالا طرّے دار پگڑی۔ اس روز محسوس ہوا کہ ہم لوگوں کے لئے جو صرف قافیہ ردیف باندھنا جانتے تھے۔ راجہ غضنفر علی کے کینڈے کی پگڑی باندھنا گویا ـــــــ لانا تھا جوئے شیر کا ہماری اپنی پگڑی ریہرسل میں سب سے کامیاب پگڑی ماشور (پاکستان آرمی کے ریٹائرڈ کرنل مسعود احمد، سابق ڈائریکٹر انٹر سروسز پبلک ریلیشنز) نے باندھی مگر جب وہ پگڑی مرشد (میجر مولانا چراغ حسن حسرت) کے سر پر رکھی گئی ۔ تو یوں لگا جیسے غلام قادر گرامی کی پگڑی حسرت صاحب کے سر پر جمادی گئی ہو۔ آخر سنگاپور کے پولیس ہیڈکوارٹرز سے ایک پنجابی تھانیدار صاحب کی خدمت اس کار خاص کے لئے حاصل کی گیئں۔ وہ رات بھر ہماری پگڑیاں باندھتے رہے۔ حالانکہ مرشد کے بقول ان کا کام پگڑی کھولنا ـــــــ پگڑی اچھالنا تھا۔ بہرحال جب ہم لوگ اپنی شیروانیوں اور پگڑیوں میں باہر نکلے تو شہر میں ہمارے دستے کی چھب کا بھی خوب خوب چرچا ہوا۔ لوگوں نے تصویریں اتاریں ـــــــ تالیاں بھی بجائیں۔

نماز عید ـــــــ سمندری "کازوے" عبور کرکے (جسے عبور کرکے جاپانیوں نے سنگاپور پر حملہ کیا تھا) ملایا کی قریبی ریاست جوہور کی سلطانی مسجد میں ادا کی یہ وسیع اور عالی شان مسجد ہسپانوی طرزِ تعمیر کا دلکش نمونہ ہے۔ ہم ہسپانیہ تو دے آئے مگر طرزِ تعمیر لے آئے۔ چھت پر بیش قیمت فانوس۔ فرش پر کمیاب قالین۔ دیوار بہ دیوار۔ نماز ریاست کے مفتی اعظم نے پڑھائی۔ جن کا منصب ہائی کورٹ کے جج کے برابر بنایا گیا جو

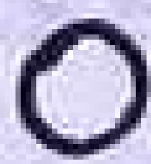
ہمارے لئے اچنبھے کی بات تھی۔ ان کے عہدے کی بلندی سے ہماری نظر میں ان کے علم کا مرتبہ بھی بڑھ گیا۔ نمازیوں کے ہجوم کا شمار نہ تھا۔ تاجدارِ ریاست سلطان سر محمد ابراہیم تو انگلستان میں، جاپانیوں کی قید کی کسل اتار رہے تھے۔ البتہ ولی عہد ــــــ مہا کوٹہ ــــــ نماز میں شامل ہوئے کس وقت آئے اور کہاں آ کر بیٹھ گئے۔ ہمیں خبر نہ ہوئی۔ نماز ختم ہوئی تو کہیں پیچھے بیٹھے پیچھے ــــــ حکام بھی دیکھے ہی دیکھے۔ شہزادہ آخری صف میں ہو تو اعیانِ سلطنت پہلی صف میں کیسے ہوتے۔ چنانچہ رعیت آگے تھی اور حکومت پیچھے ــــــ نماز کے بعد لوگ دیر تک بڑی گرمجوشی کے ساتھ شہزادے کی "سلامت پاگی" کرتے رہے۔ ہمیں مہمان سمجھ کر شہزادہ ہم سے گلے ملنے خود آگے آئے۔ نہ معلوم یہ عمل کب تک جاری رہا ہم تو شہزادے کو ان کی رعایا کے نرغے میں چھوڑ کر سنگاپور واپس آ گئے کہ دوپہر کا کھانا ــــــ نمازیوں کے قصرِ ایران میں تھا۔

جزیرے کا ایک بھرپور چکر بھی رہا۔ شائد ہی کوئی کونہ کھدرا شہر کا ہم نے چھوڑا۔ جزیرے کے زمین و آسمان بدلے بدلے نظر آئے۔ ہر طرف زندگی حسن رنگ، خوشبو کا سیلاب، چوک، چمن، شارعات، قدم قدم پر سر خوشی کا میلہ، ملائی مسلمان عیالدار زیادہ ہیں مالدار کم، مگر آج تو ہر ملائی ــــــ مالدار تھا۔ مسلمانوں کے گھروں، مسجدوں پر رنگین جھنڈیاں اور ملائی پرچم آویزاں تھے۔ ہم اپنے چند ملائی دوستوں ــــــ فلمی اداکار سید علی تیامی ــــــ جسٹس آف پیس ڈاکٹر فنشی ــــــ سرکردہ صنعت کار داود اسمٰعیل ــــــ ممتاز قانون دان مسٹر نذیر ملال ــــــ پرائمری سکول ٹیچر عبد الصامت کے ہاں بھی ہری رایا پوسا کہنے گئے۔ ہر جگہ پر تکلف اور پر خلوص ہماہمی برپا نظر آئی ــــــ لگتا تھا، جیسے پوری قوم جشنِ مسرت منا رہی ہو۔ بھرپور والہانہ جشن ــــــ سنگاپور جو رنگ روپ میں ایک چینی شہر ہے۔ آج ملائی شہر معلوم ہو رہا تھا۔

(۱۹۴۶ء)

پورے چھتیس سال پہلے

سنگاپور کے چینی آج "نوروز" منا رہے ہیں۔ آج سے ان کا نیا سال شروع ہو گیا۔ ایشیا کی اس قدیم قوم کا نہ جانے یہ کتنا ہزارواں سال ہے؟ چینیوں کے متعلق ہماری معلومات کس قدر کم ہیں۔ حالانکہ ایک آزاد ایشیا میں مجھے اندیشہ ہے کہ ہمارا سب سے زیادہ واسطہ اسی ملک اور اسی قوم سے پڑے گا۔



شہر عروسِ نو کی طرح آراستہ و پیراستہ ہے۔ ہر طرف راگ رنگ کی محفلیں جم رہی ہیں۔ گھر گھر سے سرمست گیتوں کی تانیں۔ جن کے بول ہم نہیں سمجھ سکتے۔ مگر جن کی تال پر وجد ضرور کر سکتے ہیں۔ بلند ہو رہی ہیں۔ مے خانے نوجوان مرد و زن کی مخمور، لڑکھڑاتی، ناچتی گاتی ٹولیوں سے بھرے ہوئے ہیں۔ عبادت خانے عود و عنبر کی خوشبوؤں میں بسے ہوئے ہیں۔ چاندی اور بلور کی تھالیوں میں موم بتیاں جل رہی ہیں۔ رنگ برنگ فانوس روشن ہیں۔ پجاریوں کے ٹھٹ کے ٹھٹ لگے ہیں۔ بدھ کی مورتیوں سے نئے سال کے لئے خیر و برکت مانگی جا رہی ہے۔ نیا سال، مندر اور میخانے یکساں آباد ہیں۔



آج اُن کے لباس زیادہ اُجلے ہیں۔ چہرے زیادہ تابناک اور گہری چھوٹی چھوٹی آنکھوں میں ایک عجیب روشنی لو دے رہی ہے۔ ہر چینی کے بُشرے پر ایک نئی صبح کے طلوع کا سماں چھایا ہوا ہے۔ یوں معلوم ہوتا ہے جیسے پچھلے دس بارہ سالوں کا تمام دکھ درد بھول کر یہ قوم زندگی کی نئی خوشیوں کی طرف جھپٹ رہی ہے۔ مجھے تو یہ نظر آتا ہے کہ نئے نظام میں ایشیا کی قیادت کا سہرا اسی قوم کے سر ہو گا ——— یہ ایک اُبھرتی ہوئی قوم ہے۔ پرانی اور پھر نئی بھی ——— ناقابلِ قیاس مشکلوں میں

زندہ رہنے والی ایک عظیم قوم۔

مجھے یہ دیکھ کر واقعی تعجب ہوتا ہے کہ یہ لوگ اپنے نئے سال پر کس خلوص اور جذبات کی کتنی سچی وابستگی اور سج دھج کے ساتھ خوشی منا رہے ہیں۔ اس قوم کو اپنے تہواروں سے کس قدر محبت ہے؟ آج یہ خوشی ان کے روئیں روئیں سے جھلک رہی ہے۔ اس خوشی میں سے ان کے لئے نئے عزم اور نئے ولولوں کی روشنی بھی جھانک رہی ہے۔ اُن ارادوں کا بھی سراغ مل رہا ہے جو ان کے دلوں میں کروٹیں لے رہے ہیں ـــــ ایک ایک دریچے اور منڈیر پر پھیلے ہوئے نئے اور پرانے چین کے تاروں بھرے جھنڈے بہت کچھ کہہ رہے ہیں ـــــ مجھے اکثر حیرت ہوتی تھی کہ بھوک بیماری اور نفاق کی ماری ہوئی یہ نہتی قوم ـــــ جابر و قاہر جاپانیوں کے خلاف کیونکر لڑ سکتی تھی۔ یہ حالات و حادثات کے بوجھ میں دب کر اب تک مر کیوں نہیں گئی؟ لیکن اب محسوس کرتا ہوں کہ یہ نہتی قوم تمام دنیا کا مقابلہ کر سکتی ہے۔ یہ لوگ جینے کے لئے مرنا جانتے ہیں۔ ـــــ یہ چین کبھی مر نہیں سکتا ـــــ اور ہم؟ ہمارا نیا سال؟ ہمارے تہوار؟

○

اوّل تو سال کے آنے جانے کا احساس ہی نہیں ہوتا ـــــ احساس ہو بھی تو خوشی کس بات کی، جانے والا سال اپنے دامن میں اتنے حادثے سمیٹ لاتا ہے کہ آنے والے سال کی طرف دیکھنے کی ہمت ہی نہ پڑتی۔ اور دیکھیں بھی، تو خون کے دھبوں یا آنسوؤں کی نمی کے سوا کیا نظر آئے گا۔

بات یہ ہے کہ تہوار بھی آزاد قوموں ہی کو زیب دیتے ہیں۔ غلاموں کا تہوار بھی ایک رات ہوتا ہے۔ اُداس، تاریک، غمناک۔

عیدِ آزاداں شکوہِ ملک و دیں ○ عیدِ محکوماں ہجومِ مومنیں

ہمارا سارا جوش سرد ہو گیا

عید الضحٰی کی تقریب پر گاؤں میں "فیملی ری یونین" کی تقریب برپا ہو گئی۔ ان موقعوں پر اعزہ کا دور دور سے، دو چار دن کے لئے، جمع ہونا، خالص مادی نقطہ نظر سے ممکن ہے اسراف معلوم ہو (مثلاً ہمارے صوبیدار میجر مختار حسین شاہ زیرک سے آئے ہیں) مگر اس نوع کے چھ ماہی سالانہ اجتماعات خاندانوں کے لئے اتفاق و برکت کا موجب ہوتے ہیں۔ اور دیہات میں تو ہماری نیم قبائلی زندگی میں اس قسم کے "ملن میلے" اور بھی زیادہ اہم ہیں۔ کئی شکر رنجیاں ان موقعوں پر "شکر قندیوں" میں تبدیل ہو جاتی ہیں۔

(۱۴ اکتوبر ۱۹۸۴ء)

مثنوی آکسفورڈ

کرنل سر شیر محمد خان (آف دومیلی) نے راولپنڈی کے کمشنر مسٹر انعام الرحیم کو دوپہر کے کھانے پر مدعو کر رکھا تھا۔ انعام الرحیم صاحب شاعر بھی ہیں۔ اس ناطے سے کرنل صاحب نے مولانا غلام اعظم صاحب کو (جن کو جہلم والے مقامی مولانا روم کہتے ہیں) اور مجھے بھی مدعو کر لیا۔ کوئی پندرہ، سولہ مہمان اور تھے۔ از قسم حکامِ ضلع و سابق فوجی پنشنران جیسا کہ آنریری کیپٹن راجہ فتح روز خان، شیخ علاؤ الدین (بعد میں حکومتِ پنجاب کے کسی محکمے کے سیکرٹری رہے) ویسے ہی کمشنر صاحب کے ساتھ تھے۔ حلوے کے دور کے ساتھ ساتھ شاعری کا دور بھی چلتا رہا۔ آخر میں انعام الرحیم صاحب نے ایک نظم موسومہ "مثنوی آکسفورڈ" سنائی۔ یہ ایک طویل مثنوی ہے۔ نہ معلوم ان سامعین پر کیا گزری جو محض کمشنر صاحب کو سلام کرنے آ گئے تھے۔ مسٹر انعام الرحیم،

لباس کیا، دیکھنے میں بھی انگریز معلوم ہوتے ہیں، مگر شعر پڑھتے ہیں تو لہجے سے یوں لگتا ہے جیسے لکھنؤ سے کبھی باہر ہی نہ ہوں۔

(۱۵ اکتوبر)

افراد کی مثلث

اتوار کا دن۔ طویل "سپاٹا" آدمی تنہا سیر کو نکلے تو وہ "سپاٹا" بن جاتا ہے، مگر اس لحاظ سے یہ دن بے حد دلچسپ رہا کہ تین ایک دوسرے سے قطعاً مختلف مزاج و ماحول کے شناساؤں سے ملاقات ہوئی۔ خان بہادر مہدی علی شاہ سے ملے۔ شاہ صاحب بلدیہ شملہ کے وائس چیئرمین ہوتے تھے۔ یہاں ہوٹل "مرینہ" چلا رہے ہیں۔ وہاں بھی ان کا کوئی ہوٹل ہی تھا۔ کچھ بجھے بجھے معلوم ہوئے۔ اُن کو پہلی مرتبہ گھوڑے کے بغیر دیکھا حالانکہ ہم ان کے گھوڑے کو دیکھ کر ہمیشہ سوچا کرتے کہ شاہ صاحب گھوڑے پر سوار کیوں کر ہوتے ہوں گے۔

مال روڈ پر ابوالاثر حفیظ جالندھری کی انگریز بیگم سے ملاقات ہوگئی۔ حفیظ صاحب کے بارے میں ان کی ایک کتاب "POET SON OF INDIA" چھپ چکی ہے۔ اب ایک اور کتاب لکھ رہی ہیں۔ حفیظ صاحب کل ہی لاہور گئے ہیں۔

پوچھا "کب آئیں گے"؟ —— بولیں، گئے تو ایک دو روز کے لئے ہیں۔ لیکن اگر کوئی جلسے یا مشاعرے والے پکڑ کر لے گئے تو مجھے اس خبر کا بھی منتظر رہنا چاہیے۔ کہ میں کراچی پہنچ گیا ہوں"۔

شام —— ن۔م راشد کے ہاں گزاری "ماورا" کے مصنف کے ساتھ ایک "ماورائی شام" ایک دل پذیر شام جو بارش اور شاعری دونوں میں بھیگی رہی۔

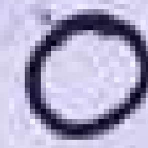
راشد کے ہاں ایک خانساماں بے کار بیٹھا تھا۔ ساٹھ روپے ماہوار تنخواہ پر انہوں نے

میرے ساتھ بھجوادیا۔ پکی عمر کے شخص ہیں۔ نام اللہ یار، دکن میں کسی افسر یار جنگ کے خانساماں تھے۔ روغن جوش ان کی خاص چیز ہے۔ راستے میں جب انہوں نے چنے کی دال کے لوازمات کی فہرست سنائی تو ہمارا جوش سرد ہو گیا

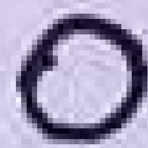
یاالٰہی خیر رکھا ہے نیا بیرا جو آج
یہ نہ سمجھے گا کبھی میری غریبی کا مزاج

شکل دیکھ کر ہنسی آتی ہے

ہم شائد جہاز "جارج جک" کو تو بھول جائیں مگر اپنے "کیبن بوائے" جارج کو کبھی نہیں بھول سکتے۔ جارج بڑی دلچسپ شخصیت کا مالک ہے۔ عمر ہے پچاس برس کا تجربے سے ستر برس کا لگتا ہے۔ عمر کے ساتھ ساتھ پھرتی بھی بڑھتی جا رہی ہے۔ پہلی جنگ ۱۹۱۴ء کا ویٹرن (VETREN) ہے۔ اس کی شخصیت کی سب سے بڑی خصوصیت اس کی مونچھیں ہیں۔ گھنی، گمبھیر، گل مچھے دار! جارج اپنی بڑی بڑی مونچھوں کے باعث، جو آج بھی آب و تاب سے لہلہا رہی ہیں، اپنے محاذِ جنگ میں "وان ہنڈن برگ" کے نام سے مشہور تھا۔ ہم بھی اس کو اسی نام سے پکارتے ہیں۔



"جارج جک" برٹش مرچنٹ نیوی کا ایک عظیم جہاز ہے۔ جنگ (۱۹۳۹ء) سے پہلے یہ جہاز شوقین اور عیاش سیاحوں کے لئے وقف تھا۔ آج کل لشکر برداری کی کھردری ڈیوٹی دے رہا ہے۔ جہاں روشن جھروکے تھے وہاں توپیں نصب ہیں۔



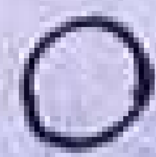
ہمیں لنگر اٹھائے چھ سات روز ہو گئے۔ رنگون پیچھے رہ گیا۔ میں اور جنجوعہ (سرگودہا کے کیپٹن احمد خان) ایک کیبن میں ہیں۔ برابر کے کیبن میں "BABY FACE" (کیپٹن اندرجیت)

اور ایک انگریز گھا گھرا پوش افسر۔ جارج گزشتہ بیس برس سے بحری جہازوں میں کیپٹن بوائے" کے طور پر کام کر رہا ہے۔ اتنا بزرگ صورت کیپٹن بوائے ہماری نظروں سے آج تک نہیں گزرا۔ ہمیں تو اسے "بوائے" کہتے ہوئے شرم آتی ہے۔

جار جک پر خدمت کرتے کرتے، جارج کو اس جہاز سے دلی پیار ہو گیا وہ جار جک کو شہزادہ جہاز کہتا ہے۔ اس کے عرشوں پر فوجیوں کے بھاری بھاری بوٹوں کی گھن گرج سن کر جارج تقریباً آبدیدہ ہو کر کہا کرتا ہے۔ "میرا پیارا جارجی ان بوٹوں کے لئے تو نہیں بنایا گیا تھا"۔

ایک روز مجھ سے کہا ! سر، آپ جس کرسی پر بیٹھے منہ میں لکڑی (دانتن) پھیر رہے ہیں، اس کرسی پر ہم سر اوک کے سفید راجے کی سنہری سیاہ چشم ملکہ کو دراز دیکھ چکے ہیں"۔

طوفانی لہروں میں جار جک کبھی ڈولنے لگتا تو جارج چلا اٹھتا ! "اے معبود! سپاہیوں کو ڈھو ڈھو کر یہ غزال بحر کیا اب اپنی چال بھی بھول گیا ہے"۔



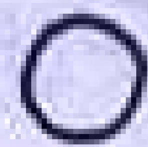
جارج جنگ کے موضوع پر اپنی دانست میں ایک سمندر واقع ہوا ہے۔ موجودہ جنگ کو وہ جنگ ہی نہیں مانتا۔ نہ موجودہ نسل کے سپاہیوں کو سپاہی گردانتا ہے۔ جدید جنگ پر اس کا بنیادی اعتراض یہ ہے۔ جنگ کا رومان اس کے بقول محاذ کے مورچوں اور سپاہیوں کی مونچھوں سے وابستہ تھا۔ سپاہی کی مونچھ اس کے نزدیک، سپاہی کی (EQUIPMENT) اسلحہ ہتھیار سے کم اہم نہیں۔ مورچوں کی لڑائی کے "رومان" پر جارج کے لیکچروں کا لب لباب ذیل کے الفاظ میں سمویا جا سکتا ہے۔

"ہم فرانس میں ایک برس سے اوپر مورچوں میں پڑے رہے ہے۔ اُدھر جرمن، اِدھر ہم۔ بیچ کی مسافت کہیں دو فرلانگ کہیں تین فرلانگ۔ ہم ان کی نظر میں، وہ

ہماری نگاہ ہیں۔ ہم ایک دوسرے کے چہرے ہی نہیں، نام بھی پہچانتے تھے جرمن مجھے، میری مونچھوں کی نسبت سے وان ہنڈن برگ کہتے تھے۔ جھڑپ ہو جاتی تو زخمیوں کا تبادلہ ہو جاتا۔ کرسمس آتا، تو پھولوں کا تبادلہ ہو جاتا۔ مورچے ہمارے لئے گھر کی مثل ہو گئے تھے۔ جنگ ختم نہ ہوتی۔ تو ہم شاید آج بھی وہیں پڑے ہوتے۔ مائی ڈیئر سر! ہوائی جہاز اور ٹینک کی جنگ کا وہ گلابی پن کہاں؟"



مونچھ کے معاملے میں جارج۔ مونچھ کی ساخت سے زیادہ، مونچھ کی پرداخت کا قائل تھا۔ تزئین کم تعظیم زیادہ۔ اس موضوع پر جارج کی مؤثر اور مسلسل گفتگو سُن سُن کر "بے بی فیس" نے مونچھ رکھ لی ہے۔ اس کی شکل دیکھ کر ہنسی آتی ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے کسی گل چہرہ عورت نے مونچھیں لگالی ہوں۔ (بھارتی فوج میں لیفٹیننٹ جنرل ہوئے)



اس سفر کے چند برس بعد جنجوعہ سے پاکستان میں ملاقات ہوئی۔ وہ ملٹری پولیس سنٹر میں لیفٹیننٹ کرنل تھے۔ ان کے چہرے پر مونچھیں لہلہا رہی تھیں۔ جن کو دیکھ کر مجھے بے اختیار جارجک جہاز کا بوڑھا کیبن بوائے۔ جارج۔ المعروف مارشل وان ہنڈن برگ یاد آ گیا۔

(جنوری ۱۹۴۷ء کا ایک سمندری سفر)

سنہ ۱۹۶۸ء

پروفیسر شوکت واسطی

ایبٹ آباد چھوٹا سا شہر ہے آپ لاکھ کوشش کریں کہ جلال بابا (خان بہادر جلال الدین جنہوں نے وفاقی وزیر بن کر رکشا پر جھنڈا لگانے کے لئے شہرت حاصل کی) یا خان فقیرا خان جدون سے آپ کی ملاقات نہ ہونے پائے، مگر کسی نہ کسی مقام پر ان سے آمنا سامنا ہو کر رہتا۔

ہمیں اس کا یہ فائدہ ہوا کہ دو تین روز میں ایبٹ آباد، مانسہرہ اور حویلیاں کے معروف آدمیوں سے سڑک پر ملاقات ہو گئی۔ کسی کو ہم نے پہچان لیا، کسی نے ہمیں پہچان لیا۔ پروفیسر شوکت واسطی پہلے ہی دن مل گئے۔ ان سے راولپنڈی میں ایوب محسن کے ہاں ملاقات رہتی تھی۔ ہم ان کی یار باشی، خوش گفتاری، خوئے دلداری، شاعری میں ان کی سانولی سلونی رومانیت اور ان کی شعر خوانی کے مستانہ انداز کے بہت قائل تھے۔ وہ ان دنوں مقامی گورنمنٹ کالج میں لیکچرر ہیں۔ اردو کے نامور شاعر پروفیسر محسن احسان ان دنوں تازہ تازہ میٹرک پاس کر کے شہر کی گلیوں میں جوالا بن کر گھومتے ہیں۔ ادبی ہنگاموں میں وہ شوکت واسطی کے دست راست ہیں۔ ان لوگوں سے مل کر ایبٹ آباد اور زیادہ شاداب ہو گیا۔ ہم دونوں کو مشاعروں کے انعقاد سے دلچسپی ہے۔ شوکت واسطی تو اس ضمن میں صوبہ سرحد کے ہر دلعزیز ناظرت ہیں۔ ان کی مہارت کا یہ حال ہے کہ وہ ایک ہفتے کے نوٹس پر بالاکوٹ کی بالائی چوٹی پر کل پاکستان مشاعرہ سجا دیں۔ پہلی ہی ملاقات میں مشاعرے کا منصوبہ بن گیا۔ جنرل نذیر کو صدارت پر آمادہ کرنا میرے سپرد ہوا۔ طے ہوا کہ مشاعرے

کے ذریعے کشمیر فنڈ کے لئے دس ہزار روپے کی تھیلی قائد ملت چوہدری غلام عباس کی خدمت میں پیش کی جائے۔

جنرل نذیر احمد

میجر جنرل نذیر احمد (جی او سی) بڑی جاندار شخصیت کے مالک ہیں۔ چھ فٹ سے نکلتا ہوا قد۔ گٹھا ہوا جسم، کوہستانِ نمک کی پیداوار، اس کی چٹانوں کی طرح مضبوط اور نمک کی طرح خوش ذائقہ۔ بیک وقت آسان بھی اور مشکل بھی۔ آسان یوں کہ ان سے ملنا آسان ہے۔ مشکل بھی یہی تھی کہ ان سے ملنا آسان ہے۔ "جی او سی" کے دفتر پر کھلی کچہری کا گمان ہوتا ہے۔ مشفق انسان، بارعب سپاہی۔ ہم جب ملنے گئے "کافی" ضرور پینے کو ملی۔

جنرل اسٹاف کے افسروں کے بقول جنرل نذیر کی مشکل یہ تھی کہ وہ کتاب کے مطابق نہیں لڑتے۔ کوئی "پینترا" اگر کتاب کے مطابق باندھ بھی لیتے تو بہت جلد کتاب سے باہر نکل جاتے۔ ہم ان معاملات میں نہ مسٹر نہ مولانا البتہ "جی او سی" کی گفتگو سے یہ تاثر ضرور ملتا کہ جس قسم کی جنگ وہ لڑ رہے تھے اس قسم کی جنگ، اشارت کیا، عبارت کیا ——— اس سے پہلے کبھی نہیں لڑی گئی۔ خچر اور ٹینک کی عادات میں زمین و آسمان کا فاصلہ تھا۔

میرا شعبہ پبلسٹی کا ہے۔ پہلی ملاقات میں مجھے ہدایت کی گئی کہ خبروں میں "جی او سی" حد سے نکلنے نہ پائے۔ یعنی ان کے پروجیکشن میں انتہائی اعتدال سے کام لیا جائے، کوشش کی جائے کہ لڑائی کا تو دنیا کو علم ہو جائے مگر یہ معلوم نہ ہو کہ کون لڑ رہا ہے؟ اول اول خبر کا ڈرافٹ ضرور دیکھتے۔ بعد میں ٹیلیفون پر سن لیتے۔ جب سے اعتماد ہو گیا ہے صرف لبِ لباب سُن لیتے ہیں۔ ڈرافٹ میں قطع بُرید کم کرتے ہیں۔ توپوں کے "ملی میٹر" کا بہت خیال رکھتے ہیں۔ ایک مرتبہ میری غلطی پر میٹر کی رقم درست کرتے ہوئے بولے۔ "تمہاری خبر میں تو گولہ اڑی کے نالے میں گر رہا تھا، اب خاص اڑی شہر پر بلکہ ہندوستان

کی کماؤں رجمنٹ کے مورچوں پہ گرے گا"

میں نے مشاعرے کی صدارت کا ذکر کیا تو بھڑک اٹھے۔ جو کچھ کہا، اس کو اب لب لباب غالب کے مصرع میں یوں کہہ سکتے ہیں

میں کہاں اور یہ وبال کہاں ؟

مگر جب میں نے کہا سر آپ تو ساری لڑائی اردو بلکہ پنجابی میں لڑ رہے ہیں تو اپنی قومی زبان کی کھلی سرپرستی میں بھی حصّہ لیجئے۔ تو صدارت کی حامی بھرلی۔ مگر کہا "وہ بھی مشاعرہ "گل و بلبل" والا نہ ہو" تیز ترک گامزن" والا ہو۔"

جنرل صاحب کے عتاب کا رُخ عموماً کرنل ہیکے کی طرف رہتا۔ اس کو بر سرِ عام جھاڑ پلا دیتے۔ ہمیں اس پہ ترس بھی آتا۔ مگر ایک انگریز افسر کو کسی دیسی افسر کے سامنے سراسیمہ دیکھ کر خوشی بھی ہوتی ؟

جنگی قیدی

دوسری جنگِ عالمگیر میں اطالوی اور جاپانی جنگی قیدیوں کو دیکھنے کے بعد دو تازہ جنگی قیدی دیکھنے کا موقع ملا۔ پانڈو کے مورچے سے کچھ قیدی مجاہدین کے ہاتھ پڑ گئے تھے ان میں سے دو قیدیوں کے ہماری بات چیت بھی ہو گئی۔ بیس بائیس برس کے چھوکرے، دونوں کا تعلق نمبر ۲ بہار رجمنٹ سے تھا جو پانڈو سے بھاگ نکلی۔ سلوک تو ان سے اچھا کیا جا رہا ہے مگر اس کے باوجود ان کے چہرے پہ ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ سپاہی پر یہ مرحلہ بہت نازک ہوتا ہے۔ بات کم کرتے، بولتے تو اکثر اپنے افسروں کی نندیا کرتے۔

جتنی دیر ان کے پاس رہا مجھے سنگاپور میں کیپٹن (اب ریٹائرڈ کرنل) مسعود احمد (سابق ڈائریکٹر انٹر سروسز پبلک ریلیشنز) کا بوڑھا بہاری اردلی رگھو بار بار یاد آتا رہا۔ جس کے بھولے بھالے لطائف اور بدحواسیوں سے میس کا ماحول تابدار رہتا تھا۔ ان میں

ایک قیدی کی تو کچھ شکل بھی رگھو سے ملتی تھی۔ لگتا جیسے رگھو ہی قید ہو کر میرے سامنے آ بیٹھا ہو۔

ولی کی وصیّت

میں اور ڈی کیو میجر بشیر آزاد کشمیر کا دورہ کرتے کرتے کھڑی شریف میں حضرت پیرے شاہ غازی قلندرؒ کی درگاہ پر حاضری دے آئے۔ پنجابی زبان میں غیر فانی مثنوی "سیف الملوک" کے خالق حضرت میاں محمد بخشؒ کا مزار بھی اسی چار دیواری کے اندر ہے۔ میرا آبائی گاؤں یہاں سے کچھ دُور نہیں۔ مجھے یاد ہے کہ گاؤں کے بچے اکثر بھیڑ بکریوں کا تعاقب کرتے کرتے درگاہ کے گنجان پیڑوں کی چھاؤں میں جا بیٹھتے۔ اس زمانے کے بعد مجھے اب اس درگاہ پر شعوری حاضری کی سعادت ملی۔

حضرت کی سیرت سے متعلق ایک واقعہ بیان کیا جاتا ہے کہ آپ کھڑی شریف کے علاوہ کبھی کبھی دینہ کے قریب شہر جہلم کی طرف جرنیلی سڑک پر واقع موضع "بوڑا جنگل" میں بھی قیام فرمایا کرتے۔ مرض الموت طاری ہوا تو اپنے خلفاء سے ارشاد فرمایا ــــ "اگر تم پلاؤ قلیہ کھانا چاہتے ہو تو مجھے بوڑا جنگل میں دفن کرنا اور اگر دال کھانا چاہتے ہو تو کھڑی شریف میں۔" شاید اسی لئے کھڑی شریف کے لنگر میں آج بھی دال دی جاتی ہے۔

پیدا بھی ہوا اور مر بھی گیا

میں اپنے پرانے کاغذات اکثر "پھرولتا" رہتا ہوں کہ

راتیں ہیں ان میں بند ہمارے شباب کی

ایک پلندہ ان میں گورنمنٹ کالج لاہور کے خوب رو اور خوب سخن نوجوان شاعر میرے پیارے دوست مبارک مسعود کے خطوط اور غزلوں کا بھی ہے۔ ان کا انتقال ۱۹۴۳ء میں ہوا۔ ہائے وہ شعلۂ مستعجل۔ اس کی تحریروں پر جب کبھی نگاہ پڑتی ہے۔ اکبر الہ آبادی

کا یہ شعر ذہن میں سرسرانے لگتا ہے

پروانہ کا حال اس محفل میں ہے قابلِ رشک اے اہلِ نظر
اک رات ہی میں پیدا بھی ہوا عاشق بھی ہوا اور مر بھی گیا

مجاہد لشکر

اللہ اکبر۔ کیا منظر تھا ...... مجاہدین کا کنوائے لاریوں اور ٹرکوں میں محاذِ اڑی کی طرف اڑا چلا جا رہا تھا۔ پرانی اور نئی، چھوٹی اور بڑی بھانت بھانت کی گاڑیاں، جتنے آدمی اندر بھرے ہوئے اتنے باہر لٹکے ہوئے، چھت پر بیٹھے ہوئے۔ جوان بھی، بوڑھے بھی۔ لباس میلے میلے، چہرے اُجلے اُجلے۔ رفلیں بھی لہرا رہی ہیں، سفید داڑھیاں بھی اور سب سے اوپر پاکستان کا سبز پرچم بھی۔ رفل سے لے کر عام گاجر مولی کاٹنے والی چھری تک قسم قسم کے ہتھیار۔ بہتیرے خالی ہاتھ۔ کوئی پوچھتا

"خان خالی ہاتھ کیوں آ گئے"

جواب ملتا۔

"رفل بارود دشمن سے چھین لے گا"

۲۹، اکتوبر ۱۹۴۷ء کو موجودہ جنگِ کشمیر کا نقطۂ آغاز سمجھنا چاہیے۔ تین روز قبل مہاراجہ ہری سنگھ نے ہندوستان سے کشمیر کا الحاق کیا اور اسی روز ہندوستانی فوج طیاروں سے سری نگر میں اترنے لگ گئی اور اسی روز پونچھ اور نیلم وادی میں جہاد کی اذان گونج اٹھی۔ طوفان روز بروز بڑھ رہا ہے۔

مظفرآباد میں اچانک شیخ صاحب سے ملاقات ہو گئی۔ سانحات نے ان کو چند مہینوں میں بوڑھا کر دیا۔ یہ میرے عزیز دوست (معروف شاعر) غلام علی بلبل کے دوستوں میں سے ہیں بارہ مولا کے رہنے والے تھے۔

"بارہ مولا"، دہلی کی طرح کئی بار اُجڑا۔ میجر خورشید انور کا لشکر آیا تو مہاراجہ کی فوجوں نے انخلاء سے پہلے شہر کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ پھر قبائلیوں کی پسپائی میں اتھل پتھل ہوئی اور پھر اوپر سے ہندوستانی طیاروں کے راکٹوں کی مسلسل بارش نے تو جو طوفان خس و خاشاک اٹھایا، الٰہی توبہ!

۲۶ اکتوبر سے لے کر بارہ مولا پر جو کچھ گزری شیخ صاحب سے یہ المناک روداد سن کر جسم کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

آہ یہ قوم نجیب و چرب دست و تر دماغ
ہے کہاں روزِ مکافات اے خدائے دیر گیر؟

انگریز کا مبالغہ

حاکم کی حیثیت سے انگریز جیسا بھی رہا ہو اس جیسا ماتحت ملنا آسان نہیں۔ کرنل میکے سے ہمیں توقع رہتی کہ وہ کبھی (شراب کے نشے ہی میں سہی) جنرل نذیر کے خلاف کچھ شعلہ افشانی کریں گے مگر یہ آرزو خاک شدہ ہی رہی۔ کرنل میکے نے جب بھی ہمارے سامنے جنرل کی بات کی خوبی کے پیرائے ہی میں کی۔ اس کے نزدیک جنرل نذیر اپنی ترائی میں ایک چھوٹا سا جنرل نیٹرنگ تھا، وہ اپنی لڑائی اپنی منصوبہ بندی کے تحت لڑتا۔ وہ ان جرنیلوں میں تھا جو اوپر والوں کے قابو میں نہیں آتے اور نیچے والوں کو قابو سے نکلنے نہیں دیتے اور جب میدان میں اتریں تو اپنی ذہنی اور جسمانی توانائی کا ایک "اونس" تک بچا کر نہیں رکھتے وہ عام کوٹ پتلون میں بھی جرنیل معلوم ہوتا ہے (جنرل نیٹرنگ کا نام پہلی مرتبہ سُنا۔ وہ جرمن افریقہ کور میں جنرل رومیل کا جانشین تھا)

لارڈ بائرن کپتان کی وردی میں

کیپٹن ریاض شمیم (اب میجر جنرل کے رینک سے ریٹائر ہوئے) کی پلٹن ۱۲ فرنٹیئر

فورس رائفلز) محاذ پر "رستم" کہلاتی ہے اور چکوٹھی کے نواح میں مورچہ بند ہے (بعد میں فرنٹیئر فورس رائفلز اور فرنٹیئر فورس رجمنٹ دونوں کو ایک نام کی (رجمنٹ) میں اس طرح ضم کر دیا گیا —— تاکس نہ گوید بعد ازیں من دیگرم تو دیگری)

میں ریاض شمیم سے بات کرنے کے لئے بے چین تھا۔

سنگاپور میں ہم لوگوں نے زندگی کے دو ڈھائی برس ایک ساتھ تل تل کر اور کھل کھل کر ہنستے گذارے تھے۔ ریاض ریکیی احمد علی۔ ایک، جاوید لوٹی، مسعود ماشو، ہنا ورہنی —— عسکری انعام مانا۔ حسرت، مرشد اور جعفری جن کافری —— ہم قدم۔ ہم چشم۔ ہم نوالہ۔ ہم پیالہ —— ریکیی، ایک خوش وقت، خوش گفتار، خوش پوش، خوش رو —— ہمہ چست، ہمہ درست، دس بارہ سوٹ، دس بارہ بوٹ والا ایک مربوط وطرحدار کپتان تھا۔ بقول مرشد جیسے لارڈ بائرن اپنی اٹھتی جوانی میں کپتان کی وردی پہن کر آگیا ہو۔ انگریز افسروں سے انگریزی میں لڑتے ہوئے ہم نے اسے بہت دیکھا تھا مگر اب اپنی جنگ میں بھی تو اس کے تیور دیکھنے تھے۔ ادھر "رستم" کی لائن کسی رستم ہی کو مل سکتی تھی۔ لڑائی جب پانڈو میں ٹھنڈی ہوئی تو چکوٹھی میں گرم ہو گئی۔ ٹیلیفون لائن کو بڑے امام —— مارخور —— کبوتر اور ٹٹو (یہ مختلف سطح کے کمانڈروں اور سٹاف افسروں کے ہنگامی تخلص تھے) الجھائے رکھتے۔ آج تو ہیں خاموش تھیں۔ سوچا شاید ریاض بول پڑیں۔ خوش قسمتی سے لائن مل گئی۔ کوئی بولا۔ "میجر اسلم"

گریٹ مغل آف سنگاپور

فوج میں اسلم اور محمد خان قدم قدم پر ملتے ہیں۔ مگر یہ تو ہمارا جانِ جگر، وہی گریٹ مغل آف سنگاپور (THE GREAT MUGHAL OF SINGAPOUR) تھا۔ ۱۹۴۵ء میں جب اتحادیوں نے ملایا پر دوبارہ قبضہ کیا تو موصوف کو سنگاپور کا "والد ماجد یعنی ایڈم کام" بنا دیا گیا۔ روٹی، کپڑا، مکان، کوئی چیز ان کے پرمٹ

کے بغیر نہ مل سکتی۔ ہمارے کرنل ٹوبن صاحب بڑے کلاسیکی انگریز تھے۔ پہلی جنگ میں لنگڑے اور دوسری میں سی آئی ای (C.I.E.) ہوئے ـــــ جنوری کے جنوری بکنگھم پیلس لندن سے ان کے نام "نیک تمناؤں" کا چھپا ہوا خط آتا۔ مگر وہسکی کی بوتل کا پرمٹ لینے کے لئے کرنل ٹوبن سی آئی ای کو بھی میجر اسلم کے دفتر کے سامنے قطار میں کھڑا ہونا پڑتا اور سچ یہ ہے کہ انگریز افسروں کو ایک دیسی افسر کے سامنے بے چون وچرا قطار میں لگا دیکھ کر دل باغ باغ ہو جاتا۔ کسی منہ پھٹ انگریز کے ہاتھوں اگر کبھی ہماری "خودی" مرجھانے لگتی تو ہم خودی کو بلند کرنے کے لئے "گریٹ مغل" کے ایوان میں جا بیٹھتے..... بس جا بیٹھتے..... اور بس بیٹھے رہتے۔ ع خط لکھیں گے گرچہ مطلب کچھ نہ ہو

مطلب بھی بہت کچھ ہوتا...... موتی چور، کنوار گندل ولایتی دیکائیوں کی بنائی ہوئی کوفی پینے کا لطف...... کوفی پینے سے کہیں زیادہ ان کے آبگینہ رنگ ہاتھوں سے پیالیاں تھامنے کا ابریشمی "لمس" ـــــ وہ اجنبی لمس جو دل وجاں میں چراغاں کر دیتا ...... جب وہ گلدانوں میں اور یورپ کے جزیروں کے رنگا رنگ طلسمی پھول سجانے لگتیں تو ہم پہروں ان کے پھول سے چہروں کی طرف تکتے رہتے۔

دفتر سے باہر طنطنہ بھی کچھ کم خمار آفریں نہ تھا۔ ملک ملک کے گورے فوجی "کیو" میں کھڑے رہتے اور ہم کھٹ کھٹاتے دندناتے گزر جاتے۔ کوئی واقف کار گورا نظر پڑتا تو ٹھکا کر اسے آنکھ مارتے یا منہ کی سیٹی میں "چھپی اور لچھی" گاتے بجاتے فاتحانہ گزر جاتے۔ حاکمانِ وقت کی دو رویہ قطاروں کے درمیان میں سے اس سرکشادگی کے ساتھ گزرتے ہوئے یوں محسوس ہوتا جیسے پوری "برٹش کامن ویلتھ" ہمارے قدموں پر جھک گئی ہو اور ہم مارے سرخوشی کے اپنے حلقۂ جسم سے نکلے جا رہے ہوں ـــــ لینا کہ چلائیں!

اس وقت اگر ہم سنگاپور میں ہوتے تو میجر اسلم "ہیلی کا پٹر" بھیج کر ہمیں منگوا لیتے۔ مگر ہم کھاٹی میں تھے اور وہ چکوٹھی میں۔ ریاض شمیم کے بارے میں معلوم ہوا کہ وہ

اپنی کمپنی لے کر دُور ایک ایسی ٹیکری پر بیٹھے ہیں کہ تین دن سے ان کو راشن بھی نہیں پہنچ سکا۔ آج وہ ایک ایسے مشن پر نکلے ہوئے ہیں کہ اگر زندہ واپس آ گئے تو کل صبح تک آئیں گے اپنی ٹیکری پر۔

"اگلی صبح تو ہم انشاءاللہ پانڈو میں ہوں گے"

تو ہم تمہیں شیر بہادر کے پاس پکڑ لیں گے (لیفٹیننٹ کرنل ملک شیر بہادر جو پانڈو پر یلغار کرنے والی بلوچ پلٹن کی قیادت کر رہے تھے۔ آپ میجر جنرل کے رینک سے ریٹائر ہوئے۔ ۱۹۶۵ء کی جنگ میں موصوف پاکستان آرمی کے چیف آف جنرل سٹاف تھے)

کمال کی باتیں

"گریٹ مغل" —— جنوب مشرقی ایشیا کی دبی ہوئی چنگاریاں سلگانے چلے تھے کہ دفعتاً کرنل کمال (بریگیڈیئر نوشیرواں) آ گئے۔

"کس سے جھگڑ رہے ہو"

"رستم کے میجر اسلم ہیں! سر!"

"خوشحال .... جوڑ .... تگڑا .... چن مینڈھا" اب کرنل کمال بات کر رہے تھے۔

"ذرا بشیر کو لائن پر لاؤ" (لیفٹیننٹ کرنل بشیر احمد ۱۳ فسٹ کے کمان افسر جی او سی میجر جنرل نذیر احمد کے چھوٹے بھائی)

کرنل کمال اپنے مخصوص دھندلے .... نیم روشن گرم شیر اسلوب میں باتیں کر رہے تھے۔

پتھر توڑ کر شیشہ نکالنے کا عمل .... جیسے رات کے وقت کسی چھوٹے سے پہاڑی ریلوے سٹیشن پر روشنیوں سے چمکتی ہوئی ریل گاڑی آ جائے۔

"بشیر! ـــــ میرے پیارے بھائی جس دن دشمن کا "طوطا" تیرے ہاتھ آگیا دشمن مورچہ چھوڑ جائے گا "طوطا" ڈھونڈ.... طوطا...... طوطا!

معلوم نہیں دوسری طرف سے کرنل بشیر کیا کہہ رہے تھے۔ بہر حال، کرنل کمال کہہ رہے تھے ـــــ "الفاظ تو داناؤں کے ہاتھ میں محض اشارے ہوتے ہیں..... لفظوں کے اپنے کوئی معنی نہیں ہوتے...... مگر یہ میکے رڈویژنل ہیڈکوارٹرز کا انگریزی نمبرا لیفٹیننٹ کرنل میکے) ان خبیث انگریزوں میں سے ہے جن کو اغوا کیا جا سکتا ہے سمجھایا نہیں جا سکتا" ـــــ بشیر!

کرنل کمال کا مکالمہ جاری تھا کہ ان کی طلسمی گفتگو ہمارے قدم روک رہی تھی مگر پانڈو کی چوٹی پر دھوپ چمک اٹھی......... یہ دھوپ ہمیں بلا رہی تھی ـــــ چوٹی ہمیں آواز دے رہی تھی!! (واگرت)

بے ربط خیالات

پانڈو سے اُترتے وقت جس طرح پاؤں اکھڑے رہے، اس طرح خیالات کے قدم بھی اکھڑے اکھڑے رہے۔

جنگ آرٹ ہے یا سائنس؟

جنگ اور سماجی عوامل؟ جنگ اور خارجہ حکمتِ عملی میں کیا رشتہ ہے؟ ـــــ کیا جنگ ایک سودا ہے کہ آپ جتنا سرمایہ لگائیں اتنا ہی منافع ہوگا؟ ـــــ پانڈو کی لڑائی نے ثابت کر دیا کہ جنگ کا فیصلہ کُن عنصر "رفتار" اور حیرت ہیں ـــــ دوسری عالمی جنگ؟ مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی۔ معلوم ہوا، امن محض نتیجہ

سے قائم نہیں ہوتا۔ "راشن" پیچھا نہیں چھوڑ رہا۔ ریل کی پٹڑیاں اور مکانوں کے کتنے جنگلے اکھاڑ کر فیکٹریوں کی بھٹیوں میں ڈال دیئے گئے؟ دوسری جنگ نے کتنے بہادر پیدا کیے؟ ساری دنیا کئی برس تک خندق میں پڑی رہی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آج کی دُنیا میں ہر شخص، دوسرے شخص سے ٹیکس وصول کرنے کے درپے ہے۔ ہر شخص دوسرے شخص کو فروخت کرنے پر تُلا ہوا ہے۔

آج کا انسان —— زندگی کو کام کرنے.... خدمت کرنے.... محبت کرنے کی مہلت نہیں سمجھتا۔ وہ ایک کارندہ بن گیا ہے، قحط کا، دیوالیہ پن کا، خود غرضی کا —— ہمارا ساتھی۔ درویش اُن لوگوں میں سے ہے، جو عرفِ عام میں "جاہل" کہلاتے ہیں۔ مَیں اُن کی باتوں سے لرز گیا۔ کتنی باتیں ہیں جو یہ "جاہل" جانتا ہے اور میں "گریجویٹ" نہیں جانتا۔ مَیں اُن کی باتوں پہ حیرت اور رشک سے چونک اُٹھا۔ کہنے لگا

"صاحب جی۔ زندگی کا ایک سبق یہ بھی ہے کہ جھوٹے اور کمینگی کے سوا کسی چیز سے نفرت نہ کرو اور بُزدلوں سے ہمیشہ ڈرتے رہو۔" اُس کا مطلب شاید یہ تھا کہ بُزدلوں سے چوکنا رہنا چاہیئے —— سپاہی پیچھے تب بھاگتا ہے، جب پیچھے کمک موجود ہو۔

لطیفے

میں خیالات کی رَو میں ڈوبا جا رہا تھا کہ عزیز الرحمٰن کو کچھ لطیفے یاد آ گئے۔

(۱)

سپاہی (ماں سے) "ماں! میں فرانسیسی عورت سے شادی کروں گا۔"

ماں: "کیوں؟ فرانسیسی عورت کے کون سا سرخاب کا پَر لگا ہوتا ہے۔"

سپاہی: "سنا ہے، فرانسیسی عورت شوہر کو دن میں تین مرتبہ کھانا دیتی ہے۔"

ماں: "مگر کھانا پکاتا کون ہے"؟

(۲)

سپاہی (محبوبہ کو کلائی کے لئے ایک طلائی زنجیر پیش کرتے ہوئے)
"میری جان! اپنے پرستار کا تحفہ قبول کرو"
محبوبہ: "شکریہ! ہائے کتنی پیاری زنجیر ہے"
جیک! سچ سچ بتاؤ، یہ تم نے کس قیدی سے چھینی ہے؟ اطالوی؟ جرمن؟ اری ٹیریا کے سادہ لوح کسان؟

جنگ ختم ہوتی ہے تو اس قسم کے لطیفے چل پڑتے ہیں۔ عزیز الرحمٰن ایسے لطیفوں کی پوٹ ہیں۔ کسی نے سچ کہا ہے کہ بہت دیر تک تھکے تھکے رہنا یا اداس اداس رہنا اچھا نہیں ہوتا۔ عزیز الرحمٰن کے لطیفے واقعی تازہ دم کر دیتے ہیں۔

ایک لطیفہ ہمیں بھی یاد آ گیا۔ لیفٹیننٹ کرنل مظفر خان (کھیوڑہ کے رہنے والے، ۱۹۴۶ء میں سنگاپور میں ایک پائنیر رجمنٹ کی کمان کرتے تھے) کا بہاری "بیٹ مین" دلیش پانڈے، ایک مرتبہ سپاہیوں کے ایک دستے کے ہمراہ سر محمد ابراہیم خان، والیٔ ریاست جوہور اور ان کی انگریز مہارانی کی دعوت پر سلطان کے عالی شان محل میں چائے پینے کے لئے گیا۔ واپسی پر سلطان اور رانی سے اپنے انٹرویو کی رُوداد بیان کرتے ہوئے اُس نے رانی صاحبہ کے بارے میں کہا:

"رانی سے زیادہ زیور تو ہمارے گاؤں کے مہاجن کی بیوی تلکو پہنتی ہے"
اور سلطان کے بارے میں:

"بے چارے کو کچھ معلوم نہ تھا کہ مجھ سے کیا کہے۔ نہ میری سمجھ میں آیا کہ میں کیا کہوں"؟

پھر کھٹائی میں

اترائی چڑھائی سے زیادہ صبر آزما تھی۔ آدمی گرا اور گیا۔ چڑھائی۔ اترائی کے بارے میں کسی اونٹ نے برمحل کہا تھا۔ " ہر دو لعنت "۔ کھٹائی پہنچے تو سورج غروب ہو رہا تھا۔ کیپٹن مجید اور اُن کے جوان زندگی کا الاؤ روشن کیے بیٹھے تھے۔ زندگی کا جواز اگر آرزو آموزی ہے تو کیپٹن مجید اور اس کے جوانوں نے ایک ایسا ماحول قائم کر رکھا ہے جس سے آدمی زمین و آسمان کی توقع کر سکتا تھا۔ گرم چائے اور گرم غسل چہ معنی!

(رباٹو کی فتح کے بعد)

دو سابق جنگی قیدی

یہ تمام علاقہ فوجیوں کا گہوارہ ہے۔ ہر دوسرا شخص فوج میں ہے یا فوج میں رہ چکا ہے۔ دادا فوج میں ۔۔۔ باپ فوج میں ۔۔۔ آپ فوج میں۔ درختوں کے گنبد میں ہم سے چار آدمی اور چند بکریاں بیٹھی تھیں۔ جہاں آدمی ہو گا وہاں بکری بھی ہو گی۔ بکریوں کے باوجود جنگل باقی ہے تو یہ فطرت کی دریا دلی ہے۔

اجنبی مسافروں میں سے دو سابق فوجی تھے۔ ایک کی داڑھی مکمل سفید، دوسرے کی آدھی سفید۔ ایک ۱۹۱۴ء کی لڑائی میں ترکی میں قید رہا، دوسرا ۱۹۳۹ء کی جنگ میں جزیرہ کریٹ میں۔ تجربات مختلف۔ بزرگ قیدی، جس کو سمرنا کا قیدی کہنا چاہیئے۔ اتنے مزے میں رہا کہ اُسے رہائی گراں گزری ہو گی۔

" اللہ پاک کے صدقے جاؤں، قید بھی ہوا تو مسلمان ملک میں "

یہ دھیر کوٹ کے علاقہ کے رہنے والے سفید ریش حوالدار میجر دیوان علی تھے۔ وہ اپنے ساتھیوں کو جس سے راستے ہی میں ملاقات ہوئی تھی، اپنی قید کی روداد سُنا رہے تھے۔

"پہلے کچھ دن تو ہم نے سب کے ساتھ گزارے مگر جب ترکوں کو پتہ چلا کہ قیدیوں میں کچھ نفری مسلمانوں کی بھی ہے تو وہ ہمیں چھانٹ کر ایک دوسرے کیمپ میں لے گئے۔ شروع شروع میں سکھوں کی ایک کمپنی بھی ہمارے کیمپ میں رہی۔ ترک پہرہ داروں نے ان کو بھی مسلمان سمجھا۔ کچھ دن وہ بھی ہمارے ساتھ خوب "دولمے" اور "سلدے" کھاتے رہے۔"

"نماز کا انتظام تو ہو گا۔" ہم میں سے کسی نے پوچھا

"انتظام؟ ایک پوری بارک مسجد کے طور پر استعمال ہوتی۔ دوہری، موٹی موٹی، نرم نرم چٹائیاں، چٹائیوں کے اوپر دری —— سٹاف کا سلوک بھائیوں جیسا۔ "باتین" کو تو میں کبھی بھول نہیں سکتا۔ جمعرات کے جمعرات گھر سے "دولمے" پکوا کر لاتا۔ اتنا مزیدار کہ انگلیاں کاٹ لے۔ ہم "باتین" کو بہاؤالدین کہا کرتے۔ کچھ عرصہ بعد جب اُن کی تُرکی اور ہماری اُردو گلے ملنے لگی تو اُس نے بتایا۔ میں اصل میں "بہاؤالدین" ہی ہوں۔"

دوسرے کی باری

ہم بڑے میاں کی باتیں سُن رہے تھے۔ سوچا اب دوسرے بزرگ کی روداد سُننی چاہیئے۔ ان کا نام امیر زمان تھا۔ "بابا امیر زمان جی۔ آپ بھی تو کچھ سنائیے۔"

"بیٹا۔ ہم ایک کیمپ سے دوسرے کیمپ میں ادلتے بدلتے، آخر اٹلی سے چھوٹے۔ یحییٰ خان (جو بعد میں کمانڈر انچیف اور صدرِ پاکستان ہوئے) اسی کیمپ میں تھے سُنا ہے آج کل جنرل ہیڈ کوارٹر میں کسی بڑے عہدے پر ہے۔ قید کی اور سب باتیں تو بھول گئیں، مگر ڈبل روٹی نہیں بھولتی۔ کم بخت پتّھر سے بھی ٹوٹنے میں نہ آتی۔"

بابا امیر زمان کے ہاتھ میں چھوٹا سا حُقّہ تھا۔ باتیں کرتے کرتے وہ ہاتھوں سے سوکھی گھاس، کُکھ کنڈے بھی اِدھر اُدھر سے جمع کرتے جاتے۔ چھوٹی سی ڈھیری اکٹھی ہو گئی تو انھوں نے جیب سے ماچس نکال کر گھاس کو آگ لگا دی۔

عزیز الرحمٰن[1] کو یہ بات بہت کھلی۔ شعلہ بلند ہوا تو وہ بھی اٹھ کھڑے ہوئے۔

"چلو اب چلنا چاہیئے۔ زمین دس لاکھ برس میں ٹھنڈی ہوئی تھی۔ بابا امیر زمان اس کو پھر گرم کر رہے ہیں۔" (جاری)

مری کی ہماہمی

چوہدری غلام عباس صاحب کو شاید ہماری قلندری پسند آگئی۔

ع وگرنہ شعر مرا کیا ہے شاعری کیا ہے

میں مظفر آباد سے سیدھا مانسہرہ کے راستے ایبٹ آباد جانا چاہتا تھا۔ فرمایا "نہیں" مری تک ساتھ رہیے۔ نتھیا گلی کی طرف سے نکل جائیے۔ راشد (ن۔م) بھی ساتھ ہیں"

عرض کیا! "ہم اپنے افسرانِ بالا کے سامنے بھی جوابدہ ہیں۔"

فرمایا۔ آخر ہم سب ایک ہی عظیم مقصد کے لئے کام کر رہے ہیں۔ ویسے میں بریگیڈیئر حاجی صاحب (ریٹائرڈ لیفٹیننٹ جنرل حاجی افتخار احمد جو اِن دنوں ٹیٹوال سیکٹر کی کمان کر رہے تھے) سے کہہ دوں گا کہ وہ آپ کے ہیڈ کوارٹر کو مطلع کر دیں کہ ضمیر آج شام تک غائب رہے گا۔

چوہدری صاحب جس وقت یہ کہہ رہے تھے اس وقت ہمارے دل میں اہمیت کے احساس سے لڈو پھوٹ رہے تھے۔ اگرچہ یہ بھی سوچ رہے تھے کہ ایبٹ آباد میں آخر۔

ع غالبِ خستہ کے بغیر کون سے کام بند ہیں

دو بجے کوہالہ پہنچے۔ اس سڑک پر دن کے وقت نقل و حرکت خالی از خطرہ نہ تھی۔ ہندوستانی طیارے کوہالہ پل پر پلے رہتے ہیں۔ شفاء الملک حکیم محمد حسن قریشی، ن، م راشد اور مَیں ایک گاڑی میں تھے۔ ہم تو خیر ان خطرات کے عادی ہو چکے تھے شفاالملک

---

[1] لیفٹیننٹ کرنل عزیز الرحمٰن۔ بریگیڈیئر سیف الرحمٰن کے چھوٹے بھائی۔

ٹکٹکی باندھے برابر آسمان کی طرف دیکھتے رہے۔ انہوں نے سرخ رومی ٹوپی پہن رکھی تھی راستہ بھر آپ نے ٹوپی اتارے رکھی کہ اس سے دشمن کے ہوا باز کو نشانہ تاکنے میں آسانی ہوگی۔ ہم نے عرض کیا۔ ہندوستانی ہوا باز نشانہ اندازی میں خام ہیں۔

حکیم صاحب بذلہ گو انسان ہیں ہنس کر بولے ــــ "ان کا نشانہ کہیں غلط ہوتے ہوتے ہی ٹھیک نہ بیٹھ جائے" ــــ راستے میں ایک مرتبہ طیارے نمودار بھی ہوئے۔ سب نے بشمول شفاء الملک گاڑیاں کھڑی کر کے چٹانوں کے پیچھے آڑ پکڑی۔ شفاء الملک بولے ــــ "یہ تجربہ خاصا دلچسپ ہے"

کوہالہ کے ڈاک بنگلہ میں کیپٹن لطیف نے دوپہر کے کھانے کا بندوبست کر رکھا تھا۔ کوئی چھ بجے شام مری میں یہ قافلہ چوہدری صاحب کی کوٹھی ــــ "کرم لناس" میں اُترا۔ وہاں چائے تیار تھی۔ "سروس" چوہدری صاحب کے بچے ہی کر رہے تھے۔ جن کی کمان بڑے بیٹے فاروق کے ہاتھ میں تھی (۱۹۷۹ء میں یہ فاروق عباس لیفٹیننٹ کرنل کی حیثیت سے کوہاٹ میں انفنٹری بٹالین کی کمان کر رہے تھے) چوہدری صاحب کے گھر کے سادہ ماحول سے آدمی بہت متاثر ہوتا ہے۔ اسی صبح کو ہم نے ہزارہا لوگوں کو ان پر نچھاور ہوتے دیکھا۔ گھر میں ایک ملازم تک نہیں۔

شام ڈھلے مری کی مال روڈ کا ایک چکر ہو گیا۔ بڑی رونق۔ بڑی گہما گہمی۔ چکوٹھی میں کیا صورت حال ہے، مری میں کیا منظر ہے؟ زندگی کا شاید یہی دستور ہے کہ اس کے کندھے پر جنازہ ہو اور ہاتھ میں ساز ــــ مال روڈ پر ڈاکٹر برکت علی قریشی (پرنسپل اسلامیہ کالج لاہور) مسٹر بشیر ہاشمی (پرنسپل ٹریننگ کالج لاہور) سے سرِ راہے ملاقات ہو گئی۔ ڈاکٹر برکت علی قریشی پُرشکوہ شخصیت کے مالک ہیں۔ میں خیال کرتا ہوں کہ انہیں اگر رات کے دو بجے بھی گھر سے نکلنا پڑے تو شفاف "شیو" کیے اور "تین ٹکڑی" (THREE PIECE) سوٹ پہنے بغیر باہر قدم نہیں دھریں گے ــــ ابوالاثر حفیظ جالندھری

بھی اپنی انگریز بیگم کے ساتھ چہل قدمی کر رہے تھے۔ ان سے انگریزی ہی میں "رٹاٹا" ہوئی۔ رات کے ایک بجے واپس پہنچا "سپرنگ ہوٹل" سویا پڑا ہے۔

(اگست - ایبٹ آباد)

جی ایچ کیو کی جھلک

کرنل ممتاز علوی (عساکر پاکستان کے پہلے ڈائریکٹر تعلقاتِ عامہ۔ بعد میں وفاقی سیکرٹری وزارتِ اطلاعات و نشریات، سیکرٹری امورِ خارجہ اور چین میں پاکستان کے سفیر کبیر ہوئے۔ فروری ۱۹۸۴ء میں انتقال ہوا۔) کے بلاوے پر دو چار دن راولپنڈی میں قیام و خرام کی مہلت مل گئی۔ محاذ کی خبروں پر مشتمل ایک اعلامیہ روزانہ جاری ہوتا ہے۔ اس کا ڈرافٹ ممتاز علوی لکھتے ہیں، پھر جنرل ہیڈ کوارٹر میں ڈائریکٹر ملٹری آپریشن بریگیڈیئر شیر خان اس کی نبض دیکھتے ہیں۔ ایک روز علوی صاحب ہمیں بھی اپنے ہمراہ لے گئے۔ بریگیڈیئر شیر خان کو ایک مرد درویش پایا۔ دفتر سادہ، خود سادہ۔ (افسوس کہ کچھ ہی عرصہ بعد اُن کا ایک ہوائی حادثے میں انتقال ہو گیا) ان کے دفتر میں کچھ وقت گزارنے پر اندازہ ہوا کہ لڑائی تو یہاں سے لڑی جا رہی تھی۔ بریگیڈیئر شیر خان جب کسی سے بات کرتے، جہاد کی روح پر زور دیتے ہوئے کہتے —— "سامان پر نہیں ایمان پر تکیہ کرو" اور اس جذبے کے ایمان پرور نظارے ہم اپنی آنکھوں سے محاذ پر دیکھ رہے ہیں کہ کس طرح جدید عسکری منصوبہ بندی کے مفروضے عزم و ایمان کے سیلاب میں گویا ایک تنکے کی طرح چکراتے نظر آتے ہیں۔ توپ خانے کے لئے پانچ گولے یومیہ کا راشن ہے۔ حکم یہ ہے کہ کوئی گولی ضائع نہ ہونے پائے۔

جنرل ہیڈ کوارٹرز میں کچھ گھومنے کا موقع بھی مل گیا۔ ہمارے جاننے والوں میں سے تو صرف میجر خادم حسین، ایڈجوٹنٹ جنرل برانچ میں تھے۔ کچھ گپ شپ اُن سے رہی۔ مگر اب وہ جنوب مشرقی ایشیائی کمان والی فراغت کہاں۔ آزادی اپنے گراں بار ذمہ داریاں بھی لاتی

ہے۔ کسی (IMMEDIATE) فائل کی وجہ سے بے چاروں کی آنکھوں میں پانی آیا ہوا تھا۔ اعلیٰ افسروں کے ناموں کی تختیوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ ڈائریکٹروں میں انگریزوں کی تعداد غالب ہے۔ اور وہ سب کے سب بریگیڈیئر ہیں۔ پاکستانی ڈائریکٹر خال خال ہیں۔ اور اُن میں سے بیشتر کرنل ہیں۔ ڈپٹی چیف آف جنرل سٹاف کے عہدے پر میجر جنرل ہٹن (HOTTON) فائز ہیں۔ تعجب ہے کہ انگریزوں سے لدے پھندے ہیڈ کوارٹر میں بیٹھ کر بھی بریگیڈیئر شیر خاں اور اُن کے رفقا کار محاذ پر جہاد کا رنگ اور روح پیدا کرنے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔ جذبے کا تقاضا یہی تھا۔

پروفیسر خواجہ دِل محمدؒ

مدّت کے بعد پروفیسر خواجہ دل محمد صاحب کی ایک نظم کسی اخبار میں نظر سے گزری۔ ایک ایک شعر میں جیسے خود خواجہ صاحب کا سراپا، اُن کی شخصیت آنکھوں کے سامنے آ گئی۔ جیسے رومی ٹوپی پہنے، گلے میں مفلر ڈالے اپنی مخصوص لَے میں انجمن حمایت الاسلام کے "جوبلی اجلاس" میں اپنی مشہور نظم پڑھ رہے ہوں ؎

یہ جبلی ہے ہماری قومِ بے سامان کی جُبلی

جن دنوں (۳۸-۱۹۳۶ء) ہم اسلامیہ کالج لاہور میں پڑھتے تھے۔ شمالی ہند کی یہ اہم درس گاہ عظیم اساتذہ کا گہوارہ تھی۔ علامہ عبداللہ یوسف علی پرنسپل تھے۔ خواجہ دِل محمد استاد تو ریاضی کے تھے اور ریاضی میں ان کی دھوم بھی چار دانگ ملک میں پھیلی ہوئی تھی۔ حتیٰ کہ ڈی۔ اے۔ وی کالج کا نامور ہندو ریاضی دان پرنسپل ہیراج بھی خواجہ صاحب کے پاؤں پکڑتا تھا۔ مگر ایک ادیب و شاعر کی حیثیت سے بھی خواجہ صاحب شاعری کا دل مانے جاتے تھے۔ طلبأ میں جتنا اُن کا "دِل الجبرا" دل کو لگتا تھا، اس طرح اُن کی شاعری روح میں اُتری ہوئی تھی۔ ساری عمر انھوں نے اسلامیہ کالج

کی خدمت میں گزار دی۔ چالیس برس تک خدمت انجام دینے کے بعد (غالباً) ۴۴ء میں سبکدوش ہوئے۔ ایک دفعہ افغانستان کی حکومت نے گراں بہا مشاہرے پر کابل بلوانا چاہا۔ آپ نے اسلامیہ کالج کی روکھی سوکھی نہ چھوڑی۔ احباب کی محفلوں میں یہ مصرع گنگنایا کرتے ع

کون کابل جائے بھائی یہ لہاری چھوڑ کر (اگست)

جنگ کا رنگ

ایک محاذ خاموش ہوتا ہے تو دوسرا بول پڑتا ہے۔ کچھ دنوں سے پانڈو نے چپ سادھ رکھی ہے تو چکوٹھی میں توپیں دنغ رہی ہیں۔ میجر شامی (۱۹۶۵ء کے شہید بریگیڈیر شامی) نہ شام کو سوتے ہیں نہ صبح کو۔ ایک وہ جنگ تھی کہ ہم جرمنوں کو سامنے دیکھ کر کترا کے گزر جاتے۔ ایک یہ جنگ ہے کہ دشمن کو ڈھونڈ کر تلاش کرتے ہیں۔ دوسرے کی جنگ اور اپنی جنگ میں کتنا فرق ہے۔ ہمارے لئے یہ زندگی اور موت کی جنگ ہے۔

عملاً یہ ایک بٹالین کے مقابلے میں ایک کمپنی (بعض اوقات ایک پلاٹون) کا مقابلہ ہے۔ بٹالین ان کی کمپنی ہماری۔ وسیع منصوبہ بندی نہ ان کی طرف نہ ہماری طرف۔ ہمیں تو اس کی مہلت ہی کہاں تھی۔ اس سال کی پہلی سہ ماہی تک پاکستانی فوج کی خاصی بڑی نفری جنوب مشرقی ایشیائی کمان کے ٹاپوؤں میں بکھری پڑی تھی۔ خود ہم لوگ میجر اے اے قاضی (میجر جنرل ہو کر ریٹائرڈ ہوئے) کی کمان میں جنوری کے وسط میں پاکستان کی مقدس زمین پر اترے۔ برطانیہ سمندروں کی ملکہ ہے، مگر ملکہ کو ہم نیاز مندوں کے لئے کوئی جہاز ہی میسّر نہیں آ رہا تھا۔ حالانکہ انگریز، میموں اور بچوں سے بھرے ہوئے "ڈیون شائر" اور "گولڈن ایرو" بر ہنستے ولایت سے چل کر سنگاپور اور ملاکہ اور پینانگ میں خالی ہو رہے تھے۔ بہرحال ع

کبھی ہم بھی تم بھی تھے آشنا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

"تجربہ" دونوں طرف برابر برابر۔ جب ملک آزاد ہوئے تو اوپر کے دو تین "رینک" (RANKS) اچانک سینئر افسروں کے کندھوں پر آن پڑے۔ (دوسری جنگ میں دیسی سینئر افسروں میں خال خال کوئی لفٹنٹ کرنل نظر آتا تھا۔ صرف محمد اکبر خان (جن کا قلمی نام رنگروٹ ہے) بریگیڈیئر کے رینک تک پہنچے تھے۔ ہمیں یاد ہے کہ کسی دیسی لیفٹنٹ کرنل کو دیکھ کر سناٹا طاری ہو جاتا تھا) اس حالت میں اکثر افسر "کندھوں" کے لحاظ سے "بریگیڈیئر" اور تجربے کے لحاظ سے کپتان یا میجر ہیں۔ یہ کوئی انوکھی بات نہیں۔ تاریخ کے بعض موڑوں پر ایسا ہوتا ہے۔ خود ہم نے ۱۹۴۵ء میں بیس اکیس برس کے ایک انڈونیشی نوجوان کو بریگیڈیئر کی یونیفارم میں دیکھا۔ انڈونیشی قوم اُن دنوں اپنی آزادی کی جنگ لڑ رہی تھی۔ وہ چالیس چالیس برس کے بریگیڈیئر کہاں سے لاتے! قومیں، اسی قسم کی آزمائشوں سے گزر کر، اس آنچ میں تپ کر، کندن بنتی ہیں۔

ہمارے محسن درخت

توپیں تو جہاں بولتی رہتیں، البتہ بھارتی ہوائی جہاز عموماً روزانہ ایک یا دو وقت چکر لگا جاتے ہیں۔ اُڑی کی طرف سے گڑگڑاتے ہوئے آتے ہیں اور تڑتڑ گولیاں برساتے نکل جاتے ہیں۔ کٹھائی سے دو چار میل اوپر آئے ہوں گے کہ دشمن کے دو جہاز اوپر آ گئے۔ ہم نے دوڑ کر گنجان درختوں کے ایک جھنڈ میں اوٹ پکڑ لی۔ ایک بم ہمارے قریب آن کر پھٹا۔ کئی چٹانوں۔ درجنوں درختوں کے پرخچے اڑ گئے۔ زخمی درختوں کو دیکھ کر ان سے لپٹ جانے کو جی چاہا۔ خود زخمی ہو گئے مگر ہمیں زخمی نہ ہونے دیا ——— آہ یہ ہمارے محسن درخت!۔

(اگست)

مناظرِ فطرت

کہوٹائی سے صبح سویرے نکلے ۔ وادی پر صبح کا سہانا پن چھایا ہوا تھا ۔ ہر درخت ایک نظم معلوم ہو رہا تھا ۔ نظم تو مجھ جیسے احمق بھی لکھ لیتے ہیں درخت تو خدا ہی بنا سکتا ہے قدرتی مناظر میں بے پناہ جادو ہے ۔ پھول ، درخت ، سبزہ اور چشمے نہ ہوں تو زمین بانجھ ہو جائے ۔ موسموں کا سہاگ لٹ جائے ۔ اس وقت وہ مشہور مصرع ذہن میں نہیں آ رہا جس میں شاعر نے کہا ہے کہ درخت کا ہر پتّا ——— ورق ہے معرفتِ کردگار کا ——— یہ بصیرت داناؤں کے لئے ہے ۔ وسیع گھنے جنگل ہیں ، جہاں درخت پر درخت سوار ہیں ، گھاس کا ایک تنکا بھی بے کار یا فالتو نہیں ہے ۔ ع

خاشاک نے بھی دودھ پیا ہے بہار کا

صفدر بیٹھک

بارہ بجے غازی ہیڈ کوارٹر میں پہنچے جو کسی پریشان کن بحران (FLAP) کے بھنور میں چکرا رہا تھا ۔

راستے میں کچھ دیر صوبیدار شاہ صاحب کی بیٹھک میں جھانکے ۔ شاہ جی نے ایک نیا کتّا باندھ رکھا تھا ۔ پوچھا وہ ڈب کھڑبّا بانگڑو ، کدھر گیا ؟

بولے ——— " مظفر آباد میں بلیّاں گِن رہا ہے "

چائے کا دور بھی رہا ۔ کچھ عہدہ دار ، کچھ رضا کار ، چند مقامی سفید پوش ، چوپال کا سماں ، لوگوں کی روزمرّہ کی گفتگو میں اس بات کا عام چرچا ہے کہ اگر جنرل گریسی (پاکستان کے کمانڈر انچیف) قائدِاعظمؒ کے حکم کی تعمیل میں پاکستان آرمی کو کشمیر کے محاذ پر بھیج دیتے تو آج جنگ کا نقشہ ہی اور ہوتا ——— لوگوں کو یہ تک معلوم ہے کہ جس

وقت گریسی نے لیت و لعل سے کام لیا، اس وقت کمانڈر انچیف جنرل میسروی چھٹی پر ولایت گئے ہوئے تھے۔ گریسی چیف آف سٹاف تھا۔ عام تاثر یہ ہے کہ جب بھارت کا کمانڈر انچیف "راب لاک ہارٹ" ہو اور پاکستان کا ڈوگلس گریسی اور دونوں کی نکیل کلاڈ آکنلک کے ہاتھ میں ہو تو بھلا ایک انگریز دوسرے انگریز کے خلاف محاذ آرائی کیوں کرے گا پھر انگریز کا پرانا خاصا ہے کہ سیاسی معاملات میں وہ "اوپر" سے ہدایات لئے بغیر کوئی قدم نہیں اٹھاتا۔ ریڈ کلف برطانیہ کا نامور وکیل تھا۔ اس نے فیروز پور، موگا، زیرہ اور گورداسپور میں کیا کیا؟ — اب کسے رہنما کرے کوئی؟

ایک مجاہد بھی اس بیٹھک میں بیٹھے تھے۔ پرائمری سکول میں مدرسی کر چکے تھے۔ مجاہدین کے ہراول دستوں کے ساتھ سری نگر شہر کے دیوار و در دیکھ آئے ہیں۔ لمبی آہ کھینچ کر بولے — "افسوس ہمارے بعض دستوں کو وہاں پہنچ کر یہ یاد نہ رہا کہ وہ وہاں کیوں آئے تھے"؟

جنرل طارق

چلئے جنرل طارق (بریگیڈیئر اکبر خان)[1] کو بھی دیکھ لیا۔ متاثر ہوئے مگر خوش نہیں ہوئے۔ ان کو حد سے زیادہ سنجیدہ اور اگلے مورچوں میں الجھا ہوا پایا۔ بٹن اور بنیان میں تھے۔ چھاتی کے بالوں کے گھنے گچھے بنیان سے باہر اُڑ رہے تھے۔ مضبوط، لمبا تڑنگا، بارعب اور زیرک فیلڈ کمانڈر سامنے دیوار پر میدان جنگ کا نقشہ آویزاں تھا جس پر مختلف رنگوں کے نقطوں میں متحارب فوجیں صف آرا تھیں۔ صاف معلوم ہو رہا تھا کہ جنگ کا دباؤ کہاں زیادہ ہے کہاں کم ہے۔ جنرل صاحب "پوائنٹر" (POINTER) نقشے پر پھیرتے

---

[1] مشہور مقدمہ سازش راولپنڈی کے ماخوذ میجر جنرل اکبر خان۔ دوسری جنگ عظیم میں شجاعت کا اعلیٰ تمغہ (DSO) حاصل کیا۔ پاکستان آرمی کے چیف آف جنرل سٹاف رہے۔ حکومت پاکستان میں وزیر مملکت رہے۔

جاتے اور "سٹاف افسروں" کو جو کاپی پنسل لئے گوش بر آواز کھڑے تھے ہدایات لکھواتے جاتے۔ ہدایات سے یوں معلوم ہوتا جیسے پونچھ کی لڑائی آپ گلگت کی طرف سے لڑ رہے ہوں۔

ایک مقام پر جس کے گرد سرخ دائرہ کھینچا تھا، پوائنٹر رکھتے ہوئے وہ تدبیراتِ جنگ کو کچھ زیادہ ہی کھول کر بیان کرنے لگے۔ مطلب یہ کہ ہماری اس یونٹ پر بہت زیادہ دباؤ آ رہا تھا۔ یہ ریاض شمیم کی ۱۲ فرنٹیئر فورس رجمنٹ تھی۔

میں اور کیپٹن نمازی ملحقہ کمرے میں سگریٹ پی رہے تھے۔ میں نے نمازی سے کہا۔ کمانڈر سے ملاقات کرا دو۔

"اس وقت نہیں"

"کیوں" میں نے پوچھا "کیا اس وقت وہ سری نگر پہنچے ہوئے ہیں" "نہیں" "ہیں تو اُوڑی ہی میں" نمازی بولے— "لیکن ابھی ابھی ٹیلی فون پر، جی ایچ کیو میں جنرل گریسی سے جھڑپ ہو چکی ہے"— یہ بات سن کر افسوس تو ہوا کہ ہمارے کمانڈروں کو جنرل کلونت سنگھ سے لڑنے سے پہلے جنرل گریسی سے بھی لڑنا پڑتا ہے۔ بہر حال میں نے ہنس کر کہا "جنرل گریسی کے بعد ایک کپتان سے وہ کیا جھڑپ کریں گے۔ سرِ تسلیم خم ہے جو مزاجِ یار میں آئے"

ملاقات دوپہر کے کھانے پر ہوئی۔ جنرل صاحب لسی اور چٹنی کے ساتھ مکئی کی تندوری روٹی تناول کر رہے تھے۔ نوالہ ہاتھ میں اور ذہن میدانِ جنگ میں۔ ہر لقمے کے ساتھ کسی نہ کسی یونٹ کو بھی اٹھاتے بٹھاتے رہے۔ درمیان میں ایک طویل مکالمہ جنرل نذیر احمد کے ساتھ ہوا۔ میں سوچ رہا تھا۔ شاید مجھے کوئی نظم سنانے کی فرمائش کریں گے۔ میں دل ہی دل میں اپنی رجزیہ نظم

ع مجاہدینِ صف شکن بڑھے چلو! بڑھے چلو!

کے بند دوہرا رہا تھا لیکن اسے بسا آرزو کہ خاک شد۔ جنرل صاحب نے پانڈو کے بارے میں چند سوالات پوچھے۔ کھانے سے اُٹھے تو پھر نقشے پر جھک گئے۔

ریاض شمیم سے ملنے کا پروگرام۔ یونٹ کے گرد سرخ دائرے کی وجہ سے دھرا کا دھرا رہ گیا۔ ٹیلیفون پر بات ہوئی۔ وہ لوگ واقعی کسی بھنور سے گتھم گتھا تھے۔ ریاض شمیم نے جلدی سے کہا "جنّ یار غالب کا ایک شعر سُن لو۔" ٹیلیفون رکھ دیا۔ شعر یہ تھا

مدّت ہوئی ہے یار کو مہماں کئے ہوئے
جوشِ قدح سے بزم چراغاں کئے ہوئے

کرنل لطیف افغانی

رات کا کھانا مرن میں کرنل لطیف افغانی کے ہاں تھا مہمان خصوصی تو ہمارے دوست بریگیڈیئر جنرل حبیب الرحمٰن تھے مگر وہ پہنچ نہ سکے۔ حبیب الرحمٰن ہمارے محترم دوست ہیں۔ ان کو ہم نے بریگیڈیئر جنرل یوں لکھا کہ وہ دوسری عالمی جنگ میں کپتان کی حیثیت سے ملایا گئے۔ وہاں آئی۔این۔اے میں تھے تو بریگیڈیئر مگر کہلاتے جنرل تھے۔ اب آزاد فوج کی قیادت کر رہے ہیں ہم تب سے ان کو "بریگیڈیئر جنرل" کہتے ہیں۔ جری اور وضع دار انسان۔ ہماری ان سے پرانی یاد اللہ۔

کرنل لطیف افغانی "آزاد کشمیر ہوم گارڈز" کے کمانڈر ہیں وضع قطع سے "کمانڈو" لگتے ہیں۔ ملنگ بھی اور دبنگ بھی ان کو دیکھ کر جھنڈواڑہ کے جنگلوں میں گھومنے والا انگریز کمانڈو۔ میجر جنرل ونگیٹ یاد آگیا۔ وہی جیالا پن، وہی ژولیدہ صورت لطیف افغانی سابق شاہِ افغانستان امان اللہ خان کے رشتہ دار بتائے جاتے ہیں باہر سے اتنا کھردرا اور اندر سے اتنا ملائم آدمی کم کم نظر آتا ہے۔ انہوں نے مرزا بیدل کا ایک شعر سنایا تو ہم نے جواب میں غالب کا وہی شعر سنا دیا جو صبح کو ریاض شمیم نے سنایا تھا۔ ایک صاحب بولے۔ اگر یہ شعرِ بھارتی کمانڈر جنرل کلونت سنگھ سن لیتا تو وہ اس کا کیا مطلب لیتا۔"

عزیز الرحمٰن فوراً چمک کر بولے ــ "کلونت سنگھ اور مرزا غالب"

اس پر جو قہقہہ بلند ہوا اس میں عزیز الرحمٰن کی "کھرج" سب سے بلند تھی۔ اس کا یہ قہقہہ مجھے ہمیشہ یاد رہے گا کہ اس کے بعد اس نے رخصت طلب کرتے ہوئے مجھے معانقہ کیا اور پھر "بلیک آوٹ" کی اتھاہ تاریکی میں اس کی گاڑی عارضی ہیڈ کوارٹر کی طرف اور ہماری جیپ ایبٹ آباد کی طرف روانہ ہوگئی۔ ایبٹ آباد تک بار ہا یوں لگا جیسے عزیز الرحمٰن کے لطیفے اور قہقہے گونج رہے ہیں۔ جیسے وہ ہمارے ساتھ ساتھ چلا آرہا ہو"

(۱۴ اگست ۱۹۴۸ء)

کرنل اینگلز

کیپٹن قیوم (ہمارے ہیڈ کوارٹرز کے سٹاف کیپٹن A) کے ہمراہ پاکستان ملٹری اکیڈمی کی ایک اور جھلک دیکھ لی۔ چاق و چوبند اسٹڈول صحت مند کیڈٹوں کو دیکھ کر اپنے آپ میں اعتماد بڑھتا ہے۔ ڈیرہ دون میں کوئی سرخاب کا پر نہ تھا جو کاکول میں نہیں۔

آج اکیڈمی کے کمانڈنٹ اینگلز (ANGLES) سے بھی ملاقات ہوگئی۔ دفتر میں یا گھر کے اندر نہیں۔ موصوف قینچی پکڑے کمانڈنٹ ہاؤس کی بیرونی دیوار کی باڑہ کی شاخ تراشی کر رہے تھے کہ ہم پاس سے گزرے۔ قیوم سے ان کی پرانی صاحب سلامت تھی۔ اس کی "گڈ آفٹر نون سر" (GOOD AFTERNOON SIR) کے جواب میں قینچی روک کر ہمیں چند منٹ تک وہیں روکے رکھا۔

کوئی چیز تجربے کا بدل نہیں ہوتی۔ اینگلز ہنسی ہنسی میں کتنی ہی پتے کی باتیں کہہ گئے بعض باتیں ہم پلے باندھ لائے۔ باغبانی کے بارے میں کہا "اس شوق کی کوئی حد نہیں۔ اس کی مثال سمندر کے پانی کی سی ہے کہ جتنا پیو پیاس بڑھتی چلی جائے"۔

ورزش کی اہمیت پر ہم درجنوں لیکچر سن چکے ہیں ان کا ایک جملہ ہمیشہ یاد رہے گا فرمایا ــ "جس سطح پر انسان کا جسم ہوگا اسی سطح پر اس کا شعور ہوگا" ہم نے جیسا کہ ہم

سعادت مند خوردگان کا فرض تھا۔ جب اُن کی شاخ تراشی کی مہارت کو سنہرے الفاظ میں خراج تحسین پیش کیا تو ازراہِ انکسار بولے "اگر آپ کے پاس کرنے کو کچھ نہ ہو تو اپنی بے عملی ہی میں کوئی اسٹائل (STILE) پیدا کر لینا چاہیئے ہم نے ایبٹ آباد واپس جانے کی اجازت چاہی تو ہنسی ہنسی میں ایک عسکری اصول بھی ہمارے ذہن نشین کر دیا۔ کہنے لگے تو پسپائی کا ارادہ ہے۔ مگر یاد رکھو کہ پسپائی ہمیشہ تباہ کن ہوتی ہے۔"

میجر شیر محمد شاد

کمانڈنٹ کو باڑھ سے لپٹا چھوڑ کر ہم "آفیسرز میس" میں جھانکنے چلے گئے۔ وہاں اتفاقاً میجر شاد (پاکستان آرڈیننس کور کے ریٹائرڈ کرنل شیر محمد شاد جون ۱۹۸۰ء میں انتقال ہوا) مل گئے شاد اور ہم کیمبل پور کے گورنمنٹ اور لاہور کے اسلامیہ کالج میں ایک جماعت آگے پیچھے تھے ہمارا لنگوٹیا یار شاد کالج تک شاعر رہا۔ جنگ چھڑتے ہی فوج میں سرداری کمشن لے کر شمالی افریقہ چلا گیا۔ اس کی شاعری تو رک گئی۔ البتہ فوج میں اس تیزی سے آگے بڑھا کہ ۱۹۴۵ء میں جب سمندر پار سے واپس آیا تو اس کے کندھے پر لیفٹیننٹ کرنل کا تاج اور ستارہ جگمگا رہا تھا ہم اسے وہاں سے اٹھا کر اپنے ہوٹل لے آئے پھر رات کو دیر تک محویت کے اس عالم میں باتیں ہوتی رہیں

؎ کہ کس کو ہوش تھا دل دے گیا یا لے گیا کوئی

(۲ر اگست)

یوم استقلال

مجلس اقوام متحدہ (یو۔ این۔ او) کا "مشن" ایبٹ آباد پہنچ گیا۔ پانچ رکن۔ چار مرد ایک خاتون۔ ہمارے جنرل ہیڈ کوارٹرز کی طرف سے بریگیڈیئر شیر خان[1] "مشن" کے ہمراہ ہیں

---

[1] بریگیڈیئر شیر خان ڈائریکٹر ملٹری آپریشن تھے بعد میں میجر جنرل ہوئے ۱۹۴۸ء میں مجلسِ اقوام متحدہ کے اجلاس میں شرکت کیلئے جا رہے تھے کہ جنگشاہی کے قریب ہوائی حادثے میں جان بحق ہو گئے میجر جنرل افتخار احمد بھی اسی جہاز میں سوار تھے۔

اپنے ہیڈکوارٹرز کی طرف سے میں خیر مقدم کے لیے سہ پہر کو ہری پور پہنچ گیا تھا گویا

ع سینۂ شمشیر سے باہر تھا دم شمشیر کا

شام کے چھ بجے پیلس ہوٹل میں ان کے اعزاز میں عصرانے اور مزید شام بھیگنے پر کلب میں "شامیانے" اور رات کو جی او سی میجر جنرل نذیر احمد، کی طرف سے عشائیے کا اہتمام تھا مگر ہم آٹھ بجے سے پہلے نہ پہنچ سکے ادھر چائے اور میزبان پڑے پڑے ٹھنڈے ہو گئے ہری پور کے برساتی نالے نے جو طغیانی پر تھا، ہمیں رو کے رکھا۔ ع

وہ اس کنارے ہم اس کنارے

جنرل نذیر کے ڈنر میں بریگیڈیئر سر حسام الدین سے ملاقات ہوئی۔ چرچا ان کا بہت عرصہ سے سن رہے تھے آج ملاقات بھی ہو گئی۔ کھلی طبیعت کے بزرگ ہیں پہلی جنگ عظیم کے سپاہی۔ انگریزی سرکار دربار میں بڑا رسوخ تھا۔ تمغوں کی دو تین قطاریں سینے پر سجی ہوئی تھیں تین چار تمغے گلے میں بھی حمائل تھے۔ صوبہ سرحد کی دوسری ممتاز شخصیتوں میں سے خان عباس خان وزیر مال بھی عشائیے میں موجود تھے۔ ان کی سادگی اور متشرع شکل و صورت سے آدمی بہت متاثر ہوتا ہے۔ ان کی باتوں سے معلوم ہوا کہ صوبے میں اناج کی قلت ہے مشن کے اراکین سے ہم شیر و شکر تو کیا ہوں گے۔ البتہ امریکی فرانسس سمتھ اور بلجیم کے پیری گریفن بہت تیز معلوم ہوئے۔ گریفن جو باہر سے ایک ژولیدہ رُو، اُلجھا اُلجھا غیر مرتب شخص نظر آتا ہے، اندر سے بے حد چمکدار ہے۔ عربی اور فارسی میں بھی روانی سے بات کر لیتا ہے۔ مجھ سے انہوں نے عربی اور فارسی میں مصرع اٹھانا چاہا۔ ہم نے معذرت کے ہاتھ بلند کر دیئے۔

ہمارے کمانڈر انچیف کے پرائیویٹ سیکرٹری لیفٹیننٹ کرنل ولسن بھی پارٹی کے ہمراہ ہیں۔ نہ معلوم ان کو کس "کھاتے" میں بھیجا گیا ہے۔ بہرحال بقول اکبر ؎

بدھو میاں بھی حضرت گاندھی کے ساتھ ہیں

خیر۔ ان کو بدھو کہنا تو غلط ہے۔ وجیہہ، جواں سال، ہنس مکھ، کرنل ولسن کمیشن کے ممبروں سے بشمول خاتون رکن، خوب گھل مل کر باتیں کر رہا ہے، جیسے یہ لوگ آپس میں جنم جنم کے واقف ہوں۔ ولسن چاہے تو ہمارے نقطۂ نظر کی ترسیل میں مفید ثابت ہو سکتا ہے۔ مگر اس کام کے لئے ہم ولسن کی طرف کیوں دیکھیں۔؟

کرنل ممتاز علوی رہمارے محکمے کے سربراہ، کا حکم تھا کہ اخبارات کو "مشن" کی لمبی لمبی خبریں بھجوانا۔ جنرل نذیر کا ڈنر لکھا کر ہم اپنے ٹیلی فون پر جا بیٹھے۔ لاہور کی "لائن" ہی نہ مل سکی راولپنڈی میں علوی صاحب سے رجوع کیا تو وہ مل گئے ہم نے ماجرا بیان کر کے خبروں کا حشر و نشر انہیں کے سپرد کر دیا۔ ڈر بھی لگ رہا تھا مبادا "باس" خفا ہو جائے مگر علوی صاحب ہنس کر بولے "اچھا ہم ہی کر لیں گے۔ مگر ایک مصرع سن لو۔

جو چیرا تو اک قطرۂ خون نکلا" !

(ایبٹ آباد ۱۲ اگست ۱۹۴۸ء)

دن بھر موسلا دھار مینہ برستا رہا۔ ایبٹ آباد تو پہاڑی مقام ہے۔ میدان میں نہ جانے کیا طوفان ہو۔ جہلم اور چناب بپھرے ہوتے ہیں۔ سندھ میں سکھر کی نہروں نے ٹوٹ کر آفت برپا کر رکھی ہے۔

(۱۳ اگست)

یوم استقلال کی ہماہمی ہم نے کچھ ایبٹ آباد میں دیکھی اور کچھ منظفر آباد میں

ایبٹ آباد میں صبح کو پریڈ ہوئی۔ جنرل نذیر سلامی لے رہے تھے

شکر ہے کہ گزشتہ چھتیس گھنٹوں سے لگاتار (بلکہ لگا دھار) برستا ہوا پانی رات کو تھم گیا۔

صبح ہوئی تو پہاڑوں پر دھوپ چمک رہی تھی لوگوں نے شہر کے کوچہ و بازار کو بہت لگن سے سجایا ہے۔ جا بجا کپڑے اور پھولوں کے دروازے ایستادہ ہیں جن پر قائد اعظم کی تصاویر آویزاں کی گئی ہیں۔ بازار میں بعض دوکانداروں نے جست اور لوہے کے صندوقوں سے

زینہ بہ زینہ مینار اور دروازے نصب کئے ہیں، جو بہت خوبصورت معلوم ہوتے۔ پرچموں کی کمی محسوس ہوئی۔ سنگاپور میں ہم نے چینی لوگوں کو دیکھا ہر قومی تقریب پر ہر چینی گھر کی کھڑکی سے قومی پرچم بلند نظر آتا۔ شام کو ہم مظفر آباد آ پہنچے کہ یو این مشن یہاں کل آ پہنچا ہوا ہے۔ شہر میں چراغاں ہے۔ اس شہر میں ہم کچھ عرصہ پہلے کتنا اندھیرا دیکھ چکے ہیں۔ "دیکھنا" کیا معنی کچھ دکھائی دیتا ہی کہاں تھا؟ (۲۴ اگست)

نمرود اور امرود

کئی روز سے پہاڑوں کے بکری راستوں پر چل چل کر چور چور ہو رہا تھا۔ آج دوپہر کو جو سویا تو شام تک سویا ہی رہا۔ اس ہوٹل کا نام "اسپرنگ فیلڈ" ہے اس کی چارپائیوں میں بھی "اسپرنگ" لگے ہیں۔ آدمی لیٹ جائے تو اٹھنے کو جی نہ چاہے۔ اس طرح ٹوٹ کر سونے پر محسوس ہوتا ہے کہ نیند کتنی بڑی نعمت ہے۔ تعجب ہے کہ صبح صبح جاگنے کی فضیلت سے تو ہماری شاعری بھری پڑی ہے مگر نیند کی برکات کا بہت کم ذکر کیا گیا ہے؟ ہوٹل کے سادہ ہنس مکھ بیرے۔ ابراہیم کو یہ مصرعہ سنا کر سویا تھا۔

آگ ہے، اولادِ ابراہیم ہے نمرود ہے

ابراہیم اس مصرعے میں سے صرف اپنا نام ہی اچک سکا بولا۔

صاحب جی! آگ تو کچن میں ہے مگر امرود بازار سے لانا پڑیں گے؟"

چائے اور چہرے

ہم شام کو بھی لیٹے ہی رہے کہ آج ہم کو جگانا۔ لانا تھا جوئے شیر کا اتفاق کی بات کہ یہ جوئے شیر داصل میں جوئے شعر، شام ہی کو شوکت واسطی کی صورت میں آ گئی۔

دو آتشہ۔ محسن بھی ہمراہ (نامور شاعر محسن احسان۔ محسن کی شاعری، اس کی جوانی کی طرح

چند ہیا دینے والی تیزی سے ابھر رہی ہے۔ بازار کی کلاں سڑک پر نکلے ہی تھے کہ ایبٹ آباد کے کلاں شہری، جلال بابا (خان بہادر جلال الدین مرکزی وزیر رہے)، سامنے سے آتے ہوئے مل گئے اور بہ اصرار اپنے "ٹرانسپورٹ کیبن" میں لے گئے۔ اصرار کارگر نہ ہوتا تو وہ تکرار پر بھی اتر آتے۔ چند لمحوں میں پر تکلف چائے سامنے سے آگئی۔

بندے سے تو ان کا کوئی سابقہ تعارف نہ تھا نہ ہم اس وقت اپنی کپتانی کی وردی میں تھے آؤ بھگت ہوتی۔ جہاد کشمیر کی وجہ سے لوگ مجاہدوں کی راہ میں آنکھیں بچھا رہے ہیں کوئی باوردی فوجی سڑک سے گزرتے تو لوگ یہی سمجھتے کہ مجاہد اڑی یا ٹیٹوال کے محاذ پر جا رہا ہے جہاں جام شہادت کی سعادت بھی حاصل ہو سکتی ہے حقیقت یہ ہے کہ جلال بابا بے حد متواضع انسان ہیں نہ معلوم اپنے مہمانوں کے ساتھ روزانہ کتنے گیلن چائے پی جاتے ہیں۔ جس وقت ہم کیبن سے نکل رہے تھے مانسہرہ کے طرحدار نوجوان حنیف خان (خان محمد حنیف خان، مرکزی وزیر اطلاعات رہے)۔ کہ جیپ آکر رکی اور آگے پیچھے چھ آدمی نکل کر باری باری خان بہادر صاحب کے سینے سے لپٹ گئے۔ ظاہر تھا کہ سینے سے الگ ہو کر وہ چائے بھی پئیں گے۔

کچھ آگے بڑھے تو دوسری چائے منتظر ملی۔ نصر من اللہ اپنے چند ہم سبق طلباء کو جلو میں لئے ایک قہوہ خانہ میں بیٹھے تھے۔ ادھر ادھر کے میزوں پر پی ایم اے (پاکستان ملٹری اکیڈمی) کے کیڈٹوں کا ہجوم تھا۔ نہ معلوم ان نوخیز کیڈٹوں میں آج کے کتنے جرنیل شامل ہیں (۱۹۷۹ء) نصر نے ہمیں دیکھا تو پہلے اندر ہی سے سیٹی بجائی۔ پھر دوڑ کر باہر آگیا۔ پھر ہم سب اس کے ساتھ قہوہ خانہ میں جا بیٹھے۔ کچھ وقت سیر حاصل گپ شپ رہی، اپنی کالج یونین کا صدر ہے۔ گفتگو بڑی گرج، چمک سے کرتا ہے۔

خان فقیرا خان

تیسری چائے خان فقیرا خان جدون کے ہاں ہوگئی۔ ہونی ہی تھی۔ ہم ان کے گھر کے

سامنے سے گزرے جو تھے۔ خان اگر گھر پر موجود ہو اور اپنے کسی شناسا کو گلی سے گزرتا دیکھ لے تو قہوہ یا چائے پلائے بغیر گزرنے نہیں دیتا۔ ہم پکڑے گئے محبت کی زنجیر باتیں زیادہ تر وہی کرتے رہے۔ ہمارا ان کا صحافت کا ناتا بھی تھا خان کے ہفتہ وار اخبار کو سوبہ سرحد کا سیاسی "ٹوٹکا نامہ" کہنا چاہیئے، بڑے بڑوں کے عبا و قبا پر اس دلیری سے ہاتھ ڈالتا ہے کہ واہ واہ، خان کسی مدرسے میں کم ہی بیٹھا تھا ہم نے اس کو کبھی لکھتے نہیں دیکھا مگر اخبار نکال رہا ہے۔ قیادت صرف مدرسوں ہی میں نہیں پیدا ہوتی گفتگو کے دوران میں جتنی چیزیں سامنے آئیں یا ان کا غائبانہ تذکرہ آیا۔ ان کے ساتھ کوئی نہ کوئی سماجی یا تاریخی خصوصیت وابستہ تھی۔ موٹر، سرجان کنگھم (گورنر) کی رکاب میں رہ چکی تھی۔ قہوہ کے فنجان اکرام اللہ سیکرٹری امور خارجہ ان کے لئے پیرس سے لائے تھے ہمارے بیٹھے بیٹھے ٹیلیفون کی ٹرنک کال آئی۔ بتایا ریاست بہاولپور کے وزیر اعظم کرنل ڈرنک بات کر رہے تھے۔ سگریٹ۔ راجہ غضنفر علی خان نے بھجوائے تھے۔ حیرت کا سب سے بڑا غوطہ دیوانِ غالب کا نسخہ حمیدیہ دیکھ کر محسوس ہوا۔ اس نسخہ پر تہدیہ کے ساتھ نواب سر حمید اللہ خان والئی بھوپال کے دستخط ثبت تھے۔ (ایبٹ آباد)

افغانی و ترکستانی

ہمارا آج کا دن۔ دو دوستوں سے منسوب رہا۔ جن میں سے ایک افغان ہے اور دوسرا ترک، افغان کے ساتھ کھانا کھایا۔ ترک کا خط آیا۔ افغان دوست براہ راست ہمارا دوست نہیں۔ ہمارے دوست کیپٹن صمد کا دوست ہے۔ صمد کے ہمراہ (بلکہ طفیل) اس ضیافت میں ہم پہنچ گئے۔ یہ صاحب افغانی بھی کیا ہیں صدیوں سے یہیں بسے ہوئے ہیں۔ ٹھیٹھ ہزارہ وال جیسے ہم میں سے کوئی خوارزمی ہے کوئی مشہدی، کوئی ہمدانی۔ ویسے ہی یہ افغانی ہیں۔ ان میں تو کوئٹہ کے ہمارے شاعر دوست ماہر افغانی والی بات بھی نہیں کہ

فارسی تو گھر میں رکھی ہوتی۔ ہاں پلاؤ واقعی افغانی تھا۔ جس کا طشت جب سامنے آیا تو ہمیں بے اختیار اُردو کے صاحبِ طرز ظریف شاعر نذیر احمد شیخ[ھ۵] کی نظم "پلاؤ" کے دو شعر یاد آ گئے۔

پلاؤ جہاں پر بگھارا گیا ہے
زمیں سے فلک تک بپھارا گیا ہے
اسی غم میں شیطان مارا گیا ہے
کہ مومن پہ یہ کیا اُتارا گیا ہے

آج ہی کراچی سے ڈاکٹر ظاہر بیگ ترکستانی کا خط ملا۔ ظاہر بیگ کی ٹوٹی پھوٹی انگریزی ایک اپنا ہی ذائقہ رکھتی ہے۔ سلاست کم، بلاغت زیادہ ظاہر بیگ ہو گا کوئی پچیس برس کا کم و بیش اتنے ہی برس ان کو اپنے وطن سے نکلے ہوں گے جو روس کے زیر تسلط وسطی ایشیا میں واقع ہے۔ وہاں کے ترکوں کا ناک نقشہ پھسلوان سا ہے۔ رنگ سرخ تو استنبول زرد ہو تو منگولی۔ ظاہر بیگ کا شمار شکیل استنبولی ترکوں میں ہو گا۔ ابتلا آدمی کو جفاکش اور ہنرمند بنا دیتی ہے۔ اس خطے کے باشندے وطن بدر ہونے کے بعد، روزی اور سکونت کی تلاش میں دنیا بھر میں پھیل گئے ہیں۔ ظاہر بیگ نے کراچی میں دندان سازی کا کلینک کھول رکھا ہے۔ ڈگری کوئی نام کی پاس نہیں ہے مگر اپنے ہنر کا صاحب کمال سمجھا جاتا ہے اچھی صورت بھی نصفِ رزق ہوتی ہے۔

اقوام متحدہ اور ہمارا مشاعرہ

اقوام متحدہ کے "کشمیر کمیشن" نے جنگ بندی تجاویز پیش کر دی ہیں۔ ہمیں تو ان سے

ھ۵ نذیر احمد شیخ۔ مصنف حرفِ بشاشت "۹ مارچ ۱۹۷۱ء کو راولپنڈی میں انتقال ہوا۔

کچھ انشراح صدر نہیں ہوا ۔ جلال بابا، لال جھبو کا ہو رہے تھے ۔ ان کا بس چلے تو وہ اسی وقت مذمت کا تار بھیج دیں جلال بابا بدستور سابق مجاہدین کے لئے کھیل جمع کر رہے ہیں ۔

پروفیسر شوکت واسطی اور ہم مجاہدین فنڈ" کے لئے ایک مشاعرے کا اہتمام کر رہے تھے شوکت دوڑے دوڑے یہ پوچھنے آئے کہ اقوام متحدہ کی تجاویز سے کہیں ہمارا مشاعرہ تو متاثر نہیں ہو گا؟ اس پر ہم نے بھی اپنی کونسل کا ہنگامی اجلاس طلب کیا جو شوکت واسطی حفیظ اثر محسن احسان اور ہم پر مشتمل تھی ۔ فیصلہ پہلے سے طے تھا کہ جنگی مشاعرہ ہو کر رہے گا۔ مشاعرے کے اشتہار بھی آج ہی نکلے ہیں جس میں اپنے نام کو جلی قلم میں لکھا دیکھ کر ، یہ کیسے کہوں کہ دل خوش نہیں ہوتا۔ سچ ہے کہ نفس کو مارنا بھی ایک جہاد ہے ۔

آہ! اختر شیرانی

لاہور ریڈیو نے اردو کے منفرد شاعر حضرت اختر شیرانی کے انتقال کی اندوہناک خبر سنائی ۔ اختر شیرانی جو شاعرِ رومان کے عرف سے مشہور تھے اردو شاعری میں اپنی ایک روشِ خاص کے بانی ہیں ۔ وہ اس دور کے مقبول شاعر تھے جن کا اسلوبِ سخن یقیناً ادب کے وسیع دھارے پر اپنے دیرپا اثرات چھوڑے گا ۔ ان کی موت دنیا ادب کے لئے ایک عظیم حادثے سے کم نہیں ہے ۔

اسلامیہ کالج میں (۳۸ ـ ۱۹۳۶ء) میں مجھے اپنی طالب علمی کے زمانے میں ان کی خدمت میں حاضری کی سعادت حاصل رہی ہے ۔ احمد ندیم قاسمی، اوپندر ناتھ اشک راجہ مہدی علی خان ، غلام عباس ، وشوا متر عادل اور میں ۔ اکثر دفتر رسالہ " رومان " میں ان کے پاس بیٹھا کرتے ۔ اختر شیرانی اپنے نامور والد پروفیسر حافظ محمود شیرانی کے ساتھ فلیمنگ روڈ کے ایک احاطہ کے اندر واقع ایک سہ منزل عمارت میں ایک چھوٹا سا کمرہ ان کے لئے مخصوص تھا ۔ وہی دیوان خانہ وہی خواب گاہ ، اسی میں رسالہ " رومان " کا دفتر ۔ افسوس اس نابغۂ روزگار کو بڑی مختصر زندگی

ملی۔ مگر انہوں نے طویل زندگی کی تمنا ہی کب کی تھی۔ وہ تو اپنی زندگی کی موم بتی کو بڑی تیزی سے جلاتے رہے اور جلاتے بھی دونوں سروں سے رہے ۔ جی اداس ہو گیا!!

نذیر احمد شیخ پیشے کے لحاظ سے بارود سازی کے ماہر تھے۔ کئی برس انگلستان میں رہ کر یہ ہنر سیکھا۔ ۱۹۴۵ء میں سات ہزار روپیہ ماہانہ مشاہرے پر حیدر آباد میں نظام دکن کی آرڈیننس فیکٹری کے مہتمم اعلیٰ مقرر ہوئے

قیام پاکستان کے بعد آرڈی ننس فیکٹری واہ میں اسسٹنٹ ورکس منیجر کے عہدے پر آ گئے اور ورکس منیجر کے منصب سے ریٹائر ہوئے ۱۹ ر مارچ ۱۹۷۱ء کو راولپنڈی میں انتقال ہوا۔ ظریفانہ کلام کا ایک مجموعہ "حرف بشاش" کے عنوان سے جس کو جناب ممتاز حسن احسن نے مرتب کیا: نذیر احمد شیخ کی زندگی میں شائع ہوا۔ بہت سا کلام غیر مطبوعہ پڑا ہے (دسمبر)

قائد اعظم کی وفات

موت کے بے رحم ہاتھوں نے بانئ پاکستان بابائے قوم۔ ہمارے محبوب قائد اعظم محمد علی جناح کو ہم سے چھین لیا۔ ان للہ وانا الیہ راجعون !

یہ خبر اس قدر اچانک ہے کہ دل مان نہیں رہا۔ وہ علیل تھے مگر ان کی رحلت کی طرف دھیان نہیں جاتا تھا۔ قائد اعظم کی وفات، پاکستان ہی نہیں، پورے عالم اسلام کے لئے ایک عظیم حادثہ ہے میرے لئے اپنے جذبات کا اظہار اور ربط پر قابو رکھنا ممکن نہیں پاکستانیوں کے لئے اس سے بڑا صدمہ اور کیا ہو سکتا ہے یوں محسوس ہو رہا ہے جیسے ہم ہوا. روشنی اور پانی سے محروم ہو گئے ہوں۔ ہمیں ان کی پہلے سے بھی زیادہ ضرورت تھی ابھی تو راستے کی سمت ہی متعین ہوئی تھی۔ سفر تو ابھی شروع ہی نہیں ہوا۔ ہم چاروں طرف سے خطرات میں گھرے ہوئے ہیں۔ قائد اعظم کی ذات، قوت اور روشنی کا مینار تھی۔

میں کوئی لیڈر نہیں ہوں کہ کوئی سیاسی پیشگوئی کر سکوں یا لوگوں کو صبر اور حوصلے کی

تلقین کروں۔ میں یہ سطور محض اسے لئے لکھ رہا ہوں کہ قائداعظم کی زندگی ہمت بلند عظمت کردار۔ دور اندیشی اور بخت بیدار کی درخشاں مثال تھی۔ انہوں نے کروڑوں انسانوں کے دلوں پر حکومت کی۔ ہمیشہ قائم رہنے والی حکومت انہوں نے ہندوستان کے منتشر، زبوں حال مسلمانوں کو ایک مرکز پر جمع کیا اور اپنی بے مثال قیادت سے، خواب آزادی کو تعبیر کردیا۔ مسلمانوں کی اپنی آزاد مملکت دنیا کے نقشے پر ابھر آئی۔ ہندوستان کے ہندوؤں کے نزدیک مہاتما گاندھی اس صدی کے عظیم ترین آدمی تھے قائداعظم نے اس مہاتما گاندھی سے پنجہ آزمائی کی اور کامران رہا۔ قائداعظم آگہی کا سمندر اور استقامت کا پہاڑ تھا۔

مستقبل کا جواب مستقبل ہی دے گا۔ بظاہر یہ گھاؤ بھرنے والا۔ یہ خلا پُر ہونے والا نہیں۔ قائداعظم جیسے دیدہ ور صدیوں میں جاکر پیدا ہوتے ہیں۔ مایوسی بے شک گناہ ہے مگر اس وقت تو رونے کو جی چاہتا ہے جی بھر کر رونے کو۔ اور رو رو کر دعا کرنے کو۔

پروردگارا پروردگارا

تیرا بھروسا، تیرا سہارا (۱۲؍ ستمبر)

ایک اور تاریک دن

ہم قائداعظم کی وفات کے صدمے سے سوگ کی دھند میں ڈوبے ہوئے تھے۔ کہ ریاست حیدرآباد دکن پر ہندوستان کے حملے کی خبر نے اس دھند کو اور گہرا کر دیا۔ بھارتی فوج تین اطراف سے بڑھ رہی ہے۔ اعلیٰ کمان لیفٹیننٹ جنرل راجندر سنگھ جی کے ہاتھ میں ہے۔ حملہ آور کالم میجر جنرل جے۔ این، چوہدری کی قیادت میں بڑھ رہا ہے راجندر سنگھ تو ہمارا دیکھا ہوا ہے۔ اس چوہدری کا نام پہلی مرتبہ سن رہے ہیں۔ یہ گھٹا کئی دنوں سے تُلی کھڑی تھی۔ برس کر رہی۔ خبریں تشویشناک ہیں۔ بھارت اِدھر کشمیر کو ہڑپ کرنا چاہتا ہے اور ادھر حیدرآباد کو بہانہ دونوں کے لئے الگ الگ۔

سقوطِ حیدر آباد

نظام کی فوج نے ہتھیار رکھ دیئے۔ ایک تاثر یہ ہے کہ نظام کی فوج نے ہتھیار اٹھائے ہی کب تھے یہ تو بچارے قاسم رضوی کے رضا کار پروانہ وار نچھاور ہوتے رہے۔ تفصیلات کا ابھی علم نہیں، بہر حال۔ جنوبی ہندوستان میں مسلمانوں کی سیادت کا یہ جزیرہ ڈوب گیا۔ ہو سکتا ہے کہ حضور نظام کی آئینی سیادت کو کسی ہیئت میں باقی رہنے دیا جائے، مگر منڈیر کی یہ ڈھلتی ہوئی دھوپ بھی کب تک؟ ریاست کا نظم و نسق جنرل چوہدری کی تحویل میں کر دیا گیا ہے۔ گویا حیدر آباد کی اب وہی کیفیت ہے جو ملایا کی جاپانی جنرل یاماشیٹا کے تسلط میں تھی۔ الحذر، الامان۔ ہر چند یہ کوئی مساوی معرکہ نہ تھا۔ مگر ہتھیار ڈالنے میں اتنی عجلت کی توقع بھی نہیں تھی۔ نظام کے کمانڈر انچیف جنرل العدروس نے آج سرکاری طور پر ہتھیار رکھ دیئے۔ حضور نظام کے بارے میں، صبح یہ افواہ گرم تھی کہ آصف جاہ ہفتم نے خودکشی کر لی۔ مگر شام کو ریڈیو نے اس افواہ کی تردید کر دی۔ ۱۳ر ستمبر کو جب آل انڈیا ریڈیو نے اورنگ آباد پر۔ جہاں محی الدین اورنگ زیب عالمگیر جیسا غازی مرد آسودۂ خاک ہے بھارتی فوج کے تسلط کی خبر دی تو دل پر جو گزر گئی اس کیفیت کو الفاظ میں کیسے بیاں کروں

؎ دوڑ پیچھے کی طرف اے گردشِ ایام تو

(۱۸ر ستمبر)

بس ایک دن میں

حیدر آباد کی زمین خونِ انسانی سے سرخ ہے۔ یروشلم میں مجلسِ اقوام متحدہ کے ثالث کاونٹ برنا دوتے کو کسی یہودی نے قتل کر دیا۔ برما کے وزیر خارجہ مسٹر ٹٹ کو، شہر کے بھرے بازار میں گولی کا نشانہ بنا دیا گیا۔ یہ سب کچھ صرف ایک دن میں ہوا۔ اور یہ ابھی سب کچھ کہاں ہے ؎

گھاٹیاں پھلانگنا

آج ذہنی آزمائش کا امتحان تھا۔ منہ زبانی نہیں، تحریری۔ ہم پُر اعتماد تھے عام معلومات کے سوالات ہمارے جانے پہچانے سوالات تھے۔ ہمارے لئے اس مضمون کی وہی حیثیت تھی جو ریاض خیر آبادی کے لئے، شاعری کی حد تک، شراب کی تھی۔ یعنی ؏

پانی نہ پیا شراب پی لی

پرچہ ملا۔ جملہ سوالات کے جوابات فرفر لکھ دیئے۔ نہ کہیں ذہن اونگھا نہ قلم رُکا۔ ہم اتنے تیز ذہن تو نہ تھے۔ مگر صحافت کی کوچہ گردی میں، حالاتِ حاضرہ کے مسائل ہم پر خاصے آسان ہو چکے تھے۔ بعض سوالات تو خود ہم پر واقعات کی صورت میں گذر چکے تھے۔ مثلاً کشمیر کمیشن کے سربراہ کا نام پوچھا گیا تھا۔ ہم کچھ عرصہ پہلے مظفر آباد میں ان صاحب کے ساتھ ایک میز پر کھانا کھا چکے تھے۔ سچ ہے کہ آدمی آدھی جنگ اعتماد سے جیت لیتا ہے۔

ہمارے لئے کٹھن مرحلہ، جسمانی پھُرتی کے مظاہرے کا تھا۔ رکاوٹیں عبور کرنے کا تحریری حل تو ہم لکھ سکتے تھے۔ مگر عملاً رسّے پر جھول کر گھاٹیاں پھلانگنا اب ہمارے بس کی بات نہ تھی۔ آخری انٹرویو کی طرف سے بھی کچھ ہراس پیدا تھا۔ بریگیڈیئر فضل الرحمٰن کلو، سلیکشن بورڈ کے پریذیڈنٹ ہیں۔ بریگیڈیئر کلو کے سامنے ہم ایک مرتبہ پہلے پیش ہو چکے ہیں۔ ان کی اصول پسندی کا بڑا شہرہ ہے۔ لیفٹیننٹ کرنل (بعد میں لیفٹیننٹ جنرل)، خواجہ وصی الدین نائب ہیں۔ ہم نے خود تو ابھی تک سُنی نہیں، مگر سُنا ہے کہ خواجہ صاحب کی انگریزی آسانی سے ہاتھ نہیں آتی۔

ہمیں معلوم نہ تھا کہ ہمارے عہدِ طالب علمی کے یار کیپٹن نصر اللہ یہاں "سائی کارٹسٹ"

ہیں۔ اپنے منصب کے لحاظ سے، امیدوار کی کامیابی کی آدھی کنجی ان کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ بلکہ اگر "سائی کارٹسٹ" نفی کر دے تو امیدوار کا قدم ہی زمین پر ٹکنے نہیں پاتا۔ نصر اللہ گورنمنٹ کالج لاہور میں پڑھتے تھے۔ اور ہم اسلامیہ کالج میں آپس کا رابطہ گہرا تھا۔ ہمیں گورنمنٹ کالج کی بریانی اور انہیں ہمارے ہاں کی۔ استاد خیرالدین کی پکی ہوئی دال ماش مرغوب تھی۔ شعر کا چسکہ ایک اور قدر مشترک۔ اگرچہ ان کا مضمون فلسفہ تھا اور میں تاریخ کا طالب علم۔ اتفاقاً آج وہ سر راہے مل گئے۔ مل کہاں گئے، ہماری نظر ان پر جا پڑی۔ وہ اسٹاف کپتانوں کی طرح عجلت بلکہ بوکھلاہٹ میں کاغذات کا پلندہ اٹھائے۔ تیز تیز ڈگ بھرتے کسی سینئر اسٹاف افسر کے دفتر کی طرف بگٹٹ چلے جا رہے تھے۔ انہوں نے بھی ہمیں دیکھا تو ہوگا، مگر جس نگاہ سے دیکھا، وہ نگہ سے بھی کم تھی۔ جی میں تو آئی کہ زور کا "کھنگورہ" مار کر پکاروں!

اوے نصر!

اور پھر بہ آوازِ بلند یہ مصرع اٹھاؤں ؎

نرگس کی آنکھ سے نہ تماشا کرے کوئی

مگر نصر اللہ اُدھر مجبور تھا اور ہم ادھر مجبور!

(کوہاٹ ۲ر اکتوبر)

کمیشن کچّا رہ گیا

خدا کو بھی وہی منظور ہوا، جس کا ہمیں خطرہ تھا۔ ہمارا کمیشن کچے کا کچّا رہ گیا۔ دراصل ہم اپنی خامیوں میں بہت پکّے ہو چکے تھے۔

لکھائی میں ہم چوکھے رہے۔ گفتگو کے بھی دھنی سمجھے گئے۔ ذہنی آزمائش میں سرخرو نکلے حالانکہ ہمارے کئی ساتھی اسی آزمائش میں کھیت ہو کر، اپنا بستر گول کر چکے تھے، مگر "گروپ

ٹاسک "د GROUP TASJK)ہمارا "واٹر لو" ثابت ہوا۔ ہمارا جسم ، ہماری امنگوں کا ساتھ نہ دے سکا۔ زیتون پر اگر ہم ایک طرف سے چڑھ گئے تو دوسری طرف اتر نہ سکے۔ رسی پکڑ کر جو علاقہ پھاندنا تھا ، وہ اُوپر سے اتنا دہشت ناک نظر آیا کہ اس کو دیکھ کر حواس کے علاوہ ہمارے ہاتھوں کے طوطے بھی اڑ گئے۔ بہ ہزار منت اپنے آپ کو رسہ پکڑ کر خلا میں جھولنے پر آمادہ کیا۔ رسہ تیسری کوشش میں ہاتھ آیا۔ ناکامی پہلی کوشش ہی میں واضح ہو گئی۔ نتیجہ تو بعد میں سنایا گیا۔ مگر نتیجہ ساتھ ساتھ نکلتا چلا آ رہا تھا۔

آدمی خود اپنی عدالت کے کٹہرے میں بھی تو کھڑا رہتا ہے۔

کوہاٹ میں کچھ وقت اچھا گزرا۔ بالخصوص پہلی شام کی وہ ہنسی تو مدتوں یاد رہے گی جب کھانے کے میز پر بیٹھنے سے پہلے کسی نے یہ ہوائی اڑا دی کہ خدمت گاروں کے بھیس میں "آئی۔ ایس۔ ایس۔ بی" کے بعض افسر ہماری حرکات و سکنات پر نگاہ رکھے ہوئے ہیں۔ ہم دوسری جنگِ عالمگیر میں بندوق سے زیادہ چھری کانٹا ہی استعمال کرتے رہے تھے۔ آج چھری کانٹا سنبھلنے میں نہیں آ رہا تھا۔

چھاؤنی صاف ستھری ہے۔ کلب میں شام کو خاصی چہل پہل تھی۔ کیپٹن سجاد حیدر شاہ اور کیپٹن زمان قریشی سے بھرپور بلکہ شرابور گپ شپ رہی۔ اندرونِ شہر کے تنگ بازار اور ملگجے ملگجے قہوہ خانے اپنی جداگانہ کشش رکھتے ہیں۔ لوگ سادہ صحت مند پاکستان سے پہلے تجارت تمام و کمال ہندوؤں کے ہاتھ میں تھی۔ اب مسلمان بھی ترازو تھامنے لگے ہیں۔ کیپٹن حیدر ایک روز چند میل تک شہر سے باہر لے گئے کوہستان کی سنگینی میں ایک عجیب عظمت کا احساس ہوا۔ یہ سوچ کر، دل میں ایک سنسنی سی بھی پیدا ہوئی کہ جن دنوں لارنس آف عریبیا ، میرن شاہ میں مقیم تھا ، تو وہ اسی سڑک پر آتا جاتا ہوگا۔

شہر میں ادبی سرگرمیوں کا خاصہ چرچا ہے۔ سید محمد[۶] شاہ برق یہیں رہتے ہیں۔ ایک

---

[۶] نامور شاعر احمد فراز کے والد

مشاعرے کا آوازہ بھی کان میں پڑا۔ پروفیسر شوکت واسطی پشاور سے آرہے تھے۔ ہمارے منہ میں پانی تو بہت بھر بھر آیا، لیکن بس پھڑ پھڑا کر رہ گئے۔

واپسی اسی مسافر گاڑی سے ہوئی مومن، ایک سوراخ سے دوسری مرتبہ ڈسا گیا۔ مومن کیا کرتا، ریلوے وارنٹ ہی اُسی گاڑی کا ملتا ہے۔ گندم بہم شود بھُس غنیمت است آتی مرتبہ امید کی ایک کو تو ساتھ ساتھ چل رہی تھی۔ واپسی پر باہر بھی ویرانی تھی اور اندر بھی اندر سے مُراد، ہمارا اپنا اندر — اپنا مَن، جس میں ڈوب کر آدمی سراغ زندگی پاتا ہے۔

(۶ اکتوبر ۱۹۴۸ء)

ہمیں جنرل ہیڈ کوارٹرز میں آرمی ایجوکیشن ڈائریکٹوریٹ میں رپورٹ کرنا تھا— کل گئے۔ دفاتر تو سندھ کے گورنر سر غلام حسین ہدایت اللہ کی وفات کے سوگ میں بند تھے، البتہ لیفٹیننٹ کرنل محمد خان (اُردو کے منفرد مزاح نگار) اور کرنل سید ماجد علی جعفری دفتر لگائے بیٹھے تھے۔ دونوں کی خدمت میں الگ الگ حاضری دی۔ دونوں کا مزاج مختلف پایا۔ ایک گرم دوسرا مرطوب۔ ایک پُر گو دوسرا کم سخن۔

معلوم ہوا ہمیں تین چار ہفتے "آرمی اسکول آف ایجوکیشن" (مری) میں "ٹک سے کوٹرا" اور "ٹپ سے پکوڑا" کرنا ہوگا۔

فقیر کے نوادر

بارش!— سردی یکا یک چمک اٹھی۔ گرم کپڑے جہلم پڑے ہیں، چند روز ٹھٹھرنا پڑے گا۔ شام کو کیپٹن امتیاز صوفی اور لیفٹیننٹ جان کے ہمراہ لمبی سیر رہی کوئی چھ سات میل تک کوہالہ روڈ پر نکل گئے۔ پہاڑ ہرے بھرے زندگی سوکھی ساکھی۔ جب اس پہلو پر نگاہ پڑتی ہے، تو مناظر— روح کو ڈسنے لگتے ہیں۔ بادل جھکے ہوئے تو تھے ہی واپسی پر چھلک بھی پڑے۔ درختوں تلے پناہ لیتے رہے، جیسے جنگ میں درختوں

کی آڑ پکڑتے تھے۔ بہر حال شرابور ہو کر رہے راستے میں سگنل کے میجر کازلٹ اور اس کی گڑیا سی میم بھی شرابور دیکھے۔ (اس وقت پاکستان آرمی میں انگریز افسر ابھی خاصی تعداد میں موجود تھے۔ کمانڈر انچیف بھی انگریز تھا) کازلٹ کا یونٹ گھڑیال کیمپ میں ہے۔ وہ جس وقت گھڑیال سے نکلے، موسم کا گھڑیال بارش کی منادی کر رہا تھا۔ مگر یہ لوگ تو بادل اور بارش میں اور زیادہ نٹ کھٹ ہو گئے۔ صوفی انگریزوں کا بڑا مزاج دان ہے۔ کازلٹ کی میم سے کہا۔

" REALLY WONDERFUL " وہ بولی " JUST LIKE HOME "

اڑٹو پہ پہنچے تو ہم "کازلٹوں" کو بھی اپنے میس میں لے آئے۔ بچاروں کو خالی چائے پر کرنل سکندر (کمانڈنٹ آرمی ایجوکیشن سکول) کا لیکچر سننا پڑا۔ لیکچر بھی اس دھندلے موضوع پر کہ پورا نظامِ کائنات انسانی حسیات کی گرفت میں آتا ہے یا نہیں۔ یعنی حقیقتوں کے پیچھے جو صداقت ہوتی ہے، اس کے مکمل ادراک میں عقل اور وجدان کا کتنا کتنا حصہ ہے۔ ایک کی سرحد کہاں شروع ہوتی ہے اور دوسرے کا علاقہ کہاں ختم ہوتا ہے کازلٹ بھی اندر سے ان پڑھ سارجنٹ تھا۔ تاہم وہ ڈسپلن میں بندھا بندھا بظاہر بڑی توجہ سے ساری بحث سنتا رہا۔

مسز کازلٹ کی بے چینی اللہ دیکھی نہ جاتی۔ جتنی دیر بیٹھی رہی، دانتوں سے اپنی انگلیوں کے لمبے لمبے ناخن کاٹتی رہی۔

(مری ۱۸ اکتوبر)

فقیر سید سراج الدین کے ہاں ایک پُر رونق شام گزری۔ فقیر صاحب مری تحصیل کے حاکم (ایس ڈی ایم) ہیں۔ ان کا تعلق لاہور کے تاریخی فقیر خاندان سے ہے جس کے مشاہیر میں سے فقیر سید عزیز الدین گزر چکے ہیں اور فقیر وحید الدین آج کل گزر رہے ہیں۔ تاریخی نوادرات کا بہت بڑا ذخیرہ لاہور کے فقیر خانے میں محفوظ ہے۔ کچھ نوادرات یہاں بھی فقیر سراج الدین کے پاس موجود ہیں۔ وہ بھی اتنے بہت سی کہ فقیر صاحب کو کم از کم

راولپنڈی کے کمشنر ہاؤس میں رہنا چاہیئے۔

چائے کے دَور کے بعد شاعری کا دوَر بھی ہوا۔ ن۔م راشد (اُن دنوں ریڈیو ترطرار کھل کے ڈائریکٹر)، خمار دہلوی، کرم حیدری تو تھے ہی۔ اتفاقاً کرنل مجید ملک اور مسعود بھی آ گئے۔ مسعود تو خیر "سامعین" تھا۔ البتہ کرنل مجید ملک شاعر ہیں یا یہ کہیئے کہ شاعر رہ چکے ہیں۔ جوانی میں بڑی جوان غزلیں لکھتے رہے۔ لاہور سے "کارواں" کے نام سے ایک شاندار ادبی رسالہ جاری کیا۔ جس میں تاثیر (ڈاکٹر محمد الدین) اور پطرس (پروفیسر احمد شاہ بخاری) ان کے دستِ راست تھے۔ ان سے یہ اصرار دو تین چیزیں سنیں بشمول

مگر اے حسینۂ نازنیں
مجھے تم سے عشق نہیں، نہیں

حاضرین میں ایک صاحب اتنے موٹے تھے کہ مصرع اٹھانے لگتے تو ان کا سانس پھول جاتا۔ معلوم ہوا کہ آپ مری کے ایس۔ ایچ او ہیں۔ سید ذوالفقار علی شاہ!! (۲۴ر اکتوبر)

کتنا فاصلہ طے ہوا؟

کل سے برف باری شروع ہے۔ پہلی تہہ ہنوز قائم تھی کہ ایک اور تہہ۔ بلکہ تہہ بہ تہہ میدان، درخت، مکان، پہاڑ ہر چیز سفید۔ ہماری بوڑھی خادمہ مائی مکھنی بالکل مکھن ہوئی جا رہی ہے۔ (۲۱ر دسمبر)

کرسمس پر جہلم شہر اور چھاؤنی میں خاص گہما گہمی دیکھنے میں آئی۔ چھاؤنی اور شہر کے گرجوں میں بڑی رونق تھی۔ دریا کنارے میلے کا سماں تھا۔ بس ایک کمی تھی۔ رائے صاحب لالہ کرشن لال کرسمس کے دن اپنی پرانی نستعلیق بگھی پر انگریز ڈپٹی کمشنر اور پولیس کپتان کے بنگلوں پر کرسمس کی ڈالی دینے جایا کرتے تھے۔ دونوں صاحبوں کے لئے ایک ٹوکری اور ایک گلدستہ نرگس کے پھولوں کا ہوتا تھا۔ ٹوکری کبھی کسی نے کھول کر نہ دیکھی۔ البتہ رائے

صاحب کے نوکروں کی روایت کے مطابق ٹوکری میں موسم کے میوے کے علاوہ سکاچ وسکی کی تین تین بوتلیں ہوتی تھیں۔ کرسمس تو اب بھی آتا ہے۔ میلہ بھی لگتا ہے۔ مگر نہ انگریز ڈپٹی کمشنر، نہ رائے صاحب کرشن لال۔ نہ شراب کی ڈالی۔ ان کے بارے میں مشہور ہے کہ کمشنر مسٹر کرپ کے زمانے میں جن کے نام پر شہر میں ایک مارکیٹ موجود ہے، رائے صاحبی کا خطاب ان کو پہلی بوتل پر ہی ارزانی ہوگیا تھا۔ یہ غالباً ۱۹۲۰ء کی بات ہے اس کے بعد رائے صاحب کم سے کم ڈیڑھ دو ہزار بوتل شراب ڈپٹی کمشنروں اور پولیس کپتانوں اور کمشنروں کو چڑھا چکے ہیں مگر رائے بہادری کا خطاب نہ مل سکا۔ پاکستان قائم ہوا تو رائے صاحب کا بیٹا بندرابن سہگل ایڈووکیٹ (جس نے موٹر خرید لی تھی)، یہ خاندانی بگھی رحمے کوچوان کو دے گیا۔ (بندرابن سہگل کرنال میں سیشن جج ہوئے۔)

(۲۵ر دسمبر)

۱۹۴۸ء کی آخری رات!

گاڑی سے مری جاتے ہوئے رات کی رات راولپنڈی میں بھائیا آغا سید محمد افضل شاہ صاحب کے ہاں رُک گیا ہوں۔ ہم تو اسلام کے لئے ٹھہرے تھے۔ آغاجی نے جانے ہی نہ دیا۔ حالانکہ چار چھ مہمان پہلے ٹھہرے ہوئے تھے۔ بھائیا کا مکان (وہ پرانے ہولی فیملی ہسپتال کے سامنے مری روڈ پر رہتے تھے)، راولپنڈی میں علاقہ دینہ کے معززین و محتاجین کے ہیڈ کوارٹر کی حیثیت رکھتا ہے۔ مردانے اور زنان خانے کے دو کمروں میں مہمانوں کی استراحت کے لئے مستقلاً چاندنی بچھی رہتی ہے۔ چارپائیاں اندر سے نکال نکال کر سڑک پر ڈھیر کر دی جاتی ہیں۔ بھائیا ملٹری فنانس کے محکمے میں اے، ایف، اے ہیں۔ گھر میں دو دو قسم کا سالن تیار ہوتا ہے۔ مہمانوں کے لئے آلو گوشت، آغاجی اور گھر والوں کے لئے دال۔ اپنی توفیق اور مکان کی گنجائش کے لحاظ سے آغاجی کو مہمانوں کی آمد پر اُلجھن ہونی چاہیئے۔ مگر اُلجھن اُن کو مہمان کے آنے پر

نہیں ہوتی، مہمان کے نہ آنے پر ہوتی ہے ۔ آغا جی ۔ واعظ بھی ہیں ۔ دینی جلسوں میں ان کی بڑی مانگ ہے ۔ اچھا کھانا عموماً جلسوں میں کھاتے ہیں ۔ گھر پر جتنے مہمان موجود ہوتے ہیں، رات کے کھانے کے بعد انہیں آغا جی کی اقتدا میں عشاء کی نماز بھی پڑھنا پڑتی ہے اور نماز کے بعد وعظ بھی سننا پڑتا ہے ۔

پچھلے سال ہم آج کی رات ملایا کے طلسمی شہر ملاکہ میں تھے ۔ کتنی ہنگامہ خیز، جاگتی رات تھی وہ صبح تک ایک طوفان رنگ کوچہ و بازار میں بیدار رہا ۔ ہوا کے جھونکے میں ایک نئے نغمے کا آہنگ یا کوئی تازہ چھناکا سنائی دیتا تھا ۔ ایک سال میں کتنا فاصلہ طے ہو گیا ؟

سردی اور شاعری

گورنمنٹ ہائی سکول مری کے ہیڈ ماسٹر مسٹر یزدانی عمر کے حساب سے تو ریٹائرمنٹ کے قریب ہیں ۔ مگر جوشِ عمل کے انداز سے ولولۂ تازہ کے مالک ہیں ۔ روشن خیال ۔ خوش گفتار ۔ ان کی دونوں صاحبزادیاں، جو شاید ایم ۔ اے پاس ہیں، سکول کی ادبی و تہذیبی سرگرمیوں کو تازہ دم رکھتے ہیں ۔ ان کی بڑی مدد کرتی ہیں، ہمارے ہاں اتنے علمی اور تہذیبی شعور کا پرنسپل بھی کم کم ملتا ہے ۔ یزدانی صاحب کی دلچسپی اور مستعدی کے باعث یہ مقامی مدرسہ شہر کا ایک نہایت مصروف ادبی مرکز بن گیا ہے ۔

آج اسکول کے ایوان میں "کشمیر فنڈ" کی اعانت میں ایک پُر رونق مشاعرہ ان کی سعی سے منعقد ہوا ۔ صدارت کا اعزاز مجھے بخشا گیا ۔ شعراء میں ن م راشد اور کرم حیدری اور خمار دہلوی تو خیر تھے ہی، کراچی سے ریڈیو پاکستان کے ڈپٹی کنٹرولر جنرل احمد سلمان صاحب (سابق جگل کشور مہرہ) دورے پر آئے ہوئے ہیں، ہم نے ان سے بھی ایک نظم پڑھوا لی حالانکہ عہد طالب علمی کے بعد سے وہ شعر گوئی سے تائب ہو چکے ہیں ۔

قاضی سعید صاحب[1] کے بارے میں بھی سنا کہ وہ دسویں جماعت تک شاعر رہ چکے ہیں۔ ان سے بہت کہا سنا مگر انہوں نے کچھ سنا کر نہ دیا۔

جب سے یہاں جاڑے نے قدم جمائے ہیں، شعراء کا قحط ہو گیا ہے۔ ورنہ مشاہیر مال روڈ پر ٹہلتے مل جاتے تھے۔ یہ اسی قحط کا کرشمہ تھا کہ ہم اس مشاعرے کی صدارت کر رہے تھے۔ قاضی سعید، رام نہ ہوئے، تو قاضی انعام (کیپٹن انعام اللہ قاضی) کام آ گئے۔ وہ بھی "اتفاقاً" کراچی سے یہیں ملنے آئے ہوئے ہیں۔ ایک قاضی نہ سہی، دوسرا قاضی سہی۔

؏ تو نہیں اور سہی، اور نہیں اور سہی

کیپٹن انعام قاضی کی رومانی نظم نے وہ سماں باندھا کہ مری کے آسمان پر بادل اور گہرے ہو گئے۔ سامعین میں مسٹر احمد سلمان کی صاحبزادی بھی موجود تھیں۔ جنہوں نے فلم "شاہ جہان" میں روحی کا کردار ادا کر کے، فلمی صنعت کو چونکا دیا ہے (مری ۳۱ اکتوبر)

دن کے ڈیڑھ بجے ہم لوگ لان میں کرسیاں بچھا کر کھانا کھا رہے تھے کہ کوہالہ کی سمت سے ایک طیارہ نمودار ہوا۔ طیارہ، جو بہت بلندی پر اڑ رہا تھا، مری پر ایک چکر کاٹ کر غائب ہو گیا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ یہ بھارتی طیارہ تھا۔ انڈیا کے ارادے نیک نہیں معلوم ہوتے ہم مشاعرے جمائے بیٹھے ہیں اور انڈیا کے طیارے ہمارے سروں پر منڈلا رہے ہیں۔

پنجاب کی وزارتی اتھل پتھل میں کچھ زیادہ ردوبدل نہیں ہوا۔ صرف شیخ کرامت علی کی جگہ چودھری فضل الٰہی[2] شامل کر لئے گئے ہیں۔ چودھری صاحب کھاریاں ضلع گجرات میں وکالت کرتے ہیں۔

سارا دن ایک فوجی بورڈ کے سلسلے میں "گلیات" کے معائنے میں گزرا۔ "گلیات" سے

---

[1] قاضی احمد سعید پاکستان براڈ کاسٹنگ کارپوریشن کے ڈائریکٹر جنرل ہوئے۔

[2] سابق صدر پاکستان یکم جون ۱۹۸۲ء کو انتقال ہوا۔

مراد ہے خیرا گلی، چھانگلہ گلی، گلھیرا گلی، گھوڑا گلی وغیرہ وغیرہ۔ آج دیکھا کہ انگریزوں نے ان پہاڑوں میں چھوٹی چھوٹی چھاؤنیاں آباد کر رکھی تھیں۔ گورے فوجی جہاں بھی رہتے ان کی میمیں اور بچے گرمیوں میں ان پہاڑی چھاؤنیوں میں سمٹ آتے۔ چھانگلہ گلی برف میں ڈھکی ہوئی تھی۔ باڑیاں کے قریب ایک فوجی ٹرک ہمارے دیکھتے دیکھتے کھڈ میں جا گرا ایک نوجوان ہلاک، دو جوان زخمی۔ دو تین گھنٹے ہمیں وہاں رکنا پڑا۔

ہمارا مشن گلیات کی بارکوں کی موجودہ حالت پر رپورٹ کرنا تھا۔ عمارتیں ابھی تو ٹھیک ٹھاک ہیں۔ ہاں اگر اسی طرح غیر آباد رہیں۔ تو بہت جلد ان کا حلیہ بگڑ جائے گا۔

؏ خانہ خالی را دیو می گیرد (۱۴ر نومبر)

گھڑیال کی منادی

آرمی سکول کا کورس ختم ہوا، تفریح بھی کی۔ کچھ سیکھا بھی۔ آدمی لحد تک سیکھتا ہے۔ ہر دوسرے آدمی سے سیکھتا ہے۔ میجر سردار خان چلتی پھرتی درس گاہ تھے کوئی کلمہ ان کا سبق سے خالی نہ ہوتا۔ کمانڈنٹ (کرنل سکندر خان)، کو قدرت نے یہ کمال بخش رکھا تھا کہ جو مسئلہ دفتری قواعد، افسری ضوابط سے حل نہ ہوتا وہ اسے روحانیت کے بل بوتے پر حل کر لیتے۔ عمل سے زیادہ عملیات کے کرشمے دیکھے۔ موسیقار ہاشمی، فلسفی سید خطیب واحدی، اور بذلہ سنج صوفی کو بھلا کون بھلا سکتا ہے؟ نذیر[1] سے گاڑھی دوستی ہوئی ہمیں گھڑیال میں پوسٹ کیا گیا ہے وہاں ہم سگنل یونٹوں کی تعلیم کی نگرانی کریں گے کلڈر بھی ہماری قلمرو میں ہو گا۔

کرنل جعفری (ڈائریکٹر صاحب) نے ٹیلیفون پر پوچھا تھا۔ "کیوں ٹھیک ہے نا؟"

---

[1] ریٹائرڈ بریگیڈیئر نذیر احمد (ڈائریکٹر آرمی ایجوکیشن)

ٹھیک تو کہاں تھا ؟ مگر ان کا اتنا پوچھ لینا بھی ان کی کرم نوازی تھی ۔

گھڑیال ہم کئی مرتبہ جا چکے تھے ۔ کیا معلوم تھا کہ یہ گھڑیال ایک دن ہمارے نام کی منادی دینے والا ہے ۔ ایک اطمینان ہے ۔ کہ سگنل یونٹ کے " او ۔ سی " (۵ ۔ ۵) میجر کازلٹ اور ان کی میم سے ہماری واقفیت ہے ۔

ہمارے اکمل صاحب کو اللہ نے آخر فرزند کی نعمتوں سے نواز دیا ۔ شادی پر دس برس گزر گئے تھے ، صاحبِ جائیداد گھرانہ ہے ۔ تشویش لاحق ہو چکی تھی کہ کہیں جائیداد وارثانِ بازگشت میں نہ گشت کرنے لگے ۔ ویسے یہ بات طے تھی کہ اگر اولاد ہوئی تو ہوگا فرزند ہی یہ روایت ان کے خاندان میں کم از کم پانچویں پشت سے چلی آتی ہے ۔ فرزند ضرور پیدا ہوتا ہے اور ایک ہی رہتا ہے ۔ ان کے ہاں گزشتہ پانچ نسلوں میں کسی فرزند نے آج تک اپنا دوسرا بھائی پیدا نہیں ہونے دیا ۔ اللہ بخشے ان کے والد کی ولادت پر ان کے دادا صاحب اپنی عمر طبعی تقریباً دوسری مرتبہ پوری کرنے والے تھے ۔

عقیقے کی رسم پر خوب دھوم دھڑکا ہوا ۔ ہم بھی حاضر تھے ۔ تقریبات میں ہیر رانجھے کے " سانگ " (OPERA) کے علاوہ نیزے بازی کا مظاہرہ بھی شامل تھا ۔ اور دور سے نامی شہسوار جمع کئے گئے ۔ نیزہ بازی کی فرمائش دراصل گاؤں کے ایک بزرگ کی تھی ۔ جو اپنی نئی خرید کردہ گھوڑی کا چرچا کرنا چاہتے تھے ۔ چرچا یہ ہوا کہ گھوڑی آدھے راستے میں بھیڑ کو چیر کر اپنے سابقہ مالک کے گاؤں کی طرف بھاگ نکلی ۔ گھوڑی کے گاؤں سے کچھ پہلے سوار کا گاؤں پڑتا تھا ۔ گھوڑی جب اس گاؤں کے نواح سے گزری تو سوار نے حفظِ ماتقدم کے طور پر وہیں گر جانا مناسب سمجھا کہ زمین ریتلی تھی ۔ کچھ آگے کانٹوں والے ایک تنگ باڑ دار راستے سے گزرنا پڑتا تھا ۔

ع بہ چرا کارے کند عاقل کہ باز آید پشیمانی

(۲۰ نومبر) (چک عبدالخالق)

یہ تو پاکستان کی برکت ہے، ورنہ...

ہم گھڑیال پہنچ گئے

یہاں پاکستان آرمی سگنل کا ٹریننگ سنٹر واقع ہے۔ پورا سنٹر نہیں، چند اجزا۔ پورا سنٹر تو شاید کسی "آرم" (ARM) کا کسی جگہ بھی موجود نہیں ہے۔ فوج ترتیب نو کے مرحلے سے گزر رہی ہے۔ جنگ کے زمانے میں ہم نے نئی یونٹیں کھڑی ہوتے دیکھی ہیں۔ اب ساری فوج ہی کھڑی ہو رہی ہے۔ جنوری تک ہم ملایا میں بیٹھے تھے۔ نہ جانے ہمارے بعد، پاکستان آرمی کے کتنے ٹروپس کیپ تک جنوب مشرقی ایشیا میں پڑے رہے۔ انگریزوں کے پاس ہمارے لئے "ٹماشن" تو تھا جہاز نہیں تھے۔ رائل ایئر فورس کے طیاروں کو گورا سپاہیوں کی بچھڑی ہوئی "گوریاں" ڈھونے سے فرصت نہ تھی۔ اس کیفیت میں ہماری ترتیب نو کے الجھے ہوئے دھاگے آہستہ آہستہ ہی سلجھیں گے۔

چند روز ہوئے راولپنڈی میں ڈاکٹر سعید صاحب (نامور طبیب، ممتاز شہری) کے ہاں شاہد حامد صاحب[9] سے ملاقات ہوگئی۔ وہ جنرل ہیڈ کوارٹرز میں غالباً ڈی۔ ایم۔ آئی (DMI) ہیں ہمارے لئے ایک بریگیڈیئر کے روبرو بیٹھ کر ان کی باتیں سننا ہی غنیمت تھا، ان سے ان کے منصب رینک وغیرہ کے بارے میں کیا سوالات کرتے یہ تو پاکستان کی برکات ہیں، کہ اپنے کرنل اور اپنے بریگیڈیئر نظر آنے لگے ہیں، اور ان سے نجی محفلوں اور عام گھروں میں، عام انسانی سطح پر میل جول کی صورت پیدا ہوگئی ہے۔ ورنہ ہمیں دو برسوں میں اپنے کرنل "ٹوبن سی۔ پی۔ ای" سے بس دو یا تین مرتبہ ہی یونٹ سے باہر شرف ملاقات حاصل ہوا تھا۔ ان میں سے بھی ایک ملاقات اس کیفیت میں ہوئی کہ

---

[9] ریٹائرڈ میجر جنرل سید شاہد حامد۔ مرکزی حکومت میں وزیر اطلاعات بھی رہے۔

موصوف موئنٹن بٹین کلب (سنگاپور) کے تالاب میں تیر رہے تھے اور ہم کنارے پر ملاکا کین (MALACA CANE) کے مونڈھوں پر بیٹھے تماشائے اہلِ کرم دیکھ رہے تھے۔

ڈاکٹر سعید کے ہاں بریگیڈیئر شاہد حامد کی گفتگو سے پاکستان آرمی کی تشکیل نو کے بارے میں کچھ روشنی ہمیں بھی حاصل ہو گئی۔ بلکہ چاہئے سے زیادہ ہی روشنی حاصل ہوئی۔ لُبِ لباب جس کا یہ تھا کہ ترتیب و تشکیل کا عمل کافی عرصے تک جاری رہے گا کہ ؎

آتی ہے اُردو زباں آتے آتے

ضمناً اس حیرت کا ذکر بھی کر دوں کہ بریگیڈیئر شاہد حامد جب انگریزی بولتے ہیں۔ تو اردو نہیں بولتے اور جب اُردو بولتے ہیں تو اتنی نستعلیق اردو بولتے ہیں کہ انگریزی ان کا منہ دیکھتی رہ جاتی ہے۔ حالانکہ آپ فیلڈ مارشل سر کلاڈ آکنلک کے ملٹری سیکرٹری رہ چکے ہیں۔

تشکیلِ نو کے اس ہنگامی مرحلے میں ہم سگنل یونٹوں کے افسر تعلیمات مقرر ہو کر گھوڑا گلی میں وارد ہو گئے ہیں۔ کلڈانہ (CULDANA) بھی ہماری عملداری میں ہو گا۔ ایک دستہ باڑیاں میں ہے ؎ ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں

گھوڑا گلی کے کمان آفیسر میجر کازلٹ سے ہم پہلے کوہالہ روڈ پر مل چکے ہیں۔ چھاجوں مینہ برس رہا تھا۔ میجر کازلٹ کی میم بھی ان کے ہمراہ تھی۔ بارش اور بالخصوص ژالہ باری کے باعث اس دبلی پتلی خاتون کی یہ حالت ہو رہی تھی جیسے انگریزی میں کہہ رہی ہو ؎

لینا کہ چلی میں !!

چنانچہ تھوڑی دور تک ان کا ایک بازو تھام کر چلنے کی "سعادت" ہمیں بھی حاصل رہی امید ہے کہ ان میاں بیوی سے یہ غیر رسمی تعارف گھوڑا گلی کے موجودہ رسمی رابطے میں کچھ کام آئے گا۔ اگرچہ تکیہ تو کام پر ہی رکھنا ہو گا۔ انگریز کی آنکھ ہی نیلی نہیں ہوتی وہ ان معنوں میں "طوطا چشم" بھی ہوتا ہے۔

کازلٹ کے علاوہ ایک اور انگریز افسر میجر گارڈن جونز بھی یہاں ہیں۔ پاکستانی افسر گوجر خاں

کے لیفٹیننٹ کریم اللہ اور بوچھال کلاں (چکوال) کے لیفٹیننٹ فیروز۔ گویا انگریزوں کی ریل پیل ہے۔ ہماری آمد سے، تعداد کے اعتبار سے، ہمارا پلہ بھاری ہو گیا۔ مگر پلہ تو اس کا بھاری ہوتا ہے جس کے ہاتھ میں اختیار کی باگ ہوتی ہے۔ میں نے کہیں پڑھا تھا کہ انگریزوں کے عہد حکومت میں ہندوستان بھر میں گورا سپاہیوں کی تعداد عموماً بیس ہزار سے زیادہ نہیں ہوتی تھی۔

(۲۸ نومبر ۱۹۴۸ء)

پرانی رات اور نیا سورج

۱۹۴۸ء کی آخری رات!

ہم نے یہ رات راولپنڈی میں گزاری۔ جہلم سے خاص طور پر یہاں پہنچے۔ سوچا تھا، کچھ ہما ہمی رہے گی۔ مگر یہ رات بھی دوسری عام راتوں کی طرح گذر گئی۔ گذشتہ برس ہمیں یہ شب ملایا کے طلسمی ساحلی شہر ملاکہ میں آئی تھی۔ کتنی جوان اور روشن رات تھی وہ ساری رات جاگتے گذری۔ ہر لمحہ زندگی کی ایک نئی رعنائی کی پیشکش لے کر آیا۔ پورا شہر، زندگی کے نئے سورج کا خیر مقدم کرنے کے لئے ساحلوں پر امنڈ آیا تھا۔ کلبوں اور ناچ گھروں میں تل دھرنے کی جگہ نہ تھی۔ جیسے یہ رات...... ایسی رات...... پھر کبھی نہ آئے گی۔ ؏

اک جوش تھا کہ محوِ تماشائے جوش تھا

ہم سے ایک غلطی یہ ہو گئی کہ ہم آغا جی (بھائی سید افضل شاہ صاحب) کے ہاں ٹھہر گئے۔ ان کے ہاں، حسب معمول، مہمانوں کا ٹھٹ لگ رہا تھا۔ چارپائیوں کا پل بندھا ہوا تھا۔ مہمانوں میں اپنے خاندان کے کئی ایسے بزرگ بھی شامل تھے جن کی زندگی میں اب نئے سال یا پرانے سال کا امتیاز باقی نہیں رہ گیا۔ ایک بزرگ کمشنر کی عدالت میں اپنا دیوانی مقدمہ لڑنے آئے تھے۔ ۱۸۶۰ء کے بندوبست اراضی کی "جمع بندیوں" اور "خسروں" کا ایک گٹھا ان کے ساتھ تھا۔ رات گئے تک، اندراجات کا لب لباب ہم سے پوچھتے رہے۔ کاغذات کا لب لباب تو ہماری سمجھ میں نہ آیا، البتہ ان بزرگ کا شجرہ نسب ازبر ہو گیا یہ نکتہ بھی سمجھ آ گیا کہ ؏

تن کی دولت چھاؤں ہے آتا ہے دھن جاتا ہے دھن

خدا کا شکر کہ اوپر سے ایک زندہ دل بزرگ پنشنر صوبیدار میجر سید فتح حیدر صاحب پہنچ گئے۔ صوبیدار میجر صاحب پہلی جنگ عظیم میں بھرتی ہوئے تھے دوسری میں ریٹائر ہوئے ہیں فوج کی نوکری میں ان کو مسلسل اتنا کام کرنا پڑا تھا کہ اب وہ مکمل آرام کرتے ہیں۔ گاؤں رچک عبدالخالق۔ ضلع جہلم میں رہتے ہیں۔ اخبار لگوا رکھا ہے جو ڈاک سے دوسرے یا تیسرے دن پہنچتا ہے۔ بہرحال اخبار اور حجامت میں ناغہ نہیں ہونے دیتے۔ ہفتے میں شہر جا کر ایک مرتبہ فلم دیکھنا بھی ان کا معمول ہے۔ خواہ اس کے لئے جہلم جانا پڑے یا راولپنڈی۔ آج اس "مشن" پر راولپنڈی آئے ہوئے تھے۔ دوسرے شو پر مجھے بھی پکڑ کر اپنے ساتھ لے گئے۔ اگر یہ بزرگ میری کمک پر نہ آتے تو پہلے بزرگ صبح تک مجھے کاغذات بندوبست کا لب لباب سنتے رہتے۔

ناولٹی سینما میں پنجابی فلم ..."چمن"..... چل رہی تھی۔ وہی دیکھی۔ ٹرارش تھا۔ ہنسی مذاق چوٹ۔ چلو سال کی آخری رات یا نئے سال کے پہلے دن کا کچھ احترام تو ہو گیا۔

١٩٤٩ء

١٩٤٩ء میں داخلہ

نیا سال مگر سورج وہی پرانا۔ بلکہ سورج تو آج نظر ہی نہیں آیا۔ آسمان پر بادلوں کی حکمرانی رہی۔ سورج آج سورج کے طور پر نہیں۔ محاورے کے طور پر موجود رہا بہرحال ہم نئے سال کے سورج کا خیر مقدم کر رہے ہیں دل کا تقاضا نہ سہی۔ رسم زمانہ سہی۔ انسان کو پُر امید رہنا چاہیئے۔ دریا کے دوسرے کنارے کا چراغ تو جلتا رہے۔

گزشتہ برس کچھ اچھا نہ رہا۔ خاص طور پر عالم اسلام کے لئے۔ جنگِ کشمیر شدت پر رہی۔ ۱۹۳۹-۴۵ء کی جنگ دوسروں کی جنگ تھی۔ یہ پہلی اپنی جنگ تھی۔ اپنی لڑائی میں جذبے اور تلوار کی حدت کی کیا کیفیت ہوتی ہے اس کا اندازہ ہمیں کشمیر کی جنگ سے ہوا۔ اقوام متحدہ کے بیچ بچاؤ کرنے پر آج رات کے ۱۲ بجے سے متعارکہ جنگ سو رہا ہے۔ عارضی جنگ بندی۔ توپیں خاموش ہو جائیں گی۔ مگر کیا دل بھی خاموش رہ سکیں گے۔ متعارکہ اور محاربہ میں ایک قدم کا بھی فاصلہ نہیں؟ بہرکیف یہ امن کی طرف ایک قدم ہے اور ہم امن پسند ہیں۔ اسلام، امن کا داعی ہے۔ ہمیں امن کی ضرورت بھی ہے ابھی تو آزادی کا پہلا سانس ہی لیا ہے۔

فلسطین میں قتل و غارت کا ہنگامہ اسی سال (۱۹۴۸ء) میں گرم ہوا۔ دسمبر کے آخر میں انڈونیشیا میں قیامت ٹوٹ گئی (تفصیل اس قیامت کی نہ ہنگامہ فلسطین کی ڈائری میں قلمبند نہیں کی گئی۔ ص،)

نوعِ انسانی کی کشتی ایک خوفناک گرداب میں چکراتی نظر آتی ہے۔ دیکھئے ڈوبتی ہے یا بچتی ہے۔ گزشتہ سال۔ ذاتی طور پر میری زندگی کا بڑا یادگار سال تھا۔ سنگِ میل سال میں نے پہلی مرتبہ اسی سال میں اپنے آزاد ملک کی زمین پر قدم رکھا۔ آزادی اور غلامی کی زندگی میں کیا فرق ہوتا ہے، اس کا لمس میری روح نے پہلی مرتبہ اسی سال محسوس کیا۔ یہ عجیب لمس ہے۔ آسائشیں گھٹ گئی ہیں۔ مگر حوصلہ بڑھ گیا ہے۔

(گھڑیال یکم جنوری ۱۹۴۹ء)

ایک نیا موڑ

آگ کی لڑائی تو بند ہوئی۔ اب برف کی جنگ جاری ہے۔ لاہور سے خان بہادر میاں احمد سعید صاحب کا ایک اور تار آگیا۔ میاں صاحب ڈاک اور تار کے محکمے کے ڈائریکٹر جنرل رہے ہیں۔ ڈاک سے زیادہ تار پر مدار رکھتے ہیں۔ آپ نے حال ہی میں لاہور سے ایک روزنامہ اخبار "غالب" کے نام سے جاری کیا ہے۔ آپ اخبار کے آگے ہیں، اور سر فیروز خان نون اخبار کے پیچھے۔ انہیں اخبار کے لئے ایڈیٹر کی ضرورت ہے۔ مولانا چراغ حسرت سے مشورہ کیا تو انہوں نے میرا نام تجویز کر دیا۔ اس پر خان بہادر صاحب نے پہلے تو مجھے خط لکھا۔ اب تار پہ تار چلے آرہے ہیں۔ ایک مرتبہ ٹیلی فون پر بھی بلوا کے گفتگو کر چکے ہیں۔ معاملے کے مبادی طے کرنا چاہتے ہیں (مبادیات اس لئے نہیں لکھا کہ علامہ تاجور نجیب آبادی کے نزدیک مبادی خود جمع ہے) خان بہادر صاحب آواز سے نہایت ملائم معلوم ہوئے۔ مگر بابا ٹیلی فون کی آواز کا کیا اعتبار۔

ایک عجیب ذہنی کشمکش سے دوچار ہوں۔ صحافت کو اپنی روح کے زیادہ قریب پاتا ہوں۔ مسعود کچھ کہتا ہے اور جاوید کچھ ع

جن پہ تکیہ تھا وہی پتے ہوا دینے لگے

مسعود کا کہنا ہے کہ اخبار ہو تو اپنا ہو۔ ورنہ وہ بھی ملازمت۔ ملازمت ہی کرنا پڑی تو

اپنی فوج میں خدمت سے بڑا کوئی اعزاز نہیں۔ مسعود کے ہونٹوں کے نیچے ظرافت کی ہلکی ہلکی لہر ہر وقت دوڑتی رہتی ہے۔ پنجابی میں اس نے کہا۔

"پیٹ نہ پیّیاں روٹیاں تے سبھے گلاں کھوٹیاں"

اردو میں مشورہ دیا۔

پیوستہ رہ شجر سے امید بہار رکھ

'امید بہار" سے اس کی مراد یہ ہے کہ اگر فوج میں تم "بندے دے پتّراں" کی طرح یعنی ٹھیک ٹھاک کام کرتے رہے تو لیفٹیننٹ کرنل تک اٹھ ہی جاؤ گے۔

"پاکستان میں اب انگریز تو آکر کرنل نہیں بنیں گے۔ انڈونیشیا میں بائیس برس کا جنرل نہیں دیکھا تم نے؟"

دوسری طرف جاوید خٹک صحافی کی زندگی کو شیر کی زندگی سمجھتا ہے۔ جو خواہ ایک دن کی بھی ہو تب بھی بہتر ہے۔ غلامی کی حیات جاویدان سے۔ جاوید، صحافت کے "گلیمر (GLAMOUR) پر جان دیتا ہے۔ مولانا چراغ حسن حسرت کی مثال دیتے ہوئے کہنے لگا۔ حسرت صاحب بیمار ہو کر میو ہسپتال میں داخل ہوئے تو نواب ممدوٹ اور ممتاز محمد خان دولتانہ ان کی عیادت کو پہنچے۔ کیا مجھے اور تمہیں ہسپتال میں ایسے ٹھاٹھ کی علالت نصیب ہو سکتی ہے؟ وی۔ آئی۔ پی "بننے کے لئے صحافت سے زیادہ تر یہ ہدف "شارٹ کٹ" اور کوئی نہیں پیارے جن کا فری۔ اور پھر تمہارا قلم کہ ع

اللہ کرے زور قلم اور زیادہ

ہم نے بھی فیصلہ کر لیا ہے کہ میاں محمد سعید صاحب کے تیور تو بالمشافہ دیکھ ہی آئیں

(گھڑیال ۶ر جنوری)

شہزادے کی مشقت

سنگاپور سے گزشتہ برس ٹھیک آج کے دن ہمارے جہاز نے لنگر اٹھایا تھا۔ تقریباً تین برس بعد، ہم ان جزیروں، ان ساحلوں، ان شہروں سے رخصت ہوئے تھے۔ ٹھیک ہی تو کہا تھا میں نے کسی سے کہ ع

اجنبی لشکر نہیں رکتے چلا جاؤں گا میں ہمارے جہاز کا نام "جارجیک" تھا "جارجیک" فوجی نہیں، "سول" جہاز تھا۔ زمانہ امن میں یورپ کے امیر لوگ عموماً اسی "لگژری جہاز" میں سمندروں اور ساحلوں کی سیاحت کیا کرتے تھے۔ جنگ چھڑی تو اس "شہزادے" کو بھی "لشکر برداری" کے کھردرے کام میں جوت لیا، گیا۔ گویا جس طرح کیمرج اور آکسفورڈ کے نرم و نازک چھوکروں کو، انگریز نے جبری طور پر فوج میں بھرتی کر لیا تھا، اسی طرح اس مرمریں بحری جہاز کو بھی فوجی خدمت میں تھپا لیا گیا تھا۔ اب یہ ہم جیسے سپاہیوں کو ڈھو رہا تھا۔ اور ـــــ کبھی ہم اس کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے تھے!!

آج دن بھر ہم پر جنوب مشرقی ایشیا کی یاد مسلط رہی۔ واقعات اور مناظر کی ایک فلم تھی جو گویا آنکھوں کے سامنے متحرک رہی۔ ہم نے اس خطے کو پانچ برس کی جنگ میں جھلستے ہوئے دیکھا تھا۔ زندگی اپنے مدار سے اکھڑی تھی۔ اس کے باوجود اگر آسودگی، حسن اور کشش کا یہ عالم تھا، تو سوچتا ہوں کہ آج کل سنگاپور اور جوگجاکرتا پینانگ اور بالی کا کیا عالم ہوگا۔ کیا کیا چہرے آج ذہن کے افق پر نہیں ابھرتے رہے ہم سمجھتے تھے یہ نقش شاید ہمیشہ کے لئے ماند ہو گئے تھے جس سورج کو پولو براتی کے جزیرے کے پیچھے غروب ہوتے چھوڑ آئے تھے۔ وہ ہمیشہ کے لئے ڈوب گیا تھا۔ معلوم ہوا سورج تو مشرق و مغرب کا پابند نہیں۔ روشنی قید نہیں کی جا سکتی۔ شاعری کی طرح روشنی کی بھی کوئی اکائی نہیں۔ یہ دونوں چیزیں دوسروں کے خلا کو بھرتی رہتی ہیں۔ کئی بار اختر شیرانی کے اس مصرعے کو دربادئے تصرف، بہ آوازِ بلند الاپنے کو جی چاہا ہے

پردیس سے آنے والے بتا

کس حال میں ہیں یارانِ چمن!

مگر اہلیہ کی "سخن فہمی" کے خوف سے دم سادھے رہے۔ اقبالؒ نے سچ کہا ہے کہ

؏ کبھی چھوڑی ہوئی منزل بھی یاد آتی ہے راہی کو

اور تو کچھ نہ ہوسکا۔ جاوید (کیپٹن جاوید خٹک) اور حسرت (مولانا چراغ حسن حسرت) کو خط لکھے۔ طویل خط سوچا۔ اسی طور ذرا عمرِ رفتہ کو آواز دے دیں۔ مجھے یقین ہے کہ خط پڑھ کر مولانا چراغ حسن حسرت کے دل میں بھی یادوں کے بے شمار چراغ جل اٹھیں گے اور جاوید تو بذاتِ خود یہاں پہنچ جائے گا کہ ؏

تو ہائے گل پکار میں چلاؤں ہائے دل

(گھڑیال ۔ ۷ جنوری)

کشمیر میں متارکۂ جنگ کے بعد یو۔ این۔ او کی قرارداد بھی منظرِ عام پر آ گئی استصواب رائے کی تجویز پیش کی گئی ہے یہ کوئی انصاف تو نہ ہوا۔ بہرحال موجودہ حالات میں یہ فیصلہ بھی غنیمت ہے۔ بشرطیکہ ہندوستان کی طرف سے اس فیصلے پر دیانتداری سے عمل ہوتا رہا۔ کامیابی کا بہت کچھ دارومدار اس شخص پر بھی ہوگا۔ جس کو اس مہم کا ناظمِ اعلیٰ مقرر کیا جائے گا۔

برف برسنے کے لئے تُلی کھڑی ہے۔ ٹمن کے کپتان احمد خان اور گوجر خان کے لیفٹیننٹ کریم اللہ کو رات کے کھانے پر بلا رکھا تھا۔ آج لحاف میں دبکے رہنے کا دن تھا۔ ان کے آجانے سے کچھ رونق ہوگئی کریم اللہ کے لطیفوں سے جوان کی پوٹھوہاری بولی میں دو آتشہ، سہ آتشہ ہوجاتے ہیں ہمارے دل کا آتش دان بھی چمک اٹھا، ورنہ صرف کوئلوں کا آتش دان ہی جلتا رہا۔

(۹ جنوری)

آپ کی ایڈیٹری سمجھ میں نہیں آتی!

صبح کو، روزنامہ "غالب" کے دفتر گئے۔ شام کو "مغلوب" ہو کر واپس آئے۔

غالب کا دفتر مال روڈ کی ایک کشادہ عمارت کی دوسری منزل میں واقع ہے

سردی ہو یا گرمی، کرنل سر شیر محمد خان صبح چار بجے اٹھ جاتے ہیں اور سات بجے صبح تک "پہلی شیو" "پہلے اخبار" اور "پہلے ناشتے" سے فارغ ہو کر چار میل کی سیر پر نکل کھڑے ہوتے ہیں۔ ہم اس "پیدل مارچ" سے بچنے کے لئے اپنے طور پر کچھ گھوم کر دس بجے "غالب" کے دفتر پہنچ گئے یوں بھی عمر

سینۂ شمشیر سے باہر تھا دم شمشیر کا

ہمیں اس بات کا تو اندازہ تھا کہ روزنامہ اخبار کا دفتر صبح دس بجے نہیں لگتا۔ مگر ہمیں فی الحال "اداریہ" سے نہیں، انتظامیہ سے ملنا تھا۔ مدیرِ مسئول محمد افضل خان (جو "غالب" کے علاوہ ہفتہ وار "مسلم راجپوت" کے بھی مدیر مسئول تھے) کو "تار" دے رکھا تھا کرنل صاحب کا ٹیلی فون خراب تھا ورنہ خان بہادر صاحب "پبلی کیشنز لمیٹڈ کے ڈائریکٹر جنرل" سے بھی رابطہ قائم کر لیتے۔ بہرحال دفتر بھائیں بھائیں کر رہا تھا۔ ایک چوکیدار کمبل کی "بُکل مارے" چارپائی پر بیٹھا، چائے چسک رہا تھا۔ ہم بھی اس کے پاس بیٹھ گئے۔ اپنی آمد کے سرسری سے ذکر کے بعد پوچھا۔

"افضل صاحب کس وقت آئیں گے" "جی آتے ہی ہوں گے"۔ چوکیدار نے دوسرے ہاتھ سے پاس ہی تیل کے روشن چولہے پر رکھی کیتلی سے چائے کا ایک "مگ" انڈیلتے ہوئے کہا "آپ اتنے میں چائے پیجیے"۔

"خان بہادر صاحب کس وقت آتے ہیں"، ہم نے پوچھا "جی وہ بادشاہ لوک ہیں۔ ڈاک خانوں کے حاکم رہے ہیں۔ زیادہ کام ہرکاروں سے لیتے ہیں۔ اخبار ٹیلی فون پر

چلا رہے ہیں۔ ہفتے میں ایک آدھ دفعہ آتے ہیں۔

چوکیدار دلچسپ شخص معلوم ہوا۔ نہ حسن۔ محلوں کی میراث ہے نہ شگفتگی کسی طبقے کی جاگیر ہم نے نام پوچھا تو انہوں نے نام کے علاوہ کام مقام وغیرہ سب کچھ بتا دیا"

"نام؟۔ جی میں سابق سپاہی ہوں۔ جس مگ میں آپ چائے پی رہے ہیں۔ یہ مانڈلے۔ سے میرے ساتھ ساتھ آرہا ہے "یونٹ میں" نائیکی کرتا تھا۔ یہاں رات کو چوکیدار رہتا ہوں۔ دن کو چپراسی۔ یہ سمجھیئے جی کہ اس "یونٹ میں اوپر بھی خان بہادر ہے۔ اور نیچے بھی خان بہادر۔"

نکتہ یہ ہاتھ آیا کہ چوکیدار کا نام خان بہادر تھا ضلع جہلم محمد خانوں۔ بہادر خانوں اور خان بہادروں کا ہی تو ضلع تھا۔

"میرا تعلق بھی ضلع جہلم سے ہے"۔ ہم سے رہا نہ گیا۔ بلکہ یہ تک بتا دیا کہ ہم پاکستان آرمی میں کپتان ہیں۔ ابھی حاضر نوکری پر ہیں۔ اور "غالب" کی چیف ایڈیٹری کے خواہشمند ہیں

یہ سنتے ہی سابق نائیک خان بہادر۔ حاضر کپتان کے لئے ایک کرسی کھینچ لایا۔

"سرجی آپ یہاں تشریف رکھو"

پھر بولا۔

سرجی! گستاخی معاف! آپ کا کپتان ہونا تو سمجھ میں آتا ہے۔ لیکن جی۔ فوج اور جہلم کے ناطے سے آپ کی ایڈیٹری سمجھ میں نہیں آتی۔ یہ لوگ تو اور طرح کے لوگ ہوتے ہیں نائک خان بہادر ہمیں کچھ اس طرح تک رہا تھا، جیسے اسے ہماری کپتانی پر یقین نہ آرہا ہو۔

ایک کھلا دفتر سارے کا سارا ہمارے سامنے کھلا پڑا تھا۔ "دیوان حام"۔ بھائیں بھائیں کر رہا تھا۔ ایک کونے میں ایک چھوٹا سا لکڑی کا "کیبن" تھا۔ برآمدے کے حاشیے سے لگا ہوا۔ چوکیدار کا ڈیرہ۔ عقب میں خوشنویسوں کے تختے ذرا ہٹ کر دو مستطیل میز تھے جن کے

گرد چند کرسیاں کھڑی تھیں ۔ بان بان کی ایک گہری جھلنگی چارپائی بھی ایک جگہ پڑی تھی خاصہ مایوس کن منظر تھا ۔

"کیبن میں کون بیٹھتا ہے"

"خان بہادر صاحب ۔ جبھی تو وہ دفتر میں بیٹھتے ہی نہیں" ۔ سر آیئے نا میں آپ کو دفتر کا ایک "راؤنڈ کرا دوں" ۔

ہم چل پڑے اور دو چار قدم ہی میں ہم ایسی ہوائیں اڑنے لگے گویا سچ مچ کسی یونٹ کا کمان افسر کوارٹر گارڈ کا معائنہ کر رہا ہو ۔

"یہ چارپائی یہاں کیوں پڑی ہے" ۔ ہم نے جھلنگا چارپائی کے بارے میں پوچھا ۔

چوکیدار (بلکہ نانک) بولا ۔ سر! اس پر ہمارے موجودہ چیف ایڈیٹر شبلی صاحب (عبدالرحیم شبلی بی کام) بیٹھ کر لکھتے ہیں ۔"

"سر وہ دراصل لیٹ کر لکھتے ہیں" چوکیدار نے وضاحت کی ہے ۔

"لکھتے وقت جھولتے رہتے ہوں گے" ۔ (ہم اس وقت تک شبلی صاحب سے نہیں ملے تھے ۔ ص) ، نانک خان بہادر اب تک ہمارے چہرے پہ آزردگی کی پرچھائیاں غالباً جانپ گیا تھا ۔ بولا ۔

"سر جی میں تو کہوں گا کہ اگر فوج آپ کو نہیں نکال رہی تو آپ اس جگہ مت آئیں یہ اخبار مجھے تو نکلتا نظر نہیں آتا ۔ تین مہینے اسے نکلے نہیں ہوتے اور عملے کو تنخواہ نہیں مل رہی ۔"

آثار واقعی اچھے نہ تھے ۔ اچانک خیال آیا کہ اخبار کے پیچھے ملک فیروز خان نون بھی تو بتائے گئے تھے ۔ ہم نے پوچھا :

ملک سر فیروز خان نون دفتر آتے ہیں تو کہاں بیٹھتے ہیں ۔

نانک خان بہادر نے یہ نام کبھی سنا ہی نہیں تھا ۔ ہم سمجھ گئے کہ ملک صاحب اخبار

کے بہت پیچھے ہوں گے۔ جیساکہ جنوب مشرقی ایشیا میں جنرل سر مائلز ڈیمپسے ہمارے پیچھے ہوتے تھے۔ یعنی ہم ملایا میں ہوتے تو وہ برما میں ہوتے۔"

اتنے میں برآمدے سے کسی نے بارعب آواز میں پکارا۔

"خان بہادر!"

روزنامہ "غالب" کے مدیر مسئول۔ محمد افضل خان صاحب تشریف لے آئے تھے۔

(لاہور ۱۴ر جنوری)

چار سگریٹ بجھے اور لیکچر ختم ہو گیا!

کل رات کھانے پر جس میں حکومتِ پنجاب کے افسر آبادکاری میاں اقبال احمد بھی موجود تھے، میں نے "غالب" کا معاملہ کرنل صاحب (سر شیر محمد خان) کے سامنے رکھا۔ "بڑی ذہنی کش مکش سے دوچار ہوں۔ دیوانہ بنوں یا نہ بنوں؟ آپ ہندوستان کے وائسرائے کو مشورے دیتے رہے ہیں۔ گول میز کانفرنس سے ہو آئے ہیں۔ مجھے بتائیے کہ میں فوج چھوڑ کر اخباری دنیا میں آؤں یا نہ آؤں؟"

کرنل صاحب نے اپنی آواز کے جلی لہجے میں ایک موٹی سی "نو" (NO) فضا میں اچھال دی۔ بولے "پاکستان بن گیا ہے۔ آپ لوگوں پر ترقی کا دروازہ نہیں، ترقی کا درہ خیبر کھل گیا ہے۔ اب وہ کیفیت نہ ہو گی کہ شیر محمد خان کو سر تو بنا دیا جائے، مگر رہے وہ کپتان ہی۔"

انہوں نے کہا: "خان بہادر میاں احمد سعید ایک ممتاز خاندان سے تعلق رکھتے ہیں، بارسوخ ہیں، وضع دار ہیں، مگر صحافت تو اب ایک کارخانہ بنتی جا رہی ہے۔ پھر فرداً فرداً صحافیوں کی جتنی کچھ حالت میری نظر میں ہے۔ کچھ اچھی نہیں ہے۔"

میاں اقبال نے بھی نفی میں گردن ہلائی۔ البتہ سر شیر کے نوعمر بیٹے طارق کمال نے اپنا سارا وزن صحافتی زندگی کے حق میں ڈال دیا، حالانکہ ان کی رائے کسی نے

پوچھی ہی نہیں تھی۔ "شاہ ہوریں جس طرح کے فوجی ہیں۔ یہ فوج میں بھی شاید ہی ترقی کرسکیں اخباروں میں چمکتے ہیں۔ (طارق کمال آج کل پاکستان بحریہ میں ٹی۔ کے خان کے نام سے معروف ہیں اور ریئر ایڈمرل کے منصب پر فائز ہیں۔ (بعد میں وہ پاکستان بحریہ کے سربراہ ہوئے)

یہ تو شام کی بات تھی شام ہماری مولانا چراغ حسن حسرت (سندباد جہازی) کے ساتھ بھیگی اور ستارۂ سحری کی نمود تک جگتی چلی گئی۔ اتفاقاً ٹونی ریٹائرڈ لیفٹننٹ کرنل جاوید خٹک مردان) بھی لاہور میں موجود تھا۔ ہم تینوں دیر تک سنگاپور کے روز و شب (زیادہ تر شبوں) کی یاد تازہ کرتے رہے۔

"غالب" کا ذکر گفتگو میں غالب رہا۔ حسرت صاحب فوج کی وردی اتار کر صحافت کے سمندر میں اُترتے ہوئے تھے (روزنامہ امروز) مجھے بھی کہا" میاں تم دراصل اسی پانی کی مچھلی ہو، اپنے پانی میں آجاؤ۔ چیف ایڈیٹری کے رموز میں تمہیں خود سکھا دوں گا۔ رہا مشاعرہ تو تم شعر گا کر پڑھتے ہو، مشاعروں سے بھی کچھ پیدا کرلو گے۔ ریڈیو پر محمود نظامی اپنا بالکا ہے۔ وہ جہاں اور چیر قناتیوں کو پروگرام دیتا ہے، تمہیں کیوں نہ دے گا۔ کچھ کام ترجمے کا شیخ غلام علی سے (ناشر کتب) میں لے دوں گا۔ اگر سچ کا ساتھ دیتے رہے، تو جو اطمینان صحافت میں محسوس کرو گے، ملازمت میں کبھی حاصل نہ ہو گا۔"

مولانا کا لیکچر تین چار سگرٹوں کے جل بجھنے کے بعد ختم ہوا۔

ٹونی خود صحافت کے سمندر میں کودنے کے لئے بے چین تھا۔ اس کی پہلی آرزو فلم سازی تھی اور دوسری آرزو صحافت۔ اس نے ترغیب دی کہ میں یہیں سے جنرل ہیڈکوارٹر میں ملٹری سیکرٹری کو بذریعہ تار استعفےٰ بھیج دوں۔ وہ سنگاپور میں (۱۹۴۶ء) اس طرح کا ایک بذریعہ تار استعفےٰ دے کر کچھ مدت وہاں انگریزی کا ایک ہفت روزہ اخبار ـــ "سنگم" کے عنوان سے نکال چکا تھا۔ اب بھی اس نے نہ صرف میرے استعفےٰ کا مضمون ڈرافٹ کر دیا بلکہ اپنا استعفےٰ بھی لکھ دیا۔ کہنے لگا" مجھے غالب اپنا ڈپٹی بنا لو"۔ (جنوری)

چاندتیس کو ہوا؟

اخبارات میں آج کل ایشیائی ملکوں کی کانفرنس کا بڑا چرچا ہے۔ یہ کانفرنس انڈونیشیا کے مسئلے (انڈونیشیا کی آزادی ہی کا مسئلہ ہوگا۔) پر غور کرنے کے لئے جواہر لال نہرو نے طلب کی ہے دیکھیئے اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے۔ ہندوستان ایشیائی ملکوں کی قیادت کا جتن کر رہا ہے اصولی بات یہ ہے کہ مشرق کو بھی اپنے پاؤں پر کھڑا ہونا چاہیئے۔ اگر مجلس اقوام متحدہ کے اندر کوئی ایشیائی بلاک ہی قائم ہو جائے تو یہ بھی بڑی بات ہوگی۔ مگر جن ممالک کے مفاد امریکہ سے وابستہ ہیں وہ ایسا کب ہونے دیں گے۔ بہر حال یہ مشرق کو ایک محاذ پر جمع کرنے کی کوشش ہے کاش یہ کانفرنس پاکستان نے بلائی ہوتی۔

(۱۰ / جنوری ۱۹۴۹ء)

رات کے دس بجے سندھ ایکسپریس سے لاہور پہنچا۔ کرنل شیر محمد خان آخر سیاست دان ہیں۔ سکونت کا ایک ٹھکانہ صوبائی دارالحکومت میں بھی رکھتے ہیں گزشتہ کچھ عرصہ سے تو لگاتار یہیں مقیم ہیں کہ حکومتِ پنجاب نے سابق فوجیوں کی بہبود کا محکمہ ان کے سپرد کر رکھا ہے۔ یہ کوئی باقاعدہ ملازمت نہیں۔ ایک قسم کی اعزازی عہدہ ہے۔

کرنل صاحب کو اپنی آمد کا تار بھیج دیا تھا انہوں نے ازراہ مہربانی موٹر ریلوے سٹیشن پر بھجوادی اچھا ہی ہوا۔ کرنل صاحب نمبر ۴ گولڈن روڈ پر رہتے ہیں۔ میں نے اس سے پہلے کبھی اس سڑک کا نام نہیں سنا تھا۔ نہ اس کے محلِ وقوع کا کوئی اندازہ تھا۔

گولڈن روڈ بیرونی لاہور کی پرانی سڑکوں میں سے ہے۔ کشادہ کوٹھی ہے جتنی باہر ہے اتنی ہی اندر ہے جتنی پرانی سڑک ہے اتنی ہی پرانی یہ کوٹھی ہے۔ سڑک کے رخ پر کثرتِ استعمال سے عمارت کا یہ حال ہے کہ ؏

گر صبح کو ہے تو شام نہیں

چنانچہ ہم پیچھے سے ہو کر اندر پہنچے، عمارت کا پچھلا حصہ نسبتاً بہتر صورت میں ہے۔ پیچھے جاتے ہوئے پہلے کرنل صاحب کی بھینس اور گھوڑی سے ملاقات ہوئی بھینس کے بغیر تو کرنل صاحب نہ معلوم مصر میں کیوں کر رہے۔ البتہ گھوڑی پر تعجب ہوا گھوڑی اب وہ جہلم میں بھی نہیں رکھتے۔ گھوڑی کا چلن اب ان کے آبائی گاؤں دومیلی میں بھی کم ہو گیا تھا۔ ہم نے عرض کیا۔

"سر جی! یہ گھوڑی کس سلسلے میں ہے کیا اسمبلی کے بعد اب کہیں نواب سر مہر شاہ صاحب سے گھڑ دوڑ کے میدان میں بھی مقابلے کی تو نہیں ٹھان لی؟"

ہنس کر بولے: "نہیں محض رونق کے لئے" رونق کی انہیں واقعی ضرورت بھی ہے لاہور میں اکیلے رہتے ہیں۔ بچے جہلم ہوتے ہیں آج کل طارق میاں چند دنوں کے لئے آئے ہوئے ہیں۔

یوں کرنل صاحب کی کوٹھی کے باہر اگر بھینس گھوڑی کی رونق ہے تو اندر اخبارات و رسائل کی کثرت کے باعث گہما گہمی ہے۔ نئے پرانے اخباروں کا ایک انبار میری خواب گاہ کے ایک کونے میں پڑا ہے اس انبار میں سے خواجہ حسن نظامی کے مشہور اخبار منادی کا ایک پرچہ مل گیا۔ اس میں ۱۵؍ جون ۱۹۴۲ء کا ان کا روزنامچہ شامل ہے۔ کچھ اقتباسات تبرک اور رہنمائی کے طور پر اپنی ڈائری میں محفوظ کر رہا ہوں لکھتے ہیں۔

چاند آج ہوا

حیدر آباد دکن سے مولوی علی الدین احمد صاحب ناظم الامور مذہبی کا تار آیا ہے کہ ۲۹ رکو چاند نظر نہیں آیا دہلی میں بھی آج تیس کو چاند ہوا۔

پروفیسر عبدالرحیم

کلکتہ سے مشہور کانگرسی لیڈر پروفیسر عبدالرحیم صاحب ملنے آئے تھے۔ انہوں نے اپنی لڑکیوں کی اردو نظمیں بھی سنائیں۔ تجارتی ذوق بھی رکھتے ہیں اور بڑے بڑے عہدوں پہ

بھی رہ چکے ہیں

پروفیسر ورما

ہندو کالج دہلی کے پروفیسر انند ناتھ صاحب ورما بھی ملنے آئے تھے میں نے ان دونوں استادوں کو آپس میں ملایا اور بحیثیت ایک ناچیز شاگرد کے ان کی باتیں سنیں ۔

سناٹا

"آج میری بستی میں اور درگاہ میں سناٹا ہے" کہاں تک نقل کروں. اللہ اللہ کتنی سادہ دلکش تحریر ہے ایک ہم ہیں کہ شسٹم پشٹم ڈائری کے صفحات کالے کرتے چلے جاتے ہیں ۔

(۱۲ر جنوری)

دونوں آپس میں خوب کھیلتے ہیں

شیخوپورہ میں بھائی صاحب (سید شبیر حسین شاہ مجسٹریٹ) کے ہاں پڑاؤ رہا ۔ پڑاؤ اس لئے کہ وہ خود فیروز والا میں پڑاؤ کر رہے تھے ۔ انہیں مہینے میں پندرہ دن دورے پر رہنا پڑتا ہے تاکہ مقدمات کی سماعت متاثرین کے گھروں کے قریب ہو سکے ۔ لوگوں کو ضلع کے صدر مقام میں "خراب خجل" نہ ہونا پڑے ۔ تھوڑے بہت "خراب خجل" تو وہ بہر حال ہونگے کچہری صدر مقام پر ہو یا کسی ڈاک بنگلے میں ، اس کا "تام جھام" تو وہی رہے گا ۔ وہی مثل کہ

کہا ہم اونٹ پر جائیں
کہا تم اونٹ پر جاؤ
کہا کوہان کا ڈر ہے
کہا کوہان تو ہو گا

کچہریوں کا کوہان تو بہر حال ہو گا ۔

بھائی صاحب کو کتا پالنے کا شوق کبھی نہیں رہا ، مگر آج کل ایک ولایتی نسل "کا جیبی سائز"

کا کُتّا پال رکھا ہے۔ نام جو عزیزی عزیزہ کی زبانی مجھ تک پہنچا "ٹریسی" ہے۔ کُتّا بھی انگریزی، نام بھی انگریزی۔ گویا بھائی صاحب بھی انگریزوں سے انتقام لینے لگے۔ ننھے شبیر (آج کل آسٹریلیا میں ڈاکٹر شبیر حیدر) اور ٹریسی کی بڑی دوستی ہے۔ دونوں آپس میں خوب کھیلتے ہیں۔ اخلاق کا مظاہرہ کسی سطح پر بھی ہوا، براہ راست دل کو متاثر کرتا ہے ہاں خیال آیا کہ جب بھائی صاحب نے موٹر خرید لی ہے، تو کُتا کیوں نہ پالتے۔ موٹر اور کتے کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ حیرت ہے کہ وہ موٹر لے گئے اور کُتا چھوڑ گئے۔ موٹر بھی ٹھیک مگر کتّے کے بغیر صاحب بہادروں کا "سازو یراق" پورا نہیں ہو سکتا۔

بھائی صاحب کی موٹر۔ (چھوٹی سی مارس۔ سات ہزار میں خریدی) ہمارے خاندان (بلکہ ہمارے گاؤں) کی پہلی موٹر ہے گویا ہم گھوڑی اور گھوڑے تانگے سے گزر کر موٹر کے زمانے میں داخل ہو گئے۔ افسوس کہ ہم آج اپنی موٹر کا جھوٹا نہ لے سکے۔ ورنہ "ہرن منار" دیکھ آتے جہاں جہانگیر بادشاہ ہرن کا شکار کھیلنے آتا تھا۔ شکار کے ساتھ "کھیل" کا لفظ کچھ عجیب معلوم ہوتا ہے۔ وہی بات کہ ؏

کسی کی جان گئی آپ کی ادا ٹھہری

(۱۵ر جنوری)

مشہور و معروف چھتری

کرنل سر شیر محمد خان کا خط آیا۔ خط تو ان کے آتے ہی رہتے ہیں کہ دوسروں کے خطوں کا جواب وہ ضرور دیتے ہیں، مگر یہ بہت قابلِ ذکر خط ہے میں نے اپنے خط میں لکھا کہ فیلڈ مارشل سر کلاڈ آکنلک کی آٹھویں فوج افریقہ میں ناکام ہوئی، تو اس کے معنی یہ ہیں کہ آکنلک ناکام رہے۔ میں جانتا تھا کہ آکنلک ان کا چہیتا جرنیل ہے۔ چنانچہ آج ان کا طویل خط ملا۔ خط انگریزی میں لکھا ہے اور ٹائپ میں بھیجا ہے ورنہ وہ عموماً

اردو میں چند سطری خط لکھتے ہیں۔ السلام علیکم کے بعد مطلب کی بات اور والسلام۔ وہ اس بات کو مانتے ہی نہیں کہ آکنلک ناکام رہا۔ ان کا کہنا ہے کہ ان کو انتہائی نامساعد حالات میں کمان ملی اور چونکہ وہ برٹش انڈین آرمی سے تعلق رکھتے تھے اس لئے ان کو برٹش آرمی کے سینئر افسروں کے حسد کا نشانہ بھی بننا پڑا۔ کرنل صاحب کے نزدیک ویول اور آکنلک جنگ عالمگیر دوم کے زیرک ترین جرنیل تھے۔ "کامیابی" کے معروف مفہوم میں وہ کامیاب اس لئے نہ ہو سکے کہ برطانیہ جنگ کے لئے تیار ہی نہیں تھا۔ جیسا کہ اس کا معمول رہا کہ جنگ کے ابتدائی مرحلوں میں وہ کبھی تیار نہیں پایا گیا۔ جنگ نے برطانیہ کو ہمیشہ اچانک آلیا۔ جنگ نے پکڑا تو اس نے تیاری پکڑی۔ اور پھر ایسے عزم حوصلے استقامت کا مظاہرہ کیا کہ دنیا حیران رہ گئی۔ سر شیر لکھتے ہیں "تاریخ میں اکثر دیکھا کہ برطانیہ جب جنگ ہارنے لگتا ہے تو جنگ کا پانسہ کامیابی کی طرف پلٹ جاتا ہے۔ اس لئے مبصرینِ جنگ کا یہ قول مشہور ہے کہ برطانیہ معرکے (BATTLES) ہارتا ہے جنگ (WAR) جیتتا ہے۔ اس جنگ میں بھی یہی ہوا۔ برطانیہ جنگ کے لئے تیار نہ تھا۔ وزیر اعظم چیمبرلین اپنی مشہور معروف چھتری لئے جرمنی کے ایڈولف ہٹلر کے سامنے صلح کے لئے گڑگڑا رہے تھے۔ عملاً ہاتھ جوڑ رہے تھے کہ یہاں کیوں لڑتے ہو، ناحق خون خرابہ ہوگا۔ لڑنا ہی ہے تو روس سے لڑو جو ہمارا مشترکہ دشمن ہے مگر جنگ ٹل نہ سکی۔ اور جنگ چھڑ گئی تو برطانیہ کے پاؤں تلے زمین نہ تھی۔ شمالی افریقہ میں جنرل ویول کے پاس تھا کیا؟ مٹھی بھر مقامی ملیشیا۔ جیسے ہمارے رینجرز ہیں بس ویسے، بلکہ تربیت اور اسلحہ میں ان سے بھی کمتر۔ یہ سمجھو کہ پولیس کو بین الاقوامی جنگ میں جھونک دیا۔ اتنے میں ادھر ہندوستان سے یونٹ پہنچنے لگے، بمشکل ایک بریگیڈ ایک یونٹ ایک ریاست کا تھا۔ خوف زدہ، سہما ہوا مصر اور سوڈان اندر خانے مخالف گویا محاذ جنگ پیچھے سے بھی غیر محفوظ، مقابل میں اٹلی کا شہرہ آفاق، سپہ سالار مارشل گرزیانی۔ لشکر اس کا لاکھوں کی تعداد میں، ٹڈی دل۔ ویول کی جگہ کوئی اور سپہ سالار

ہوتا، تو ہتھیار ڈال دیتا۔ آکنلک کو بھی انہی معذوریوں کا سامنا تھا۔ اس کی کمان ایران تک پھیلی ہوئی تھی۔ فوج کم، اسلحہ کم بھی ناقص بھی۔ ہم نے ایسے ٹینک دیکھے کہ جن کو گھسیٹ کر لانا پڑتا تھا۔ ٹین کے صندوق، خود اپنے سپاہیوں کے لئے موت کے پھندے۔ آکنلک اگر رومیل کو طبروق میں نہ روکتا، تو تاریخ عالم کا رخ تبدیل ہو جاتا۔ تاریخ بدلتی ہے تو جغرافیہ بھی بدل جاتا ہے۔ وچی، (آٹھویں فوج کے کمان دار جنرل سر نیل رچی)، کو وہ کمان سے کیوں ہٹاتا۔ ماتحت کماندار کی صلاحیت کا فیصلہ اس کا سپہ سالار ہی کر سکتا ہے نہ کہ سات سمندر پار بیٹھا ہوا وزیر اعظم خواہ وہ چرچل ہی کیوں نہ ہو۔

(۲۰ جنوری)

نرم گوشے کو سختی سے دبائے رکھا

کلڈنہ میں جوانوں کی ترقی کا امتحان لیا۔ ہم ممتحنِ اعلیٰ ہیں۔ امتحان لیتے اور امتحان لینے اور امتحان دینے میں زمین و آسمان کا فرق ہوتا ہے آج ہم ان کے چہروں پہ ہوائیاں اڑتے دیکھ رہے ہیں۔ جن دنوں ہم امتحان دیتے تھے اسی قسم کی ہوائیاں ہمارے چہروں پر اڑا کرتی تھیں۔ سوچا جائے تو امتحان لینا بھی امتحان دینا ہی ہے آج ہی ایک جوان نے (نام سلیمان)، مجھے بتایا کہ وہ ہمارے گاؤں کے قریب موضع ساگری کا رہنے والا ہے۔ اور چک عبدالخالق سکول میں میرے پھوپھی زاد بھائی ریاض (سید ریاض حسین جعفری ڈپٹی کمشنر)، کا شاگرد ہے۔ اس پر میرے دل میں اس کے لئے ایک نرم گوشہ ضرور پیدا ہوا۔ میں امتحان کے دوران "راؤنڈ" کرتے ہوئے جوانوں کے پرچوں پر بھی نظر ڈالتا جاتا ہوں۔ سلیمان کو برما کے دارالحکومت کا نام ہی معلوم نہ تھا۔ میں نے اپنے دل کے "نرم گوشے" کو سختی سے دبائے رکھا کہ یہی میرا فرض تھا اور سچ پوچھیے تو میرا امتحان بھی۔ سلیمان برما کی لڑائی سے تو کامیاب واپس آگیا مگر آج

"رنگون" کے ہاتھوں مارا گیا۔ (۲۱ جنوری)

علامہ اقبالؒ نے کہا تھا

گراں خواب چینی سنبھلنے لگے

ہمالہ کے چشمے اُبلنے لگے

یہ چشموں کا رخ چین کی طرف طوفان کی شکل اختیار کر رہا ہے۔ چین ایک مدت سے خانہ جنگی کی آگ میں جل رہا ہے، تازہ خبروں سے معلوم ہوتا ہے کہ خانہ جنگی فیصلہ کن مرحلے میں داخل ہو گئی ہے چیانگ کائی شیک کا چین دم توڑتا دکھائی دیتا تھا۔ جنرل اسمو (چیانگ کائی شیک)، نے کمیونسٹوں کے سامنے غیر مشروط صلح کی پیش کردی ہے

(۲۱ جنوری)

آج ن۔م راشد سے (ریڈیو آزاد کشمیر کے ڈائریکٹر)، سے لمبی نشست رہی۔ ان کے ہاں کیپٹن ممتاز ملک سے بھی ملاقات ہو گئی۔ کہ وہ بھی آج کل اسی ریڈیو سٹیشن سے وابستہ ہیں۔ ممتاز ملک جنگِ عالمگیر میں تعلقاتِ عامہ میں تھے۔ غائبانہ تعارف ان سے تھا مگر یہ بغداد اور کانڈو میں رہے۔

ن۔م راشد اپنی نظم "مری کی ویراں کشید گاہیں" سنا رہے تھے کہ اوپر سے اچانک ابوالاثر حضرت حفیظ جالندھری ایک فوجی جیپ میں سوار تشریف لے آئے۔ بریگیڈیئر دائی این۔ اے والے، حبیب الرحمٰن ان کے ساتھ ساتھ تھے۔ کچھ دن "محاذ" پر رہ کر اب واپس لاہور جا رہے ہیں۔ بریگیڈیئر نوشیروان خان کے تغیر رسمی اسلوبِ جنگ کے طلسمی واقعات کوئی حفیظ صاحب سے سُنے۔ خود بھی مرتے مرتے بچے۔ ریڈیو سٹیشن سے اپنی قومی نظمیں ریکارڈ کرا رہے ہیں۔ کہاں تو پہلے ہم "مری کی ویراں کشید گاہیں" سن رہے تھے۔ کہاں اب مری کی فضا حفیظ صاحب کے نغمے سے گونجتی رہے گی۔

مجاہدانِ تیغ زن۔ بڑھے چلو بڑھے چلو (۲۳ جنوری)

جو ہونا ہے، وہ تو ہو گا

لاہور سے خان بہادر میاں احمد سعید کا تار آیا۔ یہ تیسرا تار ہے۔ گویا انہوں نے تاروں کا تار باندھ دیا۔ کیوں نہ ہو آخر ڈاک اور تار کے محکمے کے سربراہ تھے۔ تار اور ٹیلیفون کے عادی رہے ہیں۔ خط لکھنا ان کے لئے بار ہے۔ بات بھی مختصر کرتے ہیں۔ لاہور کی ملاقات میں قائداعظمؒ کی بات آگئی، تو انہوں نے ایک واقعہ بیان کیا تھا۔ سب سے لمبی بات انہوں نے مجھ سے ہی کی۔ ۱۹۴۷ء میں حکومت سے آئینی مذاکرات ہو رہے تھے ایک مرحلے میں لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے پنڈت جواہر لال نہرو، سردار پٹیل، قائداعظمؒ اور بلدیو سنگھ کو بلوا کر کسی فارمولے پر ان کی رضامندی حاصل کرنا چاہی۔ دوسرے ہندوستانی لیڈروں نے تھوڑی دیر میں اپنا تحریری جواب وائسرائے کو بھجوا دیا۔ پنڈت نہرو اس وقت کانگرس کے صدر تھے۔ قائداعظمؒ مسلم لیگ کے صدر مگر ہمارے قائداعظمؒ نے کہا مجھے امید ہے کہ میں مسلم لیگ کی ورکنگ کمیٹی سے تو اس فارمولے کی منظوری حاصل کر لوں گا مگر قطعی منظوری تو مسلم لیگ کی کونسل ہی دے گی۔ اس پر وائسرائے کبیدہ خاطر بلکہ اپنے مزاج کے مطابق کچھ گرم سرد بھی ہوا۔ مگر قائداعظمؒ برطانوی سامراج کی گرمی سردی کو کبھی خاطر میں نہ لائے سچائی اور اصول کی قیمت پر انہوں نے کبھی سمجھوتہ نہ کیا۔ چنانچہ انہوں نے وائسرائے کو ترکی بہ ترکی اسی لہجے میں یہ مختصر سا جواب دیا'' WHAT MUST BE, MUST BE. '' (یعنی جو ہونا ہے وہ تو ہو گا)۔

آج ان کا تار آیا تو مجھے یہ واقعہ یاد آگیا۔ سیاسیات میں خان بہادر صاحب کی معلومات اخبارات سے زیادہ عموماً سینہ بہ سینہ کے سرچشمے میں بہتی بہتی اُن تک آتی ہیں۔ سیاست کا ایک بہت بڑا دریا، تو میاں سر فضل حسین کی شخصیت میں خود ان کے خاندان میں موجود تھا۔ ان کے وسیلے سے خان بہادر صاحب کو اندر کی جن باتوں کا علم

ہے اسے کاش کبھی وہ لکھ بھی جائیں۔ مگر میرا قیاس ہے کہ وہ لکھنے کے کھڑاگ میں نہیں پڑیں گے۔ البتہ ان سے کوئی املا لینے والا ہو، تو یہ تاریخ کا ایک دور املا کر دیں۔ ان کے بیٹے خیر سے بہت لائق فائق نوجوان ہیں، مگر وہ خود بڑے بڑے سرکاری منصبوں کے راستے میں، اونچی اونچی کرسیوں کی طرف بھاگے چلے جا رہے ہیں۔

میں میاں احمد سعید صاحب کے مزاج اور ان کی زندگی کے پسِ منظر کے بارے میں سوچتا ہوں تو بعض اوقات ڈر بھی لگتا ہے کہ اخبار (روزنامہ غالب لاہور)، میں ان کے ساتھ کام کرنا کہیں مشکل ہی نہ ہو جائے۔ موقف سخت ہو، الفاظ نرم رہیں۔ ان توقعات پر کون پورا اترے گا؟ اخبار ہر روز کیسے نکل سکے گا کہ ضلعی وقائع نگار تو کسی بکری کی وفات کی خبر پر بھی دو دو صفحات لکھ بھیجتے ہیں (۲۵ جنوری)

دل خوش بھی ہے، اداس بھی

رات یونٹ میں بڑا کھانا تھا۔ کھانا بڑا بھی تھا اور بہت بھی۔ کھانے کے بعد جوانوں نے ایک ہلکا پھلکا تفریحی پروگرام پیش کیا۔ ایک تمثیل میں میجر کا نلٹ (افسر کمانڈنگ) اور اس کی میم کے درمیان ایک دلچسپ مکالمہ سنایا گیا۔ انگریزی اور اردو کی ایسی کھچڑی بنائی گئی کہ کا نلٹ بھی بیچ کی بات سمجھ گیا۔ بلکہ اس کی میم بھی جو ایک بے حد پرکشش خاتون ہیں۔ میں نے پہلی مرتبہ کسی فرنگی عورت کو مشرقی لڑکیوں کے مانند شرماتے ہوئے دیکھا۔ کانوں تک سرخ ہو گئی۔ جوالدار امین نے کمال کیا۔ کمال کرنا ہی تھا۔ اعظم کی نوجی دل خوش سبھا کا منجھا ہوا اداکار تھا۔ جنگ کے زمانے میں شہباز خان کے محکمے میں بھی رہ چکا ہے۔ مختصر یہ کہ ایک دلچسپ شام تھی۔ مگر صرف اس قدر ہے کہ بہت مختصر تھی۔ شاید ہر خوش گوار چیز مختصر ہوتی ہے، جیسے جوانی۔ یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ کوئی چیز بھی خواہ وہ کتنی خوش آئند کیوں نہ ہو اگر ضرورت سے زیادہ طویل ہو جائے تو اپنی کشش کھو

دیتی ہے۔ نپولین نے ٹھیک کہا تھا کہ جرنیلوں کو اپنے جوانوں سے کبھی کبھی کھانے پر ملنا چاہیئے یعنی ان کے ساتھ کھانا تناول کرنا چاہیئے۔ آج کی تقریب میں قربتوں کا سماں دیکھنے بلکہ محسوس کرنے کے لائق تھا۔

(گھڑیاں۔ ۲۹ جنوری)

شام ن۔م راشد اور قاضی احمد سعید بیوی بچوں کے ہمراہ ہمارے ہاں آ گئے۔ ان کے آتے ہی طوفانِ برف و باراں بھی آ گیا۔ ہمارے لئے رونق کی گھڑیاں دوچند ہو گئیں راشد سے کئی نظمیں سنیں۔ آج کل "مری کی ویران کشیدگاہیں" اس کی شاعری کا چہیتا موضوع ہے "بلینک ورس" کو یاد رکھنا آسان نہیں۔ مگر راشد نے آج کئی نظمیں یادداشت ہی سے سنائیں۔ قاضی احمد سعید نے بھی مزے مزے کے اشعار سنائے، دوسروں ہی کے سہی۔ راشد کا بیٹا شہریار بہت چلبلا نکل رہا ہے۔ (۳۰ جنوری)

آج شام ریڈیو سٹیشن پر ن م راشد کے ہاں محفل رہی آغا بابر اور اعجاز بٹالوی بھی تھے اور کیپٹن ممتاز ملک بھی۔ باہر موسم کی شدید برف باری، اندر موسم کی لطیف ترین خوش گفتاری اعجاز بٹالوی کے لطیفے گویا مصری کی ڈلیاں رات واپس آتے ہوئے پاؤں کو پاؤں نہیں سوجھ رہا تھا۔ (۳۱ جنوری)

والد صاحب قبلہ کی برسی کا دن۔ اس دن ہم سب اکٹھے ہوتے ہیں حسبِ معمول قرآن خوانی ہوئی۔ مساکین کو کھانا کھلایا۔ شفقت و محبت کے اس پیکر کو ہماری نگاہوں سے اوجھل ہوئے۔ چھ برس ہو گئے۔ بھائی بشیر نے موٹر خریدی ہے۔ یہ ہمارے خاندان میں پہلی موٹر ہے ہم گھوڑے سے اتر کر موٹر پر آ گئے۔ دل خوش بھی ہے اور اداس بھی۔ والد صاحب قبلہ موٹر دیکھتے تو کتنے خوش ہوتے۔ مگر وہ زندہ ہوتے تو اتنی فضول خرچی کرنے ہی کاہے کو دیتے۔ (۱۰ فروری)

روزنامہ "غالب" میں چیف ایڈیٹری کا پہلا دن عملۂ ادارت میں میدانِ صحافت

کے کرنیل جرنیل بھرے پڑے ہیں۔ مثلاً مولانا نصر اللہ خان عزیز، شوکت تھانوی، اصغر حسین خان نظیر، شبلی بی کام ۔ "ان اجنہ" سے میں کیا کام لے سکتا ہوں۔ میرے لئے تو یہ خود بڑا اعزاز ہے کہ مجھے ان کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملا ہے۔ شمس، اختر عکسی اور صدیقی سے کوئی بات کرسکوں۔ غنیمت ہے کہ مولانا نصر اللہ خان عزیز اور شوکت تھانوی اپنے اپنے گھر سے شذرے اور کالم لکھ کر بھیج دیتے ہیں۔ اخبار "مدینہ" بجنور میں مولانا عزیز صاحب کے مضامین پڑھ پڑھ کر تو ہم نے لکھنا سیکھا تھا۔

شام ۔ کافی ہاؤس میں مولانا چراغ حسن حسرت اور فیض احمد فیض کے ساتھ گزری۔ ان کی طرح اب ہم نے بھی "وردی" اتار دی۔ مگر ان کی طرح کہاں؟ مولانا صلاح الدین احمد۔ (ایڈیٹر ادبی دنیا) سے بھی ملاقات ہوئی۔ یہ بھی ہمارے ادبی گرو ہیں۔ ان کو پیر یوں کیا دیا ؤں کو ہاتھ لگائے (۱۲ر فروری)

ملازمت کیوں کر رہے ہیں؟

روزنامہ "غالب" نے ہمیں تو مغلوب کرلیا۔ دن بھر جتا رہا۔ اگر یہ ادارت ہے تو پھر زندگی غارت سمجھیے۔ کام میں جتے رہنے سے "ہمیں" دحشت نہیں۔ فوج میں ہم محنت ہی کے عادی رہے ہیں مگر فوج کی وجہ سے بعض عادات بھی راسخ ہو چکی ہیں، مثلاً ضابطے کی پابندی صفائی، ترتیب، سلجھاؤ وغیرہ۔ یہاں ان میں سے کوئی چیز بھی موجود نہیں۔

فوجی اخبارات میں لکھتے لکھتے ہم آسان زبان لکھنے کے عادی ہو گئے۔ یہاں فقرے سے فقرہ نکلتا بلکہ فقرے میں فقرہ پھنسا چلا جاتا ہے۔ ایک سطر کی بات چھ سطر میں۔ بیرکار "لسی رڑکتے" چلے جاتا اور "لسی" بھی بہت گاڑھی۔ اخبارات کی زبان سلیس ہونی چاہیئے۔ ملک میں خواندگی کی شرح کتنی ہے؟ سلاست کی ایک اپنی دلکشی ہے، حسن زیور کا محتاج نہیں۔ حمید نظامی (مدیر نوائے وقت)، نے اگر ادائیے کی روایتی پرشکوہ زبان کے "بل" نکال

دیئے ہیں، تو کیا اب تحریر دلوں کو جذب نہیں کرتی؟ مقصد قاری تک رسائی ہے۔

شام کو مولانا صلاح الدین احمد صاحب (مدیر "ادبی دنیا") نے مال روڈ کے کافی ہاؤس میں چائے پر مدعو کر رکھا تھا پہلے انہوں نے ٹیلی فون کیا۔ پھر بہ نفس نفیس عصا ٹیکتے خود تشریف لے آئے۔ ہم سے ہمارے احباب خاص کی اس شرط کے ساتھ کہ وہ ادب سے دلچسپی رکھتے ہوں، فہرست پوچھی۔ گرمی ہو یا سردی، سر پہ ہمیشہ انگریزی ہیٹ رکھتے ہیں، شفقت اور وضع داری کے ایسے پیکر اب ہمارے معاشرے میں تیزی سے ناپید ہوتے جا رہے ہیں۔ چائے پر کئی احباب دیرینہ سے ملاقات ہو گئی۔ عبدالسلام خورشید عبداللہ بٹ، اکبر ملک اور کئی اور عبداللہ بٹ کے لطائف کا آبشار جاری رہا۔ مولانا بولتے کم ہیں سنتے زیادہ ہیں۔ مگر جو فقرہ بھی کہا۔ موتیوں میں تولنے کے لائق تھا۔

بھائی جان (سید بشیر حسین شاہ) کے ایک رفیق کار مجسٹریٹ سردار صاحب لاہور آئے ہوئے تھے۔ بھائی جان نے ان سے کہا کہ واپسی پر وہ مجھے اپنی موٹر میں شیخوپورہ لیتے آئیں۔ وہ آ گئے۔ میں آ گیا۔

سردار صاحب سے پہلی مرتبہ ملا۔ آپ بڑے زمینداروں کے ایک ممتاز خاندان کے فرد ہیں۔ جتنی لمبی موٹر ان کے پاس ہے، اس ٹھاٹھ کی موٹر وزیروں کے پاس بھی کیا ہو گی۔ ایک مسلح باڈی گارڈ ہر وقت ساتھ رہتا ہے۔ مجھے بھائی جان کے ہاں اترنا تھا۔ سردار صاحب سیدھے اپنی کوٹھی لے گئے۔ جہاں آٹھ دس افراد برآمدے میں بیٹھے حقہ پی رہے تھے۔ ان میں سے دو سفارشی ذیل دار صاحبان نکلے اور باقی ان کے ذاتی خدمت گار تھے۔ جن میں سے ایک کے ہاتھ پر ایک "شکرا" بیٹھا ہوا تھا۔ جس وقت ہم داخل ہوئے ایک چھوٹی موٹر میں چار کتے شام کی ہوا خوری کے لئے کوٹھی سے باہر نکل رہے تھے۔ ان کے ٹھاٹھ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ آخر یہ ملازمت کیوں کر رہے ہیں۔ چار چھ مجسٹریٹوں کو تو یہ ملازم رکھ سکتے ہیں۔ مگر وہ تنخواہ کے لئے نہیں "جاہ" کے لئے ملازمت کر رہے تھے۔

جیسے انگریزوں کے زمانے کی فوج میں کرنل علی نون اور کرنل ہمت سنگھ جی وغیرہ ہوتے تھے کہ وردی بھی اپنی اور گھوڑا بھی اپنا۔

شکار کا شوق کئی پشتوں سے سردار صاحب کے خاندان میں چلا آرہا ہے۔ ذاتی طور پر ان کو پرندے مرغوب ہیں۔ حصار سے اٹک تک پنجاب کے چھ سات اضلاع میں نوکری (یعنی نوابی) کر چکے ہیں۔ ہر علاقے کے مخصوص پرندے ان کے گھر میں دیکھ لو۔ مُردہ بھی اور زندہ بھی۔ مجسٹریٹ کی حیثیت سے انہوں نے اتنے مجرموں کو قید نہیں کیا ہوگا۔ جتنے پرندے قید کئے ہیں۔

سردار صاحب طبعاً بھی خوش باش ہیں۔ آج غیر معمولی طور پر بھی خوش تھے۔ لاہور سے خبر لائے تھے کہ ان کی سروس کے تین ڈپٹی کمشنر "ڈی موٹ" ہو رہے ہیں۔ ان میں سے اگر کوئی ایک بھی "ڈی موٹ" ہوا، تو سردار صاحب "پروموٹ" ہوں گے۔ گویا ڈپٹی کمشنری سامنے آ گئی تھی ع

گن رہے تھے دن اسی دن کے لئے

آپ کا سروس ریکارڈ بے حد شاندار ہے۔ شکار کھیلنے کھلانے والے افسروں کا سروس ریکارڈ ہمیشہ شاندار ہوتا ہے۔ رشوت دے سکتے ہیں۔ رشوت لینے کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ پنجاب کے گورنر سر ایون جنکنز جاتے جاتے ان کو ایک محبت بھرا ذاتی خط لکھ گئے تھے۔ کچھ عجب نہیں کہ لاہور کے گورنمنٹ ہاؤس سے پنجاب کے آخری انگریز گورنر کی یہ آخری چٹھی ہو جو اس نے اپنے کسی دیسی ماتحت کو لکھی ہو۔ گورنر کی انگریزی کا اردو مفہوم ایک مشہور شعر میں اس طرح نکلتا ہے۔

بُلبُل نے آشیانہ چمن سے اٹھا لیا
اپنی بلا سے بوم بسے یا ہما رہے

(۱۳ سے ۲۸ فروری)

کپتان کی وردی اور مشاعرہ

فوج میں ہم صحافیوں کو گھماتے پھرلتے تھے۔ اب حکومت ہماری سیاحت کا انتظام کرتی ہے پنجاب سرکار تھل کے ریگستان کو شاداب کر رہی ہے ظفرالحسن لاری اس منصوبے کے منصرم ہیں، ان کی نگرانی پر مسٹر اختر حسین فنانشل ناظم امور ہیں۔

مجھے اور پاکستان ٹائمز کے میاں محمد شفیع (میم شین) صاحب کو اس پروجیکٹ کو دیکھنے کی دعوت دی گئی۔ ہم لوگ کل میانوالی پہنچے۔ اختر حسین اور ظفرالحسن ساتھ تھے۔ میانوالی میں ڈپٹی کمشنر صاحبزادہ منظفر احمد کے پاس ٹھہرے۔ آج دن بھر پروجیکٹ کا دورہ رہا۔ دیکھے بغیر یقین نہ آتا کہ کتنا کام ہو چکا ہے اور کتنے نامساعد حالات میں کام ہوا ہے۔ ظفرالحسن کی لگن اور مستعدی قابل ستائش ہے۔ اسی ریگستان کا دامن کھیتوں، باغوں سے بھر جائے گا۔ بستیاں اس کی خالی وسعت میں ابھر آئیں گی تو لوگ ظفرالحسن کو یاد کریں گے۔ ظفرالحسن اور میاں شفیع کے لطائف نے سفر کو بہت شاداب رکھا۔ اختر حسین صاحب لئے دیئے رہتے ہیں۔ ویسے شعر وادب سے گہرا شغف رکھتے ہیں فیروزپور میں ڈپٹی کمشنر تھے تو ایک مرتبہ ہم نے بھی کپتان کی وردی میں وہاں ایک مشاعرہ ان کی صدارت میں پڑھا تھا۔

غالب سے مایوس ہو کر ہم نے راولپنڈی سے اپنا اخبار نکالنے کا فیصلہ کر لیا۔ آج صبح ڈپٹی کمشنر راولپنڈی کی عدالت میں ڈیکلریشن کے کاغذات داخل کر دیئے ہیں۔ قاضی احمد شفیع ان دنوں یہاں ایڈیشنل ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ ہیں کیمبل پور کالج میں مجھ سے ایک دو برس آگے ہوتے تھے۔ ٹینس کھیلنے میں پورے پنجاب میں مشہور تھے۔ ایک مرتبہ تو ایک ٹورنامنٹ میں دہلی تک فتح کر آئے۔ ادبی سرگرمیوں میں بھی پیش پیش ہوتے پروفیسر الیش کمار کے چہیتے شاگردوں میں سے تھے۔ ان کی وجہ سے ہمارا کام ہاتھوں ہاتھ ہوگیا کاغذات داخل تو ہو گئے۔ اب لاہور سے باہر نکلیں گے اس سے پہلے یہ کاغذات مسعود کے تعاقب میں گوجرانوالہ اور میری تلاش میں جہلم جائیں گے۔ کیپٹن انعام قاضی کا انبالہ ہی ہندوستان

میں رہ گیا۔ ورنہ کاغذات انبالہ بھی جاتے، ۔ چلئے بات تو چلی۔ مسعود اور زرین بھابھی نے کاغذات کے داخلے پر ہی کوئی سو روپے آج شام۔ شورز ہوٹل میں جشن منانے پر خرچ کر دیئے کرنل شہباز خان بھی تھے۔ راولپنڈی کے احباب میں سے کرنل شہباز ہمارے سرگرم معاونین میں سے ہیں اس طرح خان بہادر قاضی نذیر احمد ایڈووکیٹ بھی۔ اور اہل قلم میں سے عزیز ملک اور کرم حیدری جنرل نذیر احمد صاحب نے بھی امداد کا وعدہ کیا ہے خریدار دیں گے۔

اخبار کے لئے کسی موزوں مقام پر دفتر کے لئے ڈپٹی کمشنر بحالیات سردار کریم نواز خان سے ملنے گئے وہ مری گئے ہوئے تھے۔ ان سے توقع تو ہے کہ مدد کریں گے۔ ادب سے دلچسپی رکھتے ہیں طالب علمی کے زمانے میں اختر شیرانی کے پاس بیٹھا کرتے تھے۔ دفتر میں بھی دیکھا کہ "دیوانِ غالب" ریک میں پڑا تھا۔ ورنہ کہاں کمشنر بحالیات اور کہاں دیوانِ غالب۔

غالب کی دہلیز پر

محمد افضل خان صاحب کے ہاتھ میں دو چرمی تھیلے تھے۔ (ایک غالباً "غالب" کا دوسرا "مسلم راجپوت" اخبار کا)۔ مجھے دیکھتے ہی انہوں نے تھیلے زمین پر رکھ کر مجھے پکڑ لیا۔ یہ محبت کا "جپھا" تھا۔ کیبن کی چابی انہی کے پاس رہتی تھی۔ کیبن کھول کر مجھے اندر بٹھاتے ہوئے بولے "جی آیاں نوں"

افضل صاحب سے میں ایک مرتبہ پہلے بھی مل چکا تھا یہ ۱۹۳۶ء کی بات ہے ہمارے ایک عزیز بھائیا محمد انور شاہ وطن اسلامیہ ہائی سکول لاہور میں استاد تھے افضل صاحب سے ان کی یاری تھی گرمی کی تعطیلات میں افضل صاحب بھائیا انور شاہ سے ملنے ہمارے گاؤں تشریف لائے اور تین روز مقیم رہے۔ نام یاد نہیں رہا۔ اس وقت بھی آپ کوئی اخبار نکالتے تھے جس کی خریداری کی مہم میں آپ قریہ قریہ گھوم رہے تھے۔ گفتگو کا متاثر کن سلیقہ رکھتے

تھے اور دوڑ دھوپ میں ان کی استقامت مثالی تھی لگتا تھا کہ یہ کسی دن ضرور بڑے منصوبے میں ہاتھ ڈال دیں گے۔ سو، اب ایک روزنامہ اخبار ان کے ہاتھ میں تھا۔

افضل صاحب نے نائک خان بہادر کو چائے لانے کے لئے نیچے چار اسٹار ڈ بلیو اسٹار ہوٹل" میں بھیجا (" غالب" کے بند ہوتے ہی یہ ہوٹل بھی بند ہو گیا) اور اخبار کا تازہ پرچہ سامنے پھیلا کر اس کے شاندار امکانات پہ گلابی گلابی روشنی ڈالنے لگے۔ عملۂ ادارت عبدالرحیم شبلی، شوکت تھانوی، شمس ملک، اصغر حسین خان، نظیر لدھیانوی، افضل صدیقی اور (احمد بشیر کے حسین و جمیل جوان مرگ بھائی) اختر عکسی پر مشتمل تھا۔ اداریہ شبلی لکھتے اور مزاحیہ کالم (جس کا عنوان "سخن گسترانہ" تھا) شوکت تھانوی لکھتے تھے۔ مولانا نصراللہ خان عزیز بھی اداریہ لکھتے ہیں" ۔ کیا بات ہے کہ دفتر پہ بہت ویرانی برس رہی ہے" میں معاملے بندی کی طرف آ گیا۔

" وہ تو ہے ــــ وہ تو ہو گی" افضل صاحب ہنس کر بولے ــ" ابھی فرنیچر کہاں بنوایا ہے۔ چیف ایڈیٹر کا کیبن علیحدہ بنے گا۔ ابھی تو ہم عبوری مرحلے سے گزر رہے ہیں" عبوری مرحلے" کے معنی یہ تھے کہ دفتر میں جم کر (یعنی جھلنگا چارپائی میں دھم کر) کام صرف عبدالرحیم شبلی کرتے تھے۔ اسٹاف کے دوسرے ممبران اپنا اپنا کام (زخبروں کے بہ شمول)، اپنے اپنے گھر سے کرلاتے تھے۔ اپنی ڈاک دے جاتے۔ خطوط اور مضامین کا صفحہ نظیر لدھیانوی کے سپرد تھا۔ افضل صدیقی اور شمس نیوز ایڈیٹر۔ فکاہی کالم، چپراسی (جو چوکیدار بھی تھا)، ریڈیو اسٹیشن جا کر شوکت تھانوی سے لے آتا۔ رہ گئیں کاپیاں تو وہ شبلی صاحب کی بچشم خود نگرانی یا تحریری ہدایات کے مطابق اختر عکسی جوڑتا۔ ہاں یاد آیا کہ (چوکیدار + چپراسی)، نائیک خان بہادر خان نے اپنے ملفوظات میں یہ لرزہ خیز انکشاف بھی کیا تھا۔ کہ شوکت تھانوی اپنا" کالم" "نقد" لکھتے تھے۔ ایک ہاتھ سے پانچ روپے کا نوٹ وصول کرتے اور دوسرے ہاتھ سے کالم قاصد کے ہاتھ میں تھما دیتے۔ میں تو اس بات کی دہشت سے اپنی تنخواہ پوچھ ہی نہیں رہا تھا۔

مگر بکرا کب تک خیر مناتا۔ افضل صاحب بولے۔

"ہم ابھی۔"پارٹ ٹائم" بنیادوں پر اخبار نکال رہے ہیں آپ کا جس طرح چاہے گا اس کی چولیں کسی لیجیئے گا۔

رہا آپ کا مشاہرہ تو سرِ دست چار سو روپے کا اعزازیہ پیش کر سکیں گے۔ مگر انشاءاللہ یہ چلا جائے گا۔ دو تین ہزار تک البتہ رفتہ رفتہ۔ خان بہادر صاحب بارہ بجے آ رہے ہیں مگر محض آپ سے ملنے آ رہے ہیں۔ وضع دار گھرانوں کی روایات آپ سے بہتر کون جانتا ہے۔ بالمشافہ حساب کتاب کی بات کرتے ہوئے ان کی طبیعت اِبا کرتی ہے۔ تو رونق بخشئے کل سے کرسی ادارت کو اللہ کا نام لے کر......"

مشاہرے کی رقم سن کر ہم پر تو جیسے سردی کے موسم میں گھڑوں پانی پڑ گیا۔ بارہ سو روپے تو ہمیں ڈیڑھ برس پہلے ملایا میں ملتے تھے۔ راشن بنگلہ۔ نوکر چاکر مفت۔ مے و مینا کا شوق ہو تو وسکی کی بوتل تین روپے میں۔ راشن میں پھلوں کے علاوہ سگریٹ بھی مفت۔ اب بھی سات آٹھ سو مل جاتے تھے۔ اردلی تھا۔ بنگلہ تھا۔ اور دبدبہ تو ایسا کہ اللہ دے اور بندہ لے۔

اب میں نے افضل خان سے ایک سیدھا، نوکدار سوال پوچھا۔

"اخبار کی مالی حالت کیسی ہے اور ملک فیروز خان نون اس میں کتنی اور کس نوعیت کی دلچسپی رکھتے ہیں"

افضل صاحب کے جواب میں میرے ہر سوال کا جواب موجود تھا۔ فرمایا "اخبار پر آپ کا نام آنے کی دیر ہے۔ پھر دیکھیے خدا کیا کرتا ہے۔ آپ قلم سنبھالئے رقم کا انتظام اس خاکسار پر چھوڑیئے"

گھوڑے اور سیف الملوک

ہم والد ماجد بن گئے۔ کچھ عجیب سا لگتا ہے۔ بچے کی ولادت سے اب ہم خود بچے نہیں رہے۔ عام حساب سے بچھڑے جا رہے تھے۔ یوں خود ہمیں کوئی ایسا اشتیاق نہ تھا۔

برنارڈ شاہ کا ایک لطیفہ یاد آگیا۔ کسی دعوت میں ایک خاتون ان کے قریب بیٹھی تھی وہ اپنی جواں سال بیٹی کے حسن وجمال اور بالخصوص اس کی کافر جوانی کا قصیدہ پڑھ رہی تھی۔ آخر برنارڈ شاہ بولے "حسن بے شک قیامت ہے۔ مگر جوانی کو بچوں پر غارت کرنا اس سے بڑی قیامت ہے۔"

بیٹا ہوا ہے۔ ہم نے ابھی تک نام بھی نہیں سوچا۔ خاندان کی عورتوں نے اس کا ایک ایک نقش خاندان کے کسی نہ کسی فرد کے نام الاٹ کر دیا ہے۔ تیرا لاکھ ہزار شکر میرے پروردگار!

(۱۳ مارچ ۱۹۴۹ء)

لاہور کے شہریوں نے گلستانِ فاطمہ میں گورنر جنرل خواجہ ناظم الدین کے اعزاز میں گارڈن پارٹی کا اہتمام کیا۔ کوئی دو ڈھائی ہزار مہمان ہوں گے۔ ایک ریلے میں ہم بھی کچھ قریب جا پہنچے یا شاید خواجہ صاحب کسی ریلے میں ہمارے قریب آگئے۔ اس وقت پاکستان میں ہندوستان کے سفیر ڈاکٹر ستیا رام خواجہ صاحب سے باتیں کر رہے تھے اور خواجہ صاحب فارسی کا کوئی شعر ان کو سنا رہے تھے۔ بڑی رونق تھی۔ ہم نے اتنی بڑی پارٹی ۱۹۴۸ء میں سنگاپور میں ایک چینی کروڑپتی کی طرب گاہ کے افتتاح میں دیکھی تھی۔ اپنے آزاد ملک کی فضا کی دلکشی ہی کچھ اور ہوتی ہے۔ کیا کہنے زندہ دلان لاہور کے۔ خواجہ ناظم الدین کی سادگی بھی آدمی کو بہت متاثر کرتی ہے۔ (۲۷ مارچ)

کل میں دفتر روزنامہ "امروز" میں مولانا چراغ حسن حسرت کے پاس بیٹھا تھا کہ اچانک کیپٹن خٹک اور کیپٹن ڈاکٹر انیس الرحمٰن خان (ریٹائرڈ)، میجر جنرل مجھے ڈھونڈتے ڈھونڈتے وہاں آگئے جاوید کل ہی کوئٹہ سے لاہور پہنچا ہے۔ اور انیس کے ہاں ٹھہرا ہے۔ مولانا سب کو دوپہر کے کھانے پر ایک ریستوران میں لے گئے۔ جہاں ملایا اور سنگاپور کی باتیں ہوتی رہیں۔ ابھی دفتر میں بیٹھے تھے کہ پشاور سے محمود نظامی، ڈائریکٹر ریڈیو سٹیشن، نے ٹیلی فون پر آج رات پشاور ریڈیو کے مشاعرے میں شرکت کی دعوت دی۔ مولانا نے کہا: میں ضمیر کے بغیر نہیں آسکتا۔ نظامی

ایک چنچل طبع شخص، بولا: چشم ما روشن دلِ ما شاد۔ ویسے بھی ہمارے ہاں اصولوں سے زیادہ مستثنیات کا چلن ہے۔ حسرت صاحب کو سفر پہ آمادہ کرنا اور پھر تیار کرنا کارے دارد۔ مگر نظامی کو وہ انکار نہ کر سکے۔ لاہور سے ہم رات کی گاڑی سے روانہ ہوئے۔ فرسٹ کلاس میں براجمان ہو گئے۔ مولانا حسرت جہلم تک تو ٹالسٹائی کا "وار اینڈ پیس" پڑھتے آئے۔ پھر ان کی آنکھ لگ گئی۔ یہ کتاب وہ کئی مرتبہ پہلے پڑھ چکے ہیں، مگر اس ناول سے ان کی سیری ہی نہیں ہوتی۔

گاڑی صبح آٹھ بجے پشاور پہنچی، محمود نظامی سٹیشن پر موجود تھے۔ وہ ہم دونوں کو اپنے ہاں لے گئے۔ رات بڑے ٹھاٹھ کا کل پاکستان مشاعرہ ہوا۔ میں کوئی چودہ پندرہ برس بعد پشاور آیا۔ وقت ان رستوں سے دبے پاؤں نہیں گزرا۔ (۲ اپریل)

جہلم میں . . . . کی شادی میں شامل ہوا۔ یہ تقریب اس لئے ہمیشہ یاد رہے گی کہ برات کو خالی ہاتھ واپس آنا پڑا۔ حق مہر کی رقم پر جھگڑا ہو گیا ________ دولہا والوں نے باراتیوں کو بازار سے منگوا کر کھانا کھلایا۔ دلہن والوں کا کھانا۔ بقول مولوی غلام اعظم صاحب "کائیاں کتیاں" گیا (۴ اپریل)

راولپنڈی پہنچا۔ بھائی افضل شاہ صاحب کے ہاں ٹھہرا۔ ان کے ہاں مہمانوں کا ہمیشہ "رش" رہتا ہے۔ آج اتفاقاً سنگ جانی، بادشہان، پھیرا اور چک عبدالخالق مہمانوں کی "چھاونیوں" کے مہمان اکٹھے پہنچ گئے تھے۔ حسب معمول چار پائیاں سڑک پر بچھائی گئیں جو بچھتے بچھتے ٹاہلیاں شاہاں تک چلی گئیں۔ میرے پڑوس میں منشی سوار یا خان دراز تھے۔ وہ نوے برس کے پیٹے میں ہوں گے۔ کھاتے پیتے زمیندار ہیں۔ اچھی گھوڑی اور اچھے بیل رکھنے کے لئے علاقے میں دُور دُور تک مشہور ہیں۔ اچھا کھانے پینے کا اتنا شوق ہے کہ اب تک اپنی ساری زمین کھا پی چکے ہیں۔ ہم نے جب سے ہوش سنبھالی ان کی داڑھی کو مہندی سے رنگا دیکھا۔ آواز اونچی میٹھی اور پاٹ دار ہے "سیف الملوک" پڑھتے ہیں تو ہزار ہا کے مجمع پر سحر طاری ہو جاتا ہے۔ بیلوں گھوڑوں اور سیف الملوک کی وجہ سے ان کی مانگ اور مانتا" کا یہ حال ہے کہ لوگ گھر میں

ٹکنے نہیں دیتے۔ خود گھر پہ ہوں تو بیل کہیں گئے ہوتے ہیں، دو تین برس (غالباً ۱۸۹۶ء میں) مدرسہ پڑھایا تھا۔ اسی نسبت سے منشی کہلاتے ہیں۔ ان کے اس امتیاز میں آج کوئی دوسرا ان کا شریک نہیں کہ منشی صاحب مثنوی سیف الملوک کے خالق حضرت محمد بخش رحمۃ اللہ علیہ کی مجلس میں بیٹھتے رہے اور حضرت کی زندگی میں سیف الملوک پڑھنے کے لئے نام پیدا کر چکے تھے۔ رات یہاں بھی "سیف الملوک" کا دور ہوتا رہا۔ مخلوق کا ٹھٹھ بندھا رہا: (۵ اپریل)

شام مری پہنچے۔ کئی دن کے بعد فوج کا ماحول نصیب ہوا، تو یوں لگا۔ جیسے مچھلی واپس پانی میں آ گئی ہو۔ عسکری زندگی کا ایک اپنا حسن اور رنگ ہے، جو آپ کو باہر نہیں ملتا۔ اس کی مسلسل تگ و تاز میں بھی ایک انداز اور کشش ہے۔ ؏

اے غمِ دل کیا کروں اے وحشتِ دل کیا کروں

مری میں ابھی خاصی خنکی ہے۔ سایوں کے تلے کہیں کہیں برف پوری پگھلنے نہیں پائی۔ زندگی سرِ شام چپ کی چادر اوڑھ لیتی ہے۔ ملایا کا "کیمرون ہائی لینڈ" یاد آ رہا ہے۔ کیمرون کی ہوا مری سے کچھ زیادہ فرحت افزا تھی، مگر وہاں کی رنگینیوں کا اثر دہام یہاں کہاں، ملایا میں انگریزوں نے یہاں کی نسبت زیادہ چونچلے روا رکھے ہیں۔ سلاطین اور رؤسا کا رمنا بھی تھا۔ جو سماں راجوں مہاراجوں کی وجہ سے نینی تال میں دیکھا، وہاں پایا۔ مگر اب تو اپنا یہ حال ہے کہ ؏

جب آنکھ کھل گئی تو زیاں تھا نہ سود تھا

کیپٹن امتیاز کے ہاں ٹھہرا ہوں۔ آج کل وہ مارک ٹوین کے مضامین پڑھ رہے ہیں۔ اس کا ایک لطیفہ سنایا۔ مارک ٹوین انگلستان آیا، تو لندن کی ایک ادبی نشست میں کسی نے ان سے پوچھا کہ شکسپئر کے ڈرامے شکسپئر نے خود لکھے تھے یا کرسٹوفر نے یا بیکن نے۔ مارک ٹوین نے جواب دیا: فی الحال تو میں انتظار کروں گا۔ جنت میں پہنچوں گا تو شکسپئر سے دریافت کروں گا کہ آپ کے ڈرامے کس نے لکھے ہیں۔ اس شخص نے کہا: "یہ نہیں

سمجھتا کہ شکسپیئر جنت میں ہوگا۔" اس پر مارک ٹوین نے کہا "اس صورت میں آپ خود ہی شکسپیئر سے پوچھ لیجیئے گا۔" (۶ر اپریل)

حلقہ اربابِ ذوق

حلقۂ اربابِ ذوق راولپنڈی کے سالانہ جلسے میں شامل ہوا۔ مسٹر ہادی حسین کمشنر راولپنڈی ڈویژن صدر تھے۔ مقالہ نگاروں میں اعجاز بٹالوی کی گھن گرج نے سماں باندھ دیا۔ اس ذہین نوجوان سے اردو ادب کی بہت سی توقعات وابستہ ہیں۔ ان کا گھرانا ہی "ادبستان" ہے۔ بڑے بھائی ڈاکٹر عاشق حسین محقق۔ افسانہ نگار اور لیڈر دوسرے بھائی بابر بعسا کے (شعبۂ تعلقات عامہ، (آئی ایس پی آر) میں میجر رہے۔ "ہلال" کے ایڈیٹر تھے، ان کا شمار ممتاز کہانی کاروں میں ہوتا ہے۔ ایک اور بھائی جن کا نام شاید خادم حسین ہے اور پولیس میں غالباً تھانیدار تھے۔ وہ اختر شیرانی کے رسالہ "رومان" میں اپنے تجربات لکھا کرتے تھے۔ ایک اور بھائی آغا الطاف حسین میرے ساتھ نئی دہلی میں کلرکی کرتے رہے پھر ہماری طرح وہ بھی فوج میں چلے گئے۔ انفنٹری میں تھے لیفٹیننٹ کرنل ہوئے، میں اعجاز بٹالوی کی باتوں میں "حلقے" کے حلقے ہی سے نکل گیا ع

نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں

ہادی حسین پرانے لکھنے والوں میں سے ہیں۔ نوجوانی میں لاہور سے عابد علی عابد کے ساتھ مل کر رسالہ "ہزار داستان" نکالتے رہے۔ پھر آئی سی ایس میں کامیاب ہو گئے۔ پاکستان سے قبل زیادہ عرصہ آسام کی طرف رہے۔ کمشنری میں سخت ہوں تو ہوں۔ شاعری میں تو بہت ملائم ہیں۔ بات آہستہ آہستہ کرتے ہیں۔ انگریزی بلکہ فرانسیسی شاعری سے بہت متاثر ہیں۔ اردو کی عام بول چال میں بھی لگتا ہے۔ جیسے انگریزی یا فرانسیسی سے ترجمہ کر رہے ہوں۔ ان کی وجہ سے پہلی مرتبہ راولپنڈی کے ادیبوں، شاعروں پر "کمشنر ہاؤس" کے دروازے کھل گئے ہیں یہ انقلاب آزادی کے جلو میں آیا۔

(۹ر اپریل)

مسعود کے ہاں رات کے کھانے پر لمبی گپ چلی ۔ زرین بھابھی دوہ سنگاپور کی رہنے والی ہیں ، کا ہاتھ اب اردو زبان اور پاکستانی کھانوں پر کچھ کچھ رواں ہو گیا ہے ۔ آج شام ہم لوگ منا پکاتے رہے کہ راولپنڈی سے اپنا روزنامہ کیوں نہ نکالا جائے ۔ ملک کے اس گوشے سے کوئی اخبار نہیں نکلتا ۔ طے پایا کہ لاہور جا کر پیر و مرشد (مولانا چراغ حسن حسرت ، سے مشورہ کیا جائے ۔ مشورے کا "اول" دستہ مجھ پر مشتمل ہو گا (۱۱ اپریل)

کتاب کبھی باسی نہیں ہوتی ؟

سنیئر سب جج کی عدالت میں میری گواہی تھی ۔ مجھے دو لفظ ہی کہنے تھے ۔ بے پناہ ہجوم تھا ۔ مقدمات کی طویل فہرست تھی ۔ نہ جائے ماندن نہ پائے رفتن ۔ لوگوں کو خواہ مخواہ کوفت ہوئی ۔ جج صاحب رخصت پر تھے ۔ کوئی دوسرا سب جج تھا بھی نہیں ۔ اگر ہوتا بھی تو کوئی دوسرا جج ان کے مقدمے کی سماعت نہیں کر سکتا ، جس طرح ایک شاعر کی جگہ کوئی دوسرا شاعر شعر نہیں کہہ سکتا ۔

کوفت کو محسوس تو بہت کیا ۔ مگر کچہری عدالت کی فضا واقعی ایسی ہونی چاہیے تا کہ مقدمے بازوں کی حوصلہ شکنی ہوتی رہے ۔ لوگ کچہری کا رخ ہی نہ کریں ۔

بیساکھی کا دن تھا ۔ کوئی ہلا گلا نہ تھا ۔ بیساکھی کا تہوار اب " بیساکھی " لگا کر چلا کرے گا ۔

کیپٹن واحدی کو جب کبھی اپنی علمیت اور خطابت کا مظاہرہ مقصود ہوتا ہے ۔ وہ احباب کو اپنے ہاں کھانے پر مدعو کر لیتے ہیں ۔ آج رات ان کے ہاں ایک ایسا ہی اجتماع تھا ۔ اگلے دن کسی اخبار میں ڈاکٹر رضی الدین صدیقی کا کوئی مقالہ شائع ہوا تھا ۔ آپ کوئی ڈیڑھ گھنٹے تک اس مقالے کی دھجیاں اڑاتے رہے ۔ سامعین میں کرنل سکندر اور میجر سردار خان بھی موجود تھے ۔ تعجب ہے کہ وہ بڑے اطمینان سے واحدی کا لیکچر سنتے

رہے۔ حالانکہ یہ دونوں اپنے اپنے مقام پر خطابت کے "قطبِ دوراں" ہیں۔ واحدی یہ بہت اچھا کرتے ہیں کہ اپنی دعوتوں میں لیفٹننٹ ہاشمی کی موسیقی کا اہتمام ضرور کر لیتے ہیں جس سے تقریب کا ماحول بوجھل نہیں ہونے پاتا۔ کھانا بھی بہت لذیذ ہوتا ہے۔ ریڈیو آزاد کشمیر کے ڈائریکٹر محمد اقبال اور کیپٹن ممتاز ملک بھی موجود تھے۔ اقبال اس منصب پر ن۔م راشد کی جگہ آئے ہیں۔ ایک انگریز بھی تھا۔ سگنلز کے میجر گارڈن جونز۔ میجر جونز کو فلم دیکھنے کا سخت چسکا ہے۔ یہاں تک کہ اردو فلمیں بھی نہیں چھوڑتا۔ اس کی اکثر شامیں مری یا راولپنڈی کے سینما گھروں میں گزرتی ہیں۔ شگفتہ گفتار شخص ہے آج ان کے کسی دانت میں درد تھا۔ ڈاکٹر اختر نے پوچھا، کونسا دانت درد کر رہا ہے۔ میجر جونز نے جواب دیا: "دائیں طرف کا تیسرا۔ بالکونی میں"

ہم راولپنڈی سے اخبار نکالنے کے منصوبے کے بارے میں اپنے حلقۂ احباب میں "رائے شماری" کر رہے ہیں۔ اکثر احباب نے منصوبے کے حق میں ووٹ دیا۔ سب کا خیال ہے کہ راولپنڈی کی اہمیت تیزی سے بڑھے گی۔ جنرل ہیڈ کوارٹر یہاں آگیا ہے تو یہ سمجھو کئی اور عناصر بھی یہاں آکر رہیں گے۔ کیونکہ ایک سپاہی کو محاذِ جنگ پر کھڑا کرنے کے لئے چار آدمیوں کو جنرل ہیڈ کوارٹر میں بٹھانا پڑتا ہے۔ صرف حفیظ جالندھری نے منصوبے کے خلاف رائے دی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ اخبار جاری کرنے کی جگہ مکتبہ کھولو کتابیں چھاپو۔ صبح کا اخبار دوپہر کو باسی ہوتا ہے۔ کتاب کبھی باسی نہیں ہوتی۔ اشاعت کے لئے انہوں نے اپنی ایک کتاب پیش بھی کر دی۔ یہ کتاب چیونٹیوں کے بارے میں ہے۔ ہم نے ازراہِ مذاق کہا: "حفیظ صاحب! آپ کی شاعری کی کتاب کوئی نہیں خریدتا آپ کی چیونٹی کہاں بکے گی۔"

(۳۰ اپریل)

وہ گورنر پنجاب بننا چاہتے ہیں

دن کی گاڑی سے سفر کیا۔ بہت گرمی لگی۔ "سیکنڈ کلاس" میں شاید "سیکنڈ ہینڈ" پنکھے نصیب تھے۔ کہ بمثلِ گل محمد از جانہ جُنبد۔ وہ تو غنیمت ہوا کہ جہلم سے عبدالحمید عدمؔ اسی گاڑی میں سوار ہوئے اور اتفاقاً اسی ڈبے میں آنکلے۔ گرمی کی شدت کے باوجود۔ ع

خوب گزری ہے کہ مل بیٹھے تھے دیوانے دو

عدمؔ ۱۹۳۹ء سے ۱۹۴۱ء تک بسلسلۂ ملازمت جہلم میں مقیم تھے۔ ایک مرتبہ ہم لوگوں نے مل کر جہلم میں ایک عظیم الشان مشاعرے کا ڈول ڈالا۔ محفل مشاعرہ سہ پہر کو برپا ہوئی۔ اختر شیرانی ہمارے "اسٹار شاعر" تھے۔ وہ اسی دن دوپہر کو پہنچے۔ ہم نے ان کو سول لائن پر شہر کے رنگین مزاج رئیس لالہ گیان چند اوبرائے کی کوٹھی پر ٹھہرایا طے یہ تھا کہ ان کی تواضع مشاعرے کے بعد شام بھیگنے پر کی جائے گی۔ عدمؔ کو اخترؔ کا وزیر مہمانداری مقرر کیا گیا۔ اخترؔ کو مشاعرے میں لانے لے جانے کا فریضہ عدمؔ کے سپرد تھا وہ اخترؔ کو بر وقت مشاعرے میں لے تو آئے، مگر مشاعرے کے دوران ان کو لے کر مشاعرے سے اٹھ گئے۔ اور

ع پھر چراغوں میں روشنی نہ رہی

مشاعرے کے اختتام کے قریب ہم نے مشاعرے کے "سارجنٹ ان آرمز" (SERGEANT IN ARMS) ڈاکٹر جمیل احمد چوہان کو دریافت احوال کے لئے اوبرائے ہاؤس بھیجا۔ نامہ بر بھی مارا گیا۔ بعد میں کھلا کہ مشروبات کے شغل میں مشاعرے کا خیال ہی ان کے ذہن سے نکل گیا تھا۔ یہ اور اس قسم کے کئی دلچسپ واقعات کے اعادے لیتے لاہور تک دل کو خوش وقت کیا (یکم مئی)

مرشد (مولانا چراغ حسن حسرت) سے ملاقات ہوئی۔ حسبِ معمول گولڈ فلیک سگرٹوں

کاٹن سامنے رکھے "حرف و حکایت" لکھنے میں مصروف تھے۔ ایسے میں وہ ماحول سے لاتعلق ہو جاتے ہیں۔ کبھی ایک جملہ لکھ کر کاغذ کو مڑور کر ردی کی ٹوکری میں پھینک دیتے۔ کبھی ایک لفظ پر ہی کاغذ کی جان پر بن جاتی۔ ہمارے دیکھتے دیکھتے ردی کی ٹوکری چُرمُر کاغذوں سے بھر گئی۔ تب کہیں جا کر قلم رواں ہوا۔ مگر جب قلم رواں ہو گیا تو کالم ختم کر کے ہی رُکا۔

"لیجئے مولانا" ۔ کالم کاتب کے حوالے کر کے مجھ سے مخاطب ہوئے "کہیئے مولانا آپ کیسے نازل ہوئے"۔

راولپنڈی سے اخبار جاری کرنے کی تجویز کا ذکر کیا۔ منصوبہ پسند آیا۔ ذاتی شمولیت پر آمادہ ہیں۔ بلکہ اس معاملے میں بہت پر جوش ہیں"۔

ان کی رائے میں منصوبہ صائب ہے۔ لیکن ادارے میں ان کی شرکت کے بغیر اخبار کے پنپنے کے امکانات کم ہوں گے۔ ایک انتباہ یہ کیا ہے کہ انتظام کی باگ دوڑ کہیں کیپٹن جاوید خٹک کے ہاتھ نہ دے دینا۔ کہا۔ مولانا اخبار نکالنا خالہ جی کا گھر نہیں ہوتا یہ شہادت گہ اُلفت میں قدم رکھنا ہے"۔ اپنے بارے میں بتایا کہ وہ ایک ماہ کے نوٹس پر" امروز" سے فارغ ہو سکتے ہیں"۔

شام کو نورینگ (ریستوران)، میں چوہدری خلیق الزمان کے عصرانے میں ساتھ لے گئے۔ "ڈان" کے الطاف حسین اور بلوچستان کے قاضی عیسیٰ بھی اس تقریب میں موجود تھے۔ مولانا نے ایک ایک سے یہ کہہ کر ملوایا کہ مولانا ضمیر جعفری راولپنڈی سے قومی سطح کا روزنامہ جاری کر رہے ہیں۔

(لاہور - ۲ مئی)

گولڈن روڈ پر کرنل سر شیر محمد خان کے پاس ٹھہرا ہوں ان سے ملکی صوبائی اور ضلعی سیاست پر گفتگو رہتی ہے۔ آج کل نواب زادہ خورشید علی خان (مالیر کوٹلہ) کے ہاں ان کا بہت آنا جانا ہے۔ گو پہلے بھی ہندوستان کی سنٹرل اسمبلی میں دونوں

کا ساتھ رہا ہے۔ مگر اب تو گویا دانت کاٹی روٹی دوستی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کرنل صاحب اب کچھ عرصہ جم کر لاہور میں رہیں گے۔ جہلم میں اپنی کوٹھی سے کچھ سامان آرائش کا بھی لے آئے ہیں۔ جن میں سرفہرست راؤنڈ ٹیبل کانفرنس کی وہ تصویر ہے جس میں آغا خان اور ڈاکٹر سر محمد اقبال موجود ہیں۔ لاہور صوبے کی سیاست کا مرکز ہے۔ کرنل صاحب کو لاہور میں قیام کرنے کا مشورہ نواب زادہ خورشید علی خان ہی نے دیا ہوگا۔

(نواب سر ذوالفقار علی، جن کے بارے میں علامہ اقبال نے لکھا تھا کہ یہ موٹر ہے ذوالفقار علی خان کا کیا خموش۔ انہی خورشید علی خان کے والد تھے) (۴ مئی)

ملک فیروز خان نون اخبار (روزنامہ غالب) کی پالیسی میں گہری دلچسپی لیتے ہیں۔ ٹیلی فون پر بات ہوتی رہتی ہے۔ آج دوپہر کے کھانے پر بلا لیا۔ مداخلت کے انداز میں کوئی "لائن" تو نہیں دیتے۔ بس باتوں باتوں میں اپنی رائے اور عندیہ جتا دیتے ہیں۔ میں جب تک ان کو جانتا نہیں تھا۔ یہ سمجھتا تھا کہ انگریزی ان کا اوڑھنا بچھونا ہو گی۔ سو بود و باش کی حد تک تو ہے۔ ایک بیگم بھی انگریز ہے۔ لیکن بات چیت پنجابی میں کرتے ہیں۔ لہجہ بھی ٹھیٹھ سرگودھے کا ہے۔ آکسفورڈ کی تعلیم اور انگریز گورنروں اور وائسراؤں کے ساتھ نشست و برخواست سے کوئی تمدنی خراش ان کے اسلوب میں نہیں آئی (پنجاب کے)، گورنر سر فرانسس موڈی کے خلاف آج کل جو طوفان برپا ہے ملک صاحب کی رائے میں اس کے تار مرکزی وزیر آبادکاری خواجہ شہاب الدین ہلا رہے ہیں جو گورنر پنجاب بننا چاہتے ہیں (۵ مئی)

ایک معاملہ!

گرمی نے ستیاناس کر رکھا ہے۔ دو روز سے بجلی بھی روٹھی ہوئی ہے۔ گویا سوا ستیاناس۔ چیف سیکرٹری سید فدا حسن صاحب نے مدیرانِ جرائد کو چلنے پر

بلایا۔ سرکاری افسروں میں میر نور احمد۔ ڈائریکٹر تعلقات عامہ۔ پنجاب تھے۔ مدیران میں سے مولانا عبدالمجید سالک، فیض احمد فیض اور حمید نظامی۔ گفتگو زیادہ تر مولینٰا سالک اور حمید نظامی کرتے رہے۔ فیض خاموش رہے۔ میر نور احمد نے جو کچھ کہنا تھا فدا حسن صاحب کو پڑھا رکھا تھا۔ فدا حسن شکوے شکایت کی بات بھی دھیمے دھیمے میٹھے میٹھے لہجے میں کہہ جاتے ہیں۔ ان کی جگہ کوئی اور ہوتا تو وہ شاید حمید نظامی کے بعض تیز اور نوکیلے جملوں پر بھڑک اٹھتا۔ ہم تو اس سطح پر نو وارد ہیں۔ بعض اوقات تو یہ بھی محسوس ہوتا ہے کہ ملازمت کرنے کے بعد صحافت کے دبنگ تقاضوں کا ساتھ دینا مشکل ہو جاتا ہے۔

ع دل بدل جاتے ہیں تعلیم بدل جانے سے

ہم سرکار کا نقطۂ نظر دیکھتے دیکھتے اور اس کی ترجمانی کرتے کرتے شاید وہ جوہر ہی کھو بیٹھے ہیں جس کو "عوامی جارحیت کہتے ہیں (۷، امئی)

مولانا چراغ حسن حسرت کراچی چلے گئے۔ میاں افتخار الدین نے کراچی سے بھی "امروز" نکالنے کا فیصلہ کیا ہے۔ مولانا ہر اول دستے کی قیادت کر رہے ہیں بہت سے لوگ الوداع کہنے ریلوے سٹیشن پر موجود تھے۔ ہم ان کے لئے لاہور آئے اور وہ کراچی چلے گئے۔ حالات کی ستم ظریفی کے سامنے کیا چارہ۔ سوچ رہا تھا کہ ان کی وجہ سے لاہور میں ہم تھوڑا سا "سنگاپور" آباد کریں گے۔ آں قدح بشکست و آں ساقی نماند۔

بُری باتیں۔ اکٹھی آتی ہیں۔ ادھر ہمارے اخبار (غالب) کا حال بھی پتلا ہو گیا۔ محمد افضل خان (جنرل منیجر) بتا رہے تھے۔ کہ مالی بحران نازک ہوتا جا رہا ہے۔ ملک فیروز خان نون کمپنی کی ڈائریکٹری سے مستعفی ہو گئے ہیں۔ ہمارے ہاں بدقسمتی سے اداروں کی قسمت افراد سے وابستہ ہوتی ہے۔ ملک فیروز خان نون لوگوں سے پیسے جمع کر لیتے تھے۔ جو کوئی ان سے ملنے آتا۔ کہتے بھائی "غالب" کے لئے پانچ دس ہزار دے جاؤ۔

آخر کہاں تک ۔ بالخصوص جب ملک صاحب کرسی میں بھی نہیں ہیں۔ سنا ہے خان بہادر احمد سعید لائل پور میں اپنے دو چار مربعے فروخت کرنے پر تیار ہیں مگر ان کے بیٹے مزاحم ہیں۔ وہ کہہ رہے ہیں ۔ ابا جان جب سیاستدان (ملک فیروز خان نون) کو اخبار کی ضرورت نہیں، تو آپ کو اپنی جائیداد تکیٹ کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ لیکن ایک بات ہے کہ اگر میاں احمد سعید طیش میں آگئے تو پھر یہ راجپوت کسی سے رکنے والا نہیں۔

اگلے دن کی چیف سیکرٹری کے ساتھ پی ہوئی چائے کہیں چیف سیکرٹری کے ساتھ پی جانے والی آخری چائے نہ ہو (۱۳ مئی)

کشمیر کا مسئلہ نازک ہو رہا ہے یعنی پیچیدہ ۔ عارضی سمجھوتے کے لئے پاکستان اور ہندوستان کی حکومتوں نے اپنے اپنے جوابات کمیشن کو بھیج دیئے ۔ افواہ ہے کہ ہندوستان استصواب رائے سے گریز کر رہا ہے۔ مجھے تو یہ معاملہ صلح وصفائی سے طے ہوتا دکھائی نہیں دیتا۔ (۷ جون)

انگریز کے زخم اور گلاب

میں صبح سیر کے لئے ہوٹل سے نکلا، تو آغا صاحب (ہمارے ایک عزیز آغا اختر علی) شکاریوں کی مخصوص برجس پہنے، بندوق اور تھیلا لٹکائے بائیسکل پہ اُڑے چلے جا رہے تھے مجھے دیکھ کر رُک گئے۔ سامان اٹھوا کر گھر لے گئے۔ آغا صاحب ریلوے میں سفید گریڈ کے گارڈ ہیں۔ ان کا بنگلہ ہوٹل (میٹروپول) کے قریب ہی ریلوے سٹیشن کے نواح میں واقع

ہے۔ شکار کے پرانے رسیا ہیں۔ ایک زمانے میں، جب ناگپور ریلوے میں تھے، چیتے اور شیر کا شکار کھیلتے رہے۔ ایک مرتبہ ناگپور ریلوے کا انگریز جنرل منیجر ان کی شہ پر شیر کا شکار کھیلتے ہوئے، شیر کے پیٹ میں چلا گیا۔ خود آغا صاحب تین روز تک ایک درخت پر ٹنگے رہے۔ تب سے ان کی مہم آزمائی کی جولانگاہ معصوم مرغابیوں تک محدود ہے تاہم شوق لامحدود ہے۔ ہمیں گھر پہنچا کر خود راول ندی پر چلے گئے اور دوپہر تک ہمارے "اعزاز" میں چار مرغابیاں مار لائے اور پھر دن بھر آج کے شکار اور گزشتہ شکاریات کے تجربات سناتے رہے۔ میں نے دیکھا ہے کہ جس طرح اکثر شاعروں کو اپنے رشحاتِ قلم سنانے کا چسکا ہوتا ہے۔ اسی طرح شکاری حضرات بھی اپنی شکاریات سنانے کا شوق رکھتے ہیں۔ آغا صاحب کے نزدیک شکاری کی شخصیت کے لئے ایک خاص قسم کی چھاپ کا ہونا ضروری ہے۔ مثلاً ان کی مونچھیں اسی چھاپ کا جزو لاینفک ہیں۔ وہ خود کہتے ہیں کہ اگر میں شکاری نہ ہوتا، محض ریلوے کا گارڈ ہوتا۔ تو مونچھیں ہرگز نہ رکھتا۔ ان کا کہنا ہے کہ جس طرح فوج کے سپاہی کو دیکھنے میں بھی سپاہی معلوم ہونا چاہیئے۔ اسی طرح شکاری کی سج دھج بھی ایسی ہو کہ بندوق کے بغیر ہی لوگ دیکھتے ہی پکار اُٹھیں کہ ہاں یہ شخص شکاری ہے۔ اس سلسلہ میں وہ لیفٹیننٹ کرنل رلیجہ میں بریگیڈیئر) گل مواز خان رڈائریکٹر آرڈی ننس سروسز رہے) کو اپنا آئیڈیل سمجھتے ہیں۔

آغا صاحب کے شکار کی پہلی "کاژلٹی" ان کی بیوی ہے۔ شکاریات کے "سیشن" کے دوران یہ بی بی جتنی مرتبہ ادھر آئی، شوہر سے لڑ کر گئی کہ شکار کے سوا اُن کو دنیا کے کسی اور کام میں کوئی دلچسپی نہیں۔

ایک مرتبہ راستے میں کہیں ہرن دیکھے تو ٹرین کو جونیئر گارڈ کی تحویل میں دے کر خود راستے کے ایک سٹیشن پہ اُتر گئے۔ چھ مہینے ملازمت سے معطل رہے۔ ان کے ساتھ کے گارڈ "ڈی۔ ٹی۔ او" بن چکے۔ مگر آپ ہیں کہ گل محمد از جا نہ جنبد ـــــــ ان کی اہلیہ کہتے

بگیں۔ "بچی جوان ہو رہی ہے۔ اس کے ہاتھ پیلے کرنے کی فکر ہونی چاہیئے۔ میں کبھی کچھ کہتی ہوں، تو آگ بگولا ہو جاتے ہیں۔ ڈر لگتا ہے کہیں مرغابی کی طرح اس غریب کو پھڑکا کر نہ رکھ دیں۔ بندوق تو ہر وقت بھری تنی رہتی ہے"۔

بنگلے کا پائیں باغ دل و نگاہ کی طراوت کا بے پایاں حسن رکھتا ہے۔ ان سے پہلے اس (۵۳۔پی) بنگلے میں سفید گریڈ کا ایک سفید گارڈ رہتا تھا۔ جس کی میم کو باغبانی کا شوق تھا۔ اس خاتون نے اپنے چمن میں کوئی تیس انواع کے تو گلاب ہی لگا رکھے ہیں۔ دیکھئے ہمارے آغا صاحب کے ہاتھوں اس گلابِ چمن پر کیا گذرتی ہے۔ بہر حال ابھی تک اس بنگلے میں انگریزوں کے لگائے ہوئے زخم بھی تازہ ہیں اور گلاب بھی۔

(راولپنڈی ۳۰ جولائی ۱۹۴۹ء)

"بادِ شمال" (روزنامہ جو ہم نے راولپنڈی سے شائع کیا) کے دفتر کے لئے ہم کوئی موزوں سی عمارت تلاش کر رہے ہیں۔ مسعود کی رائے ہیں تو اخبار کا دفتر شہر کے قلب میں واقع ہونا چاہیئے تاکہ ہمیں شہر کی دھڑکن بر وقت سنائی دیتی رہے۔ لیکن انعام بھائی (کیپٹن انعام اللہ قاضی) شان و شکوہ کے قائل ہیں۔ ان کے خیال میں ہمارا دفتر صدر میں بلکہ مال روڈ پر ہونا چاہیئے۔ وہ صدر میں "ریسی گیٹ" کے اندر جانے کو بھی تیار نہیں۔ ان کا نظریہ یہ ہے کہ پکوان کتنا ہی اچھا کیوں نہ ہو جب تک "دکان اونچی" نہ ہو گی، بات نہیں بن سکتی۔ ہم تینوں میں سب سے نفیس طبع اور خوش لباس بھی وہی ہیں۔ دفتر کی عمارت کا مسئلہ ابھی طے نہیں ہو سکا۔ مگر انعام بھائی مینجنگ ایڈیٹر کے لئے (یعنی اپنے لئے) فرنیچر خرید بھی چکے ہیں۔ ان کی میز میں نے آج دیکھی۔ یا اللہ! اتنا بڑا دفتر ہم کہاں سے حاصل کریں گے جس میں قاضی صاحب کی میز سما سکے۔ بہر حال۔ سردار کریم نواز خان (کمشنر بحالیات) سے بات کی ہے۔ انہوں نے ہمارے مسئلے میں "ادیبانہ دلچسپی" کا اظہار کیا ہے۔ کیوں نہ ہو آخر وہ بھی لاہور میں ہماری طرح اختر شیرانی کی مجلس میں بیٹھنے والوں میں سے ہیں۔ (یکم اگست)

ٹرانسپورٹ کے راستے سیاست

شورز ہوٹل میں شام کو حسبِ معمول مسعود اور زین کے ہاں انجمن آرائی رہی زین بجاجی اب خاصی اردو بولنے لگی ہیں۔ وہ سنگاپور میں پیدا ہوئیں اور وہیں پروان چڑھیں۔ ننھا صلو (صلاح الدین)، بھی اتنا ہمکتا اچھلتا ہے کہ اتنی عمر کے بچے کے ایسے چھل بل کم ہی دیکھے ہیں۔ گنگا جمنی ہے نا آخر یلکہ پنجابی سنگاپوری۔

شورز ہوٹل کے قطب الاقطاب میاں فضل قادر (ڈپٹی چیف ایڈمنسٹریٹر وزارت دفاع)، کی مردم بیزاری روز افزوں ہے۔ میٹلا کے سرکاروں کا نیا ڈبہ جب تک پھونک نہیں لیتے خود کو اپنے "خول" سے نکلنے نہیں دیں گے۔ جنرل ہیڈ کوارٹر کی سول انتظامیہ کے بھی کیسے کیسے "نورتن" نگاہوں سے گزرنے۔ حفیظ اللہ بٹ، خان محمد عمر خان، فضل القادر، حفیظ اللہ بٹ کا تو ہمیں یاد ہے کہ ۱۹۴۲ء میں وہ جنرل ہیڈ کوارٹر (انڈیا)، میں مسلمان کلرکوں کی فوج ظفر موج میں تن تنہا افسر تھے۔ تازہ تازہ افسر بنے تھے مگر بہت سینئر معلوم ہوتے تھے اور مسلمان اہلکار "برادرانِ وطن" کی ریشہ دوانیوں سے پناہ لینے کے لئے انہی کے گرد جمع رہتے تھے۔ قیامِ پاکستان کے بعد حکومتِ ہند کے مسلمان ملازمین کی حالتِ زار کا تصور کرنا بھی ممکن نہیں رہا اس زمانے کی کیفیت کا حال کوئی شفیع راجہ سے پوچھے (دفاع میں ڈپٹی فنانشل ایڈوائزر رہے)، مشہور شاعر اختر ہوشیارپوری سے پوچھے۔ (راولپنڈی ۱۲ اگست)

پروفیسر شوکت واسطی ایبٹ آباد بلا رہے تھے آج ہم پہنچ گئے ایک برس کے بعد ان پہاڑیوں میں گھومنے کا موقع ملا۔ "سپرنگ فیلڈ ہوٹل"۔ بھی گئے یہاں ابھی تک فوجی افسروں نے ڈیرے ڈال رکھے ہیں۔ ایک انگریز لیفٹیننٹ کرنل لان میں بیٹھا چائے پی رہا تھا۔ لگتا تو اپنے نمبر ۹ فرنٹیئر ڈویژن کے اے کیو کی طرح تھا مگر شاید کوئی اور

ہی ہو۔ ہمارا کرنل بلیک اتنا سفید تو نہ تھا۔ پاکستان ملٹری اکیڈمی بھی گئے۔ آئی ایم اے (انڈین ملٹری اکیڈمی)، ڈیرہ دون کے مقابلے میں ایک کیمپ معلوم ہوتی ہے کیڈٹوں کی پہلی کھیپ جوان دنوں اس کی آغوش میں پروان چڑھ رہی ہے یہ ڈیرہ دون سے آئی ہے۔ ڈرے ہوئے ہرنوں کی طرح بھاگے بھاگے پھر رہے تھے۔ ان میں سے ایک ہمارے اپنے بریگیڈئر اور جرنیل پیدا ہوں گے کتنے خوش قسمت ہیں۔ ہماری نسل میں سے نصف لوگ تقریباً پوری عمر اور نصف لوگ جن میں ہم بھی شامل ہیں تقریباً نصف زندگی۔ غلامی کی رات میں گزار چکے۔ چلئے یہ سورج تو دیکھ لیا۔ یوم آزادی قریب آرہا ہے

رات شوکت واسطی کے ہاں دیر تک شعر و سخن کی نشست جمی رہی محسن احسان تھا۔ حفیظ اثر بھی۔ محسن احسان کی غزل اور شوکت واسطی کا ترنم بکھرتے جا رہے ہیں۔ شوکت نے آج کل ایک اور کُل پاکستان مشاعرے کا ڈول ڈال رکھا ہے پہلے کون سے کم دشمن تھے کہ دشمنوں کی نئی فصل تیار کرنے لگا۔

(ایبٹ آباد۔ ۳ راگست)

آغا جی (بھائی سید محمد افضل شاہ) کے ہاں گیا مہمانوں کا ہجوم کم تھا راولپنڈی کے ایک نوجوان سید علی اصغر شاہ (ممبر پارلیمنٹ ہوئے) سے ملاقات ہوئی ٹرانسپورٹ کے راستے سے سیاست میں جانے کا ارادہ رکھتے ہیں سب سے بڑا اثاثہ ان کی میٹھی زبان ہے۔ ہر لفظ دوسرے کے دل میں اتر جاتا ہے۔ سیاست تو ان کی شائد نہ چل سکے کہ سیاست روپے پیسے کا کھیل ہے۔ لیکن ٹرانسپورٹ چل جائے گی۔

میں تائی (والدہ آغا محمد افضل شاہ) کے سامنے جاتے ہوئے گھبرا رہا تھا مجھے معلوم تھا وہ مجھے فوج کی وردی اتارنے پر ایسے تیسے کریں گی۔ یہ بات ان کے سان گمان میں نہیں آتی کہ پنشن سے پہلے آدمی فوج کی نوکری چھوڑ بھی سکتا ہے۔ ان کے شوہر تیس برس فوج میں دفعدار رہے اور شاید تیس ہی برس انہوں نے دفعداری کی

پنشن کھائی ہو گی۔ بہر حال آج تائی کا سامنا ہو گیا اور انہوں نے ٹھیٹھ پنجابی میں جو کچھ کہا۔ اس کو میں اردو میں کیونکر لکھوں! (راولپنڈی۔ اگست)

جنازے کے لئے قبل از وقت چھٹی

آغا صاحب شکار پر ہیں اور ان کے ہمسائے کی مرغیوں کا لشکر ان کے پائیں باغ کے پھولوں کا شکار کر رہی ہیں۔ اور بقول آتش ع

دوڑتے پھرتے ہیں ہم باغ کی دیواروں پر

یہ آتش بھی بڑا آگ شاعر تھا۔ لاہور معذرت کا تار دے دیا۔ راولپنڈی کے سہانے موسم نے نکلنے نہ دیا۔ اپنے تار دینے پر ایک پرانا لطیفہ یاد آگیا۔ شہر میں کرکٹ کا میچ ہوتا تو دفتر کے کئی اہل کار چھٹی کی عرضی بھجوا دیتے۔ عموماً کسی رشتہ دار کا انتقال ہو جاتا۔ افسر کوئی باذوق شخص تھا۔ ایک مرتبہ جب میچ کا موسم آیا تو اس نے دفتر کے نوٹس بورڈ پر لکھوا دیا۔

سٹاف کے جس رکن کو اپنے کسی رشتہ دار کے جنازے میں شامل ہونا ہو وہ میچ سے دو روز پہلے چھٹی کی درخواست دفتر بھجوا دے۔ (اگست)

جنوب مشرقی ایشیا کی موجودہ قیادت جرأت مندانہ پیش قدمی کی اہل نہیں ہے چھوٹا منہ بڑی بات سہی۔ مگر میرا احساس یہی ہے۔ آزاد ملکوں کے لیڈر اپنے گھریلو معاملات بلکہ مفادات میں الجھ گئے ہیں اگر سیاسی پارٹیاں مضبوط اور واضح بنیادوں پر استوار نہ ہوں۔ تو کچا کچا پارلیمنٹری سسٹم عدم استحکام پیدا کرتا ہے۔ نتیجہ یہ کہ اربوں روپے خرچ کر دیجیے غربت اور جہالت دور نہ ہو گی اقتصادیات کی عظیم قوت سرکاری اہل کاروں کے ہاتھ میں ہے۔ ہائے میر تقی ع

ہوئی شگفتہ طبیعت نہ ہم بلوں کی

(راولپنڈی اگست ۱۹۶۹ء)

یومِ آزادی۔ شہر اور چھاؤنی کے کوچہ و بازار دلہن کی طرح آراستہ ہیں۔ قدم قدم پر دروازے۔ محرابیں، جھنڈیاں۔ پھول اور پاکستان کے سبز ہلالی پرچم۔ آرائش سے زیادہ اثر انگیز عوام کا جذبۂ آزادی۔ مسعود اور میں رات کو دیر تک گشت کرتے رہے ایک والہانہ جشن کی کیفیت تھی۔

ہم نے اپنی آزادی کا پہلا سورج سنگاپور میں دیکھا تھا۔ عجیب دن تھا وہ بلکہ عجیب رات تھی وہ۔ ہماری یونیفارم وہی تھی۔ مگر راتوں رات ہم "نئے" ہو گئے تھے۔ جیسے ہمارے قد اونچے ہو گئے ہوں۔ "یونین جیک" کو سیلیوٹ کرتے کرتے اپنے قومی پرچم کو سلامی دینے میں روح نے جو سرور اور اعزاز محسوس کیا، اس ذائقے کو الفاظ میں کیونکر بیان کروں۔ تاریخ کی کتنی بڑی سعادت ہماری پیشانی کے مقدر میں تھی۔ صبح آزادی۔ آج بے اختیار ملایا کے چینی باشندوں کے موسمی اور ثقافتی جشن یاد آ گئے اتنے طویل اور مرتب جلوس ہم نے اس سے پہلے نہیں دیکھے تھے۔ چینی بلا کی محنتی قوم ہے۔ کم از کم جن چینیوں کو ہم نے دور یورپ میں دیکھا ہے۔ مگر تہواروں پر یوں لگتا جیسے ان بندوں کو جشن مسرت منانے کے سوا کوئی کام ہی نہ ہو۔ جو مرنا جانتا ہے وہی جینا جانتا ہے۔

(۱۴ اگست ۱۹۴۹ء)

شیخ مقبول الٰہی درویش (ریٹائرڈ کرنل، آرڈیننس کور سنٹر) ملیر چھاؤنی کے کمانڈنٹ رہے۔ آج ایک روشن خیال تعلیم یافتہ نوجوان لڑکی کو نصیحت کر رہے تھے جو شاید کسی کالج میں لیکچرار ہیں کہ کسی ایسے نوجوان کو رفیق زندگی بنائیو جو سخت محنتی ہو سیاسی جنگلے کی درست سمت رہنے کا سلیقہ رکھتا ہو۔ افسر تو وہ ہو گا ہی تمہیں دیکھنا ہو گا کہ وہ ایسے فیصلوں میں ملوث نہ ہوتے پائے جس سے عدم مقبولیت کا خطرہ لاحق ہو جائے اور ہاں۔ اس شخص کو سوشل پارٹیوں میں اٹھنے بیٹھنے اور اپنے افسرانہ ٹھاٹھ باٹھ سے کما حقہ فائدہ اٹھانے کا ہنر بھی آتا ہو۔ سول سروس میں اکثر لوگ موقع پرست ہوتے ہیں۔

انگریزی میں بھی سمجھایا' MORE COURAGE - LESS PROFILE

ایک شعر یاد آگیا۔

شیخ کے منہ سے تو نکلی ہیں مزے کی باتیں

ہم یہ سمجھے تھے بجز نام خدا کیا ہو گا

ہم حیران تھے یہ مرد درویش کیا کہہ رہا ہے وہ خود تو ہمیشہ جگلے کی غلط سمت میں ہے لطیفہ گوئی کے موڈ میں تھے، آج وہ سفارت کاروں کی طرح کسی معاملے میں بھی شدت کے احساس سے عاری تھے (۱۵ راگست)

میری کتاب "ہندوستان میں دو سال" کے پروف آگئے (یہ کتاب صوبہ بنگال کے آسٹریلین گورنر مسٹر کیسی نے لکھی تھی۔ ہم نے اس کا اردو ترجمہ کیا، مجھے تو اس کے پڑھنے سے ہول آنے لگا۔ لکھتا ہے "یہ ایک غیر ہر دلعزیز صوبہ ہے دہشت پسندوں کا گہوارہ ہے۔ ہندوؤں اور مسلمانوں میں سخت نفاق ہے بنگالیوں کو ہندوستان بھر میں ہوشیار اور تیز سمجھا جاتا ہے تنگ مزاج بھی ہیں۔ ٹھوس کام کرنے کی صلاحیت سے عاری ہیں۔ بنگال ہمیشہ ایک نہ ایک آفت میں گھرا رہتا ہے بڑے حساس اور جذباتی لوگ ہیں۔"

حکومت کے نظم و نسق کے بارے میں کسی نے لارڈ کرزن کے حوالے سے لکھا ہے کہ "یہ ادارہ ایک بہت بڑے تھیلے کے مانند تھا جس میں فوج اور سول کے افسر گڈمڈ پڑے تھے۔ محکموں کے باہمی تال میل کا یہ حال کہ۔ کسے رابا کسے کارے نہ باشد۔ دفتروں میں بیشتر وقت خواہ مخواہ کی لکھا پڑھی کی بھینٹ چڑھ جاتا ہے۔ اہل کاروں کو کاغذ کالے کرنے کا بڑا شوق ہے۔ محکموں کی باہمی مشورت میں ضرورت سے زیادہ تاخیر ہوتی ہے۔

(لاہور ۱۷ راگست)

کوٹھی یا دیہاتی ہوٹل

ایک دن شیخوپورہ میں بھائی صاحب کے ساتھ گزار کر لاہور آ گیا۔ والدہ صاحبہ بکرمہ بھی وہیں تھیں۔ بھائی صاحب نے یہ لطیفہ سنایا کہ تعطیل کے دن جب کبھی وہ ڈیوٹی مجسٹریٹ ہوتے ہیں تو اس دوران میں اگر پولیس کبھی زیر حراست ملزموں کے ریمانڈ وغیرہ کے لئے ملزموں کو کوٹھی پر لے آئے تو ملزموں کو ہتھکڑیوں میں بندھا دیکھ کر والدہ صاحبہ کا دل پسیج جاتا ہے اور وہ کہا کرتی ہیں۔ بشیر! ان کو چھوڑ دے۔

شیخوپورہ بھی ہمارے جہلم کے مانند ایک چھوٹا سا شہر ہے بلکہ شاید اس سے بھی چھوٹا جہلم میں چھاؤنی تو ہے۔ انسانوں کے چہرے کی طرح ہر علاقے کا ایک اپنا حسن ہوتا ہے شیخوپورے کا حُسن اس کی کشادگی اور شادابی ہے سول لائن میں تو ہر گھر کے سامنے گویا ایک ننھی سی نہر بہہ رہی ہے۔ پرانے شہر کے ماحول پر تاریخ کے سائے بھی نظر آتے ہیں یہیں ایک قدیم قلعہ موجود ہے۔ دوسری سمت میں ہرن مینار کا تاریخ کے بارے میں مجھے کچھ زیادہ آگاہی نہیں۔ نہ میں ان مقامات تک جا سکا۔ بہر حال ان مقامات کی موجودگی سے اس شہر کی تاریخی اہمیت کا احساس ہوتا ہے۔ تاریخی آثار کے بغیر کوئی شہر خوبصورت تو ہو سکتا ہے۔ مگر ماضی کے ورثے کا امین نہیں ہو سکتا۔

چوہدری محمد حسین چٹھہ کی کوٹھی کے سامنے سے جب بھی گزرا لوگوں کا ٹھٹ لگا دیکھا۔ وکلاء کے ڈیرے بھی بہت آباد پائے۔ ہمارے پڑوس میں ایک وکیل صاحب کی کوٹھی پر تو کسی دیہاتی ہوٹل کا گمان ہوتا ہے۔ باہر میدان میں بیس تیس چارپائیاں بچھی رہتی ہیں مؤکل جب پیشی کے لئے شہر آتے ہیں تو قیام بھی انہی کے ہاں کرتے ہیں۔ اس سہولت کی وجہ سے ان کے ہاں مؤکلوں کا تانتا بندھا رہتا ہے ایک بات واضح ہے کہ کل کلاں اگر انکی وکالت ٹھس ہو گئی تو کم از کم ہوٹل تو چلتا رہے گا۔ تجربے کا بدل کوئی چیز نہیں۔ یوں تو یہ صاحب طبعاً بھی بے حد ملنسار اور مہمان نواز ہیں۔ سُنا ہے ان کے کوئی بزرگ کسی زمانے میں پنجاب اسمبلی

کے ممبر بھی رہ چکے ہیں۔ ان کے گھر میں اس کثرت سے چارپائیاں اور بستر وغیرہ انھی بزرگ کے زمانے کے پڑے ہیں۔

الغرض ع

ایک ہنگامے پہ موقف ہے گھر کی رونق

پرانے کاغذات کا ایک پلندہ بھی ساتھ تھا۔ ایک پرزے پر دو شعر لکھے دیکھے۔ تو ۱۹۴۵ء میں بحری جہاز "ایکما" کا سفر یاد آگیا۔

یہ بے رنگ، بے مدعا سی جوانی
کوئی تیر کھانے کو جی چاہتا ہے

یہ تاروں بھری رات اور یہ سمندر
یہیں ڈوب جانے کو جی چاہتا ہے

یہ اشعار یاد آئے تو کپتان احمد خان جنجوعہ (ملٹری پولیس میں لیفٹننٹ کرنل تک دیکھے گئے) بھی یاد آگئے۔ جو "ایکما" کے عرشوں پر ان اشعار کو اپنے والہانہ رقص کی تال میں گایا کرتے تھے۔ (۱۹ راگست)

ایک ہی نشست میں سارے مرحلے

آج ٹونی کو آنا تھا۔ بھابھی کو بھی ساتھ لانے کا لکھا تھا۔ نہیں پہنچے۔ دن بھر انتظار رہا بھابھی تو اپنے پروگرام پر بڑی سختی سے پہرہ دیتی ہیں۔ ٹونی کا لاابالیانہ پن شادی کے بعد بھی وہی ہے جو پہلے تھا۔

یوں آج ۔۔ آئی جو اس کی یاد تو آتی چلی گئی۔ سنگاپور کے ٹونی کی تصویر نگاہوں کے سامنے گھومتی رہی۔ سرخ سفید، نوخیز۔ اس کا شمار بلا مبالغہ جنوب مشرقی ایشیائی کمان کے خوبصورت ترین کپتانوں میں ہوتا تھا۔ انگریزوں کا دشمن مگر انگریزی انگریزوں کی طرح بولتا، خوش پوش،

خوش ادا۔ بے فکر! وہ ہم میں سب سے زیادہ ہوشیار بھی تھا۔ مگر اس سے کوئی نہ کوئی ایسی بات سرزد ہو جاتی کہ "ایک" کے بقول، جو حلقۂ یاراں میں ٹیڑھ قسم کے رجمنٹل افسر تھے۔ "ٹونی" ہمیشہ گرم پانی کے ٹب میں بیٹھا رہے گا۔ کیونکہ وہ زندگی کو اس طرح بسر کرنا چاہتا ہے جس طرح زندگی کو دیکھتا ہے۔ یعنی وہ سراب کو حقیقت سمجھتا ہے۔ خیر یہ تو افسری باش گاہوں کی گلخپ تھی۔ "مرشد"۔ (مولانا چراغ حسن حسرت)، جب کبھی "ایک" پر طنز کا وار پھینکتے تو کہا کرتے۔ "آپ کی شرافتِ خاندانی کے تو ہم بے شک بہت قائل ہیں۔ لیکن آپ کی شرافتِ ذاتی میں ہمیں کلام ہے۔ میرا اپنا خیال یہ ہے کہ ٹونی محض PROFILE ہی نہیں تھا۔ وہ حوصلہ مند بھی تھا شاید اپنی تاب سے کچھ زیادہ ہی حوصلہ مند تھا۔ وہ درمیانے طبقے سے تعلق رکھتا تھا۔ مگر درمیانی صلاحیت کے موقع پرست لوگوں میں سے نہیں تھا۔ البتہ اس بات کا احتمال تھا کہ چیف اور میک دو انگریز لفٹیننٹ چھوکروں کی دوستی کہیں اس کی خوبیوں کو خرابیوں میں نہ تبدیل کر دے خاص طور پر میک کہ کسی معاملے میں بھی شدید احساسات نہیں رکھتا تھا۔ محض قد آوری سے مرغوب رہتا اور ہر چمکتی چیز کو سونا سمجھ لیتا۔ اپنی شادی میں بھی اس نے مونٹ بیٹن کلب میں ایک سیامی لڑکی سے اپنی پہلی "ہیلو" کے بعد منگنی سے لے کر شادی تک کے راستے، مراحل ایک ہی نشست میں طے کر ڈالے۔ ادھر ڈوبا۔ ادھر نکلا۔ ٹونی فطرتاً دلیر تھا۔ اس کو جب بھی دو راستوں میں سے کوئی ایک راستہ اختیار کرنا ہوتا۔ تو ہمیشہ خطرات کا راستہ منتخب کرتا۔ "ایک" کہا کرتا۔ ٹونی کو دراصل جاپانیوں کو فوج میں ہونا چاہیئے۔" دفتری امور میں بھی اس کا عقیدہ یہ تھا کہ کاغذ جتنا کم استعمال ہوگا کارکردگی اتنی ہی بہتر ہوگی۔ یہ الگ بات ہے کہ دفتری معاملات میں کم کاغذ استعمال کرنے کی وجہ سے ایک مرتبہ اس کو "پانی کے گرم ٹب" میں بیٹھنا پڑا۔

واقعہ یہ ہے کہ ٹونی ایک انگریزی محاورے کے مطابق تھا ہی چائے کا ایک "مختلف کپ" اپنے ہاں کے ادبی سرمائے میں سے اگر کوئی تمثیل درکار ہو تو میں کہوں گا کہ وہ تالاب میں کنول کا تنہا پھول تھا۔

چلو ہمارا وقت کچھ اچھا گزر گیا۔ ؏
ہم نے خیال ہی کو خیابان بنا لیا

(لاہور۔ ۱۲؍اگست)

سر ونسٹن چرچل مالاکنڈ میں

وزیراعظم لیاقت علی خان اور بیگم رعنا لیاقت علی خان بذریعہ ہوائی جہاز کراچی سے لاہور پہنچے۔ ہوا میدان میں (جو پچ مچ میدان ہے) گورنر پنجاب اور حکومت کے دیگر اُونچے اُونچے سول ملٹری افسروں نے ان کا استقبال کیا۔ سیاست دانوں میں مولانا عبدالباری آگے آگے تھے۔ یوں سُنا ہے کہ اندر خانے رسہ کشی جاری ہے۔ سیاست کا خمیر ہی کچھ ایسا ہے۔ ؏

کہیں محسوس ہوتی ہے کہیں معلوم ہوتی ہے

مولانا عبدالباری اپنی درویشانہ وضع کے باعث ایک انفرادیت کے مالک، ضرور معلوم ہوئے۔ میں نے لیاقت علی خان کو نئی دہلی میں "گُلِ رعنا" میں دیکھا تھا۔ چند برسوں میں تھک گئے۔ اپنے آزاد ملک کے وزیراعظم کو دیکھ کر دِل خوش ہوا۔

سہ پہر کو "میٹرو" میں علی گڑھ یونیورسٹی کے طلبائے قدیم نے وزیراعظم کے اعزاز میں عصرانہ دیا۔ ہم بھی مدعو تھے مگر ہم نے عصرانے کا صرف "عصر" ہی دیکھا۔ چند صحافیوں کو جگہ نہ ملی تو ہم سب اُٹھ آئے۔

لاہور میں علی گڑھ ہی علی گڑھ نظر آیا۔ اس علی گڑھ نے تحریکِ پاکستان میں اہم کردار ادا کیا۔ علی گڑھ کے طلبا اپنی یونیورسٹی کے حوالے سے ایک نظریاتی تحریک کی بنیاد رکھ سکتے ہیں جو طلبا آج قدیم ہیں۔ کل "قدیم" بھی نہیں رہیں گے۔

جو تھا نہیں ہے، جو ہے نہ ہوگا، یہی ہے اِک حرفِ محرمانہ تحریک زندہ رہ جائے گی۔

سرسید کا مدرسہ آخر ایک تحریک بن کر رہا کہ نہیں۔

(لاہور۔ ۲۲ راگست ۱۹۷۹ء)

مسٹر ونسٹن چرچل نے اپنی زندگی کا آغاز فوجی خدمت سے کیا۔ وہ ہمارے صوبہ سرحد میں مالاکنڈ میں بھی رہے۔ چترال کی مہم میں بھی شامل رہے۔ افریقہ کی اہم "بوئر وار" میں بھی دادِ شجاعت دی۔ بلکہ وہاں تو قید بھی رہے۔ اپنی قید کی دلچسپ روداد انہوں نے لکھی ہے۔ کچھ اقتباس (ترجمہ) محفوظ کر لینے کو جی چاہا۔

"ہمیں دیکھ کر ساتھ کے ایک شیڈ (SHED) سے کچھ بوئر ہمیں دیکھنے کو آ گئے۔ جیسے انہوں نے کبھی کوئی جنگی قیدی نہ دیکھا ہو۔ "بوئروں" میں دو نوجوان لڑکے بھی تھے۔ ہم شکل، ایک کو چھپاؤ دوسرے کو نکالو۔ بھائی بھائی۔ انگریزی رواں بولتے۔ نسلاً انگریز۔ پیدائشاً افریقی۔ اپنی پسند سے "بوئر شہریت" اختیار کر رکھی تھی۔ ان سے گفتگو چل نکلی۔ چھوٹا بھائی زیادہ تیز تھا وہ بولا۔

"جنگ ٹھیک ٹھاک ہی چل رہی ہے۔"

"ہاں۔ فی الحال"۔ میں نے جواب دیا۔ "بچو دیکھتے جاؤ۔ تمہیں برطانیہ عظمیٰ کی قوت کا ابھی اندازہ نہیں ہے"۔

ہمارے درمیان خاصی دیر تک خاصی نوک جھونک ہوتی رہی۔ آخر وہ دوستوں کی طرح رخصت ہوئے جاتے ہوئے اپنا کمبل مجھے دے گئے"۔

رات بھر نیند نہ آئی ــــ جنگ میں سچائی کس طرف ہے؟ جنگ کیا رُخ اختیار کرے گی؟ سینکڑوں تو کدار سوالات ذہن میں کسمساتے رہے۔ یہ بوئر کیسے لوگ ہیں؟ محاذ جنگ میں کس جیالے پن سے مسلح اور آزاد لوگ ــــ ہزاروں کی تعداد میں ــــ بارش میں بھیگتے گھوڑوں پر اُڑے جا رہے تھے؟ آخر یہ کچھ سوچتے تو ہوں گے؟ یہ تو شائد ہم سے بہتر لوگ ہیں۔ میرے جسم میں خنکی کی لہر سی دوڑ رہی ہے۔ ہمیں ایک دن

جنوبی افریقہ چھوڑنا ہوگا۔ یہ انجام کا آغاز ہے۔سورج کا دھارا امنڈار ہا تا آنکہ صبح ہوگئی
دریچے سے جھانکا تو رات کی بارش سے دُھلا ہوا سورج اور زیادہ چمک رہا تھا۔
(میں نے یہ طویل اقتباس دراصل چرچل کے آخری پیراگراف ہی کے لئے لکھا)
(لاہور۔ ۲۳ راگست ۱۹۴۹ء)

غالب مغلوب

"غالب" اخبار کے ڈائریکٹروں کا اجلاس کل کلہوتا آج جاکر ہوا۔شکر ہے کہ ہو تو گیا۔
"کورم" ہی پورا نہیں ہو رہا تھا۔ہمارے خان بہادر میاں احمد سعید پرسوں سے ڈائریکٹروں
کے انتظار میں دن بھر دفتر میں ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہتے۔لاہور اور قرب وجوار
کے ڈائریکٹروں سے بعضوں کو ٹیلی فون کیا۔بعضوں کو نئی "چٹھیاں دردفراق والیاں" بدست
جنرل منیجر محمد افضل خان (پنجابی کالج والے) لکھوائیں اور بھجوائیں ڈائریکٹر تو ملک بھر میں پھیلے
ہوئے تھے۔تعداد بھی بہت تھی۔ملک فیروز خان نون کی آواز پر تو یہ عالم تھا کہ

ع ایک ڈھونڈھو ہزار ملتے تھے

مگر اب نقشہ بدل چکا تھا۔ملک فیروز خان نون کی دلچسپی اخبار میں کم ہو چکی تھی۔بلکہ
سچ تو یہ ہے کہ اب ڈائریکٹروں کی دلچسپی خود ملک فیروز خان نون میں بھی واجبی ہی سی
رہ گئی ہے۔سیاست ممدوٹ اور دولتانہ کے تصرف میں ہے۔اخبار "غالب" کی عوامی
مقبولیت بھی اتنی ہی تھی جتنی مرزا اسداللہ خان غالب کے کلام کی ان کی زندگی میں تھی۔
میں نے ایک روز مولانا چراغ حسن حسرت سے اخبار کی مقبولیت کا نسخہ پوچھا۔مرشد نے
دوٹوک فیصلہ صادر کیا۔"غالب" نہیں چل سکتا۔نہ تم اخبار میں انعامی معمے دے سکو،
نہ اس اخبار کی جاگیردارانہ مسئولیت کو تبدیل کرسکو۔
بارے کہ اجلاس ہوا۔چند ڈائریکٹرز موجود تھے محمد افضل خان نے حسابات پیش کئے

چھاپے خانے کا قرض، کاغذ کا قرض، عملے کی تنخواہوں کا قرض، بجلی کٹ چکی تھی، ڈائریکٹران "غالب" کے پرانے پرچوں سے پنکھے جھل رہے تھے۔ ٹیلی فون ابھی تک محض اس وجہ سے باقی تھا کہ خان بہادر، میاں احمد سعید ابھی کل تک مواصلات کے محکمے میں ڈائریکٹر جنرل تھے۔ ایک کمرے میں ڈائریکٹران بیٹھے تھے اور دوسرے میں قرض خواہان عملے کی نمائندگی مابدولت کر رہے تھے۔

ڈائریکٹران کو فیصلہ کرنے میں پانچ منٹ نہ لگے وہ یہ کہ اخبار کے تابوت پر آخری کیل ٹھونکتے ہوئے کہا۔

ایں خیال است و محال است و جنوں

مگر جنرل منیجر محمد افضل خان آسانی سے دل ہارنے والے نہ تھے۔ انہوں نے اخبار کے اجراء کے حق میں دھواں دھار تقریر کی۔ انہوں نے کہا صحافت بلکہ ملک کی بدقسمتی ہو گی کہ غالب جیسا ثقہ اخبار بند ہو جائے۔ انہوں نے عملۂ ادارت میں سے مولانا نصر اللہ خان عزیز، شوکت تھانوی، شبلی بی، کام، شمس صاحب اور اس ہیچ میرز کے صحافتی و ادبی قدو قامت اور اپنی انتظامی صلاحیتوں کا بھی بطور خاص ذکر کیا۔ ڈائریکٹران کو غیرت بھی دلائی کہ کتنے شرم کی بات ہے کہ آپ جیسے صاحبانِ اثر و رسوخ کا اخبار بند ہو جائے۔ ان کی یہ بات کچھ غلط بھی نہیں تھی۔ اخبار کے ڈائریکٹروں اور سالانہ خریداروں میں غالب تعداد سابقہ خان بہادروں کی تھی۔ ان میں سے بیشتر اگرچہ مسلم لیگ کے دباؤ میں خطابات واپس کر چکے تھے مگر نجی گفتگو میں کہلاتے خان بہادر ہی تھے۔ چکوال کے ایک خریدار تو ڈبل خان بہادر تھے۔ یعنی خان بہادر ملک خان بہادر صاحب۔

محمد افضل خان کا تیر نشانے پر بیٹھا۔ چند خان بہادروں کو واقعی جوش آ گیا۔ انہوں نے کہا " اخبار جاری رہے گا۔ لائحہ عمل یہ طے پایا کہ محمد افضل خان صاحب ایک ماہ ملک کے طول و عرض میں چندے کا دورہ کرنے کے بعد ڈائریکٹران کا اجلاس دوبارہ طلب

کریں گے۔

"غالب" چلے یا بندر ہے۔ ہم یہاں سے اپنا پاندان اٹھا رہے ہیں۔

یں احمدیہ بلڈنگس میں انور خان انور کے پاس ٹھہرا ہوں۔ پڑوس میں رسالہ "شاہکار" کے کرتا دھرتا آصف صاحب رہتے ہیں۔ شام ن۔م راشد آئے تو اس مختصر اور تنگ و تار مکان کو دیکھ کر کہنے لگے۔ کس "بلیک ہول" میں پڑے ہو۔ وہ مجھے وہاں سے اپنے ہاں لے گئے راشد بے حد اداس ہیں۔ اپنے محکمے سے بہت نالاں ہیں۔ شام کو مولانا چراغ حسن حسرت کی طرف چلے گئے۔ لاہور میں دو تین گھنٹے کی "تانگہ گشت" رہی۔ دو تین مقامات پر ہاؤ ہو رہی۔ حسرت صاحب کے حضور حسرت دیا اس کا کیا گزر۔ راشد کھل اٹھے۔ میں نے مولانا سے راشد کی آزردگی کا کہا۔ بولے۔ "اس کے لئے آزردگی ہی اچھی ہے۔ چند اچھی نظمیں سرزد ہو جائیں گی"۔ (۲۵ اگست)

فیلڈ مارشل ایوب کی ایک جھلک

پنڈ دادن خان کے کیپٹن راجہ الطاف حسین سے بھرپور بیٹھک رہی۔ انہوں نے دونوں عالمی جنگوں کو اندر سے دیکھا ہے۔ اُن سے جب کبھی ملاقات ہوتی ہے یادوں کا الاؤ روشن ہو جاتا ہے۔ بیچوں بیچ کلکتہ، ناگپور ریلوے کا دھواں بھی اٹھتا رہتا ہے جب یہ وہ "گارڈ" رہے۔ انہوں نے جنرل ایوب خان کا ایک واقعہ سنایا۔ یہ ۱۹۴۵ء کا ذکر ہے۔ ایوب خان لیفٹیننٹ کرنل کے رینک پر برما میں آسام رجمنٹ کی ایک پلٹن کی کمان کر رہے تھے۔ اس پلٹن میں نہ سگنل کا ساز و سامان تھا۔ نہ مخابرات (INTELLIGENCE) کے اجزا۔ ان دو عناصر کی غیر موجودگی سے پلٹن کی کارکردگی متاثر ہو رہی تھی۔ انہوں نے کئی مرتبہ ان امور پر میجر جنرل ریس (RESS) اپنے جنرل آفیسر کمانڈنگ کی توجہ دلائی۔ مگر نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات۔ آخر کار کرنل ایوب خان نے ایک خط میں یہ لکھ دیا کہ جناب میں اس "کالی پلٹن" کو کیا کروں تو اس خط پر

جنرل ریس آگ بگولا ہو گئے اور انہوں نے بذریعہ تار کرنل ایوب خاں کو پلٹن کی کمان سے ہٹا کر نئی دہلی جنرل ہیڈ کوارٹرز میں بھیج دیا۔ معاملہ کمانڈر انچیف فیلڈ مارشل آکنلک تک پہنچا۔ انہوں نے ان کو نام آور شبیر دل پلٹن کی کمان پر فائز کر دیا۔

میں نے غالباً ۱۹۴۳ء میں نئی دہلی میں ایوب خاں کو کیپٹن الطاف کے یونٹ میں ان کے پاس بیٹھے دیکھا تھا۔ ایوب خاں اس وقت میجر تھے۔ اور انہوں نے برما کی جنگل گرین وردی پہن رکھی تھی۔ کیپٹن الطاف جنرل ہیڈ کوارٹرز کی سیکورٹی کے انچارج تھے۔

راجہ صاحب نے اپنی زمانۂ امن کی موجودہ زندگی بھی زمانۂ جنگ ہی کے لئے وقف کر رکھی ہے انڈو چائنا بھی رہے ہیں۔ یہ وہی علاقے ہیں جو سیام انام وغیرہ بھی کہلاتے ہیں۔ راجہ صاحب اوّل تو کسی محاذ پر نہیں رہے اور اگر کسی محاذ پہ نہیں بھی رہے تو جنگی لٹریچر کا مطالعہ اتنی باریکی سے کرتے ہیں جیسے گویا سٹاف کالج کا امتحان دینا ہو۔ سبق آموز واقعات بالخصوص ان کو بہت یاد ہیں۔ آج یہ واقعہ سنایا کہ فرانسیسی فوج کے جرنیلوں کے بیٹے عموماً فوج ہی کی نوکری کرتے۔ یہ روایات صدیوں سے چلی آ رہی ہے۔ جن دنوں انڈو چائنا کی جنگ جاری تھی۔ اکثر فرانسیسی جرنیلوں نے اپنے نوجوان کپتان اور میجر فرزندوں کو ملٹری سیکرٹری سے خود کہہ کر انڈو چائنا میں پوسٹ کرایا۔ ان میں سے کئی ان جنگلوں میں کھیت رہے۔

ہم باتیں کر رہے تھے کہ سڑک سے کالج کے طلباء کا ایک جلوس گزرا۔ طلبہ کسی مطالبے کے سلسلے میں مظاہرہ کر رہے تھے۔ شور و غل سے کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی۔ راجہ صاحب کو اس مظاہرے پہ اٹلی کا ایک مظاہرہ یاد آ گیا۔ بولے۔ اٹلی میں بھی بہت مظاہرے ہوتے تھے۔ مگر بے حد پُرامن، خاموش، ہاتھوں میں طغرے اُٹھائے اور چل پڑے۔ نعرہ بازی کی ضرورت نہ تھی۔ حکومت نے مظاہرہ دیکھ لیا۔ وہ متعلقہ لوگوں کے مطالبے سے آگاہ ہو گئی۔ چلو چھٹی ہوئی۔

"پولیس بھی آس پاس ہوتی تھی یا نہیں" ہم نے پوچھا۔

بولے۔ کیوں نہیں ہوتی تھی۔ مگر وہ راستہ نہیں روکتی تھی۔ صرف بدامنی کو روکتی تھی۔

(۲۴ اگست ۱۹۷۹ء)

وزیر اعظم لیاقت علی خان نے یونیورسٹی گراؤنڈ میں جلسۂ عام سے خطاب کیا۔ ڈیڑھ دو لاکھ انسانوں کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر تھا۔ انہوں نے پنجاب کے سیاسی انتشار پر تشویش کا اظہار کیا۔ انہوں نے لوگوں سے کہا۔ آپ کو جن لیڈروں پر اعتماد نہیں۔ ان کو کان سے پکڑ کر نکال دو۔ مولانا عبدالباری نے جلسے کی صدارت کی۔ ان کی تقریر لوگوں نے سنی ہی نہیں۔

طوطی کی کون سنتا ہے نقار خانے میں

رات مولانا چراغ حسن حسرت کے ساتھ شطرنج کی بازی رہی۔ شطرنج پر ہم لوگ کھانے سے پہلے بیٹھ گئے۔ بیٹھ گئے تو پھر کھانے کے لئے کون اُٹھتا۔ ساتھ ساتھ سبز چائے آتی رہی۔

(لاہور ۲۵ راگست ۱۹۴۹ء)

شملوں کا ضلع

چوہدری محمد اویس (۱۹۵۱ء میں جہلم سے پنجاب اسمبلی سے ممبر ہوئے) اُن کے فرزند چوہدری محمد الطاف حسین بھی صوبائی اسمبلی کے رکن رہے بلنے گئے۔ ضلعی سیاست میں تو وہ تھے ہی۔ اب صوبائی سیاست کی طرف مائل پرواز ہیں۔ سفر منزل بہ منزل طے ہو رہا ہے "اونچی پرواز" کے تیور اس سے بھی ظاہر ہیں کہ پگڑی کا "شملہ" اور اونچا ہو گیا ہے۔ اس جوانِ رعنا جیسی طرحدار پگڑی کم لوگ ہی باندھ سکتے ہیں۔ پگڑی کی حد تک چوہدری اویس کو ہم مسلمانوں کا مہاراجہ پٹیالہ کہہ سکتے ہیں۔ ضلع جہلم پگڑیوں کا ضلع ہے۔ میرے علم کے مطابق راجہ غضنفر علی خان اور کرنل سر شیر محمد خان آف دومیلی اور چوہدری محمد اویس آف لاھڑ کی پگڑیاں خصوصی شکوہ رکھتی ہیں۔ جلال پور شریف کے صاحبزادہ سر محمد مہر شاہ بھی بانکی پگڑی باندھتے ہیں مگر اُن کو پگڑی میں کبھی کبھی دیکھا۔ راجہ سر شیر محمد خان تو جن دنوں جنرل ہیڈ کوارٹر دہلی میں سٹاف افسر تھے تو جنرل سر ایلن ہارٹلے کے کمرے کے برابر کے کمرے کے برآمدے میں ان کی پگڑی آئینہ بند اسٹینڈ کی

کھونٹی پر ٹنگی ہوتی تھی۔آپ ان دنوں ہندوستان کی مرکزی اسمبلی کے ممبر بھی تھے۔

ذکر چوہدری ادریس کا ہو رہا ہے ان کے والد سردار بہادر کیپٹن شیر باز خان وکٹورین زمانے کے ممتاز سپاہی ہیں۔ سینہ ایک طرف سے دوسری طرف تک رنگارنگ تمغوں سے بھرا ہوا ہے۔ کپتان صاحب نے اولاد کی تربیت میں "ڈسپلن" کو کچھ اس خوبی سے برتا ہے کہ چوہدری ادریس کو دیکھنے کے بعد آدمی یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ فیاضت ایک فطری جوہر ہے یہ صرف مدرسے ہی سے نہیں پیدا ہوتی۔ ع

سکھائے کس نے اسماعیل کو آداب فرزندی

ادریس میرے بچپن کے دوست ہیں۔ ہمارے گاؤں قریب قریب واقع ہیں شام کو ہماری بکریاں اُن کے گاؤں میں اور اُن کی بکریاں ہمارے گاؤں میں استراحت کرتی ہیں ہم دونوں نے ۱۹۳۸ء میں اپنے قصبہ دینہ میں مسلم لیگ کی شاخ قائم کی اور نواب طالب مہدی خان (آف دارا پور) کی سر براہی میں دینہ کے بازار میں سکھوں کی خوفناک کرپانوں کے بیچوں بیچ جلوس نکالا بعد میں خاندانی لحاظ سے ہمارے اور ادریس کے سیاسی دھڑے الگ الگ رہے۔ ہمارا تعلق سر شیر کے دھڑے سے تھا۔ اور ادریس کا چوہدری فیروز الدین کے گروپ سے مگر ہماری ذاتی محبت اور موانست میں کبھی فرق نہ آیا۔ آج بھی وہ کہہ گئے ہیں کہ اگر تم نے اخبار نکالا تو میرے نام سے ایک ہزار روپیہ لکھ لو۔ مگر میں اس وجہ سے ادریس کی اتنی تعریف نہیں کر رہا۔ اگرچہ اس پیشکش کا تذکرہ بھی ضروری سمجھتا ہوں۔

(شیخوپورہ ۲۶ اگست ۱۹۴۹ء)

دو ماہ کے ناغے کے بعد روزنامہ "غالب" پھر نکل آیا۔ دو مہینوں میں شبلی بی۔کام کی کاہلی میں کچھ اور اضافہ ہو گیا۔ مگر صاحب جب یہ شخص قلم اٹھاتا ہے تو اس کے رگ و پے میں بجلی دوڑ جاتی ہے۔ اداریہ وہی مولانا نصر اللہ خان عزیز لکھتے ہیں اور وہ کاہی کالم جس کا عنوان "سخن گسترانہ" رکھا ہے شوکت تھانوی ریڈیو سٹیشن پر کام کرتے ہیں۔ نقد و ہاڑی پر کالم لکھتے ہیں ہم آدمی

کے ہاتھ ان کو پانچ روپے بھیج دیتے ہیں، وہ کالم بھیج دیتے ہیں۔ ؎

کیا خوب سودا نقد ہے اس ہاتھ دے اس ہاتھ لے

(لاہور۔ ۲۷؍ اگست ۱۹۴۹ء)

الیکشن میں کھڑا ہونے یا بیٹھ جانے کی باتیں

کچھ دن ہوئے کرنل سر شیر محمد خان گولڈن روڈ کوٹھی چھوڑ کر میلسن روڈ پر اُٹھ آئے ہیں۔ گولڈن روڈ کا نام تو سنہرا ہے مگر وہ کوٹھی پرانی تھی۔ اُس کی تاریخی عظمت تو زیادہ تھی مگر رہائش کی سہولت بہت کم تھی۔ حفیظا (کرنل صاحب کا پرانا خدمت گار) کو تو پرانی کوٹھی ہی پسند تھی کہ کوٹھی کا ماحول بھینس اور گائے کو مرغوب تھا۔ خود کرنل صاحب کو بھی نقل مکانی سے وحشت تھی۔ مگر اس کوٹھی میں بڑی ضیافتوں کے لئے کوئی کشادہ کمرہ نہ تھا۔ حالانکہ مالک مکان کوئی پرانے زمانے کا "رائے بہادر تھا"، کرنل صاحب اکثر ہنس کر کہا کرتے ہیں۔ "یہ بہادر" دل کا "بہادر" نہ تھا۔



میلسن روڈ کی کوٹھی وسیع بھی ہے اور جدید بھی کرنل صاحب نے آتے ہی مکان کو ایک (HOUSE WARMING) پارٹی سے گرم کیا۔ مہمانوں میں سر فیروز خان نون، نواب زادہ خورشید علی خان (رجن کے والد نواب ذوالفقار علی خان آف مالیر کوٹلہ کی موٹر کے بارے میں علامہ اقبال کا یہ مصرع ـــــ موٹر ہے ذوالفقار علی خان کا کیا خموش ـــــ "بانگِ درا" میں شامل ہے۔ سر شیر مرحوم اور نواب زادہ خورشید علی خان مرحوم آپس میں گہرے دوست تھے۔ دونوں ایک عرصہ تک متحدہ ہندوستان کی مرکزی اسمبلی کے ممبر بھی رہے۔ کرنل سر شیر محمد خان کے بڑے صاحبزادے (پاکستان بحریہ کے موجودہ سربراہ) ایڈمرل طارق کمال خان کی بیگم انہی نواب زادہ خورشید علی خان کی صاحبزادی ہیں) سر فیروز خان نون، نواب سر مظفر علی قزلباش، خان قربان

علی خان، جسٹس عطائے محمد جان، بریگیڈیئر سر حسام الدین، کرنل علی نون، کرنل مسعود (جو پاکستان آرمی میں "ٹامی" مسعود کے نام سے مشہور رہے) اور ڈاکٹر ایم ڈی تاثیر (جو قریب ہی رہتے تھے) اور کئی دوسرے مشاہیر و اکابر شامل ہوئے۔ خوب رونق رہی۔ ان میں سے اکثر اصحاب بیٹھے ہوئے شناورانِ سیاست ہیں۔ زیادہ تر الیکشن میں کھڑا ہونے یا بیٹھ جانے کی باتیں ہوتی رہیں۔



نواب زادہ خورشید علی خان نے ازراہِ مذاق ملک سر فیروز خان نون سے پوچھا۔ آپ کراچی میں وزیراعظم سے اپنی گورنری تو پکی کر آئے ہوں گے۔ انہوں نے نفی کے زاویے میں گردن ہلائی۔ خان قربان علی خان سے ان اکابرین کی ہنسی مذاق کی باتیں بھی خوب تھیں کہ میاں ممتاز محمد خان دولتانہ اُن کو "انکل" کہتے ہیں۔ یہ شگفتہ محفل ڈاکٹر تاثیر کے کلام پر ختم ہوئی۔ ڈاکٹر صاحب سے پہلے ایک غزل ہم نے بھی سنائی۔ شاعروں کی سب سے زیادہ داد جسٹس جان نے دی۔ حالانکہ بھرپور انگریزی وضع قطع میں یوں معلوم ہوتا تھا جیسے وہ اُردو جانتے ہی نہ ہوں۔

(۲۸ اگست ۱۹۴۹ء)

راجہ صاحب کے چھوٹے بھائی

شام راجہ محمد افضل خان کے ہاں گزری (جہلم کے راجہ محمد افضل خان۔ دانشور۔ سیاست دان۔ وفاقی حکومت میں جوائنٹ سیکرٹری رہے۔ سرکاری ملازمت میں ترقی دیہات تحریک کے علمبردار اور ملکی سیاست میں تحریک استقلال کی مرکزی قیادت کے ایک ستون) آج کل پنجاب ٹرانسپورٹ اتھارٹی کے سیکرٹری ہیں۔ راجہ صاحب ان سرکاری افسروں میں سے ہیں، جو سیاست دانوں سے گہرا رابطہ رکھتے ہیں۔ بلکہ شاید یہ کہنا

زیادہ درست ہو کہ بعض سیاست دان ان سے رابطہ رکھنا پسند کرتے ہیں۔ ان کے بارے میں بعض اوقات یہ شبہ ہونے لگتا ہے کہ آپ انتظامی مہارت زیادہ رکھتے ہیں یا سیاسی سوجھ بوجھ۔ آج ان کے ہاں شیخ حسام الدین صاحب سے ملاقات ہو گئی۔ شیخ صاحب کو ہم ایک مجلسِ احرار اسلام کے لیڈر کی حیثیت سے ہی جانتے تھے۔ آج معلوم ہوا۔ کہ وہ ایک بہت بڑے "ٹرانسپورٹر" بھی ہیں۔ ان کی "ٹرانسپورٹ" تیز رفتار ہو گی۔ مگر ان کی خوش گفتاری کا جواب نہیں۔ شعر و ادب سے بہت گہرا لگاؤ ہے حبیب جالب کے کئی اشعار سنائے۔ لطیفوں کا آبشار الگ چلتا رہا۔ کیوں نہ ہو۔ ہماری نصف صدی کی تاریخ ان لوگوں کے بیچوں بیچ گزری ہے۔

وہ بیٹھے تھے کہ اوپر سے راجہ صاحب کے چھوٹے بھائی ارشد آگئے۔ ان کے ساتھ حمید بھی تھے (بعد میں جنرل ہوئے۔ پاکستان آرمی کے چیف آف سٹاف رہے)۔ ارشد اور حمید دونوں ڈیرہ دون اکیڈمی میں اکٹھے رہے تھے۔ ارشد دوسری جنگ میں آئی۔ این۔ اے میں کرنل ہو کر اصل "رینک" مستقلاً کھو بیٹھے۔ حمید، پاکستان آرمی میں آگے بڑھ رہے ہیں۔ ارشد کم گو، گوشہ پسند انسان ہیں۔ ہم نے سنگاپور میں بھی (۱۹۴۵ء) ان کی یہی شہرت سنی۔ آج کل یوں بھی بجھے بجھے رہتے ہیں۔ آئی این اے میں جنرل کیوں نہ ہوئے۔ بہرحال تاریخ کے فیصلے عجیب ہوتے ہیں۔ ایسا بھی ہے کہ انہوں نے اپنا مستقبل دھندلا کر قوم کا مستقبل چمکا دیا ہو۔؟

شیخ حسام الدین نے بڑے زور سے ہمارے اخبار نکالنے کی تجویز کی حمایت کی۔ نصائح کے ضمن میں ایک نکتہ یہ سمجھایا کہ جو لوگ اختلاف رائے کرتے ہیں ان کا چرچا زیادہ ہوتا ہے۔ کئی اور یادگار جملے ان کے منہ سے سنے۔ مثلاً صحافت کی طاقت کے ضمن میں ان کی یہ بات کہ تحمل اور طاقت جڑواں بہنیں ہیں۔ اور یہ کہ نرمی اور مہربانی کو کمزوری نہ سمجھنا چاہیئے۔ شیخ حسام الدین ان جہاندیدہ بزرگوں میں سے ہیں جو کسی آدمی کو کھلتے

دیکھ کر پہچان جاتے ہیں کہ وہ کون ہے !

رات کا کھانا ۲۲ لارنس روڈ پر ڈاکٹر اختر حسین اعوان کے ہاں تھا۔ وہ تپ دق کے ماہر ہیں اور ہر وقت اس موذی مرض کی باتوں سے اپنے آس پاس ہراس پھیلائے رکھتے ہیں۔ چوکھا چنگا کھانا تپ دق کے خوف سے زہر مار ہوگیا۔ ردِ عمل کی کسل اتارنے کے لئے ایک مزاحیہ انگریزی فلم (THE MADE MR. JONES) دیکھنی پڑی۔ میجر علی گوہر جعفری بھی ساتھ تھے۔ میجر جعفری غالباً اب فوج میں نہیں رہنا چاہتے۔ رہنا چاہتے ہیں تو ترقی نہیں کرنا چاہتے۔ ورنہ اتنے موٹے کیوں ہوتے ؟ (۹ / ۲۹ اگست)

پردے میں باہمی نوک جھونک

رات ٹونی کے ہاں کھانا تھا۔ ناز بھابھی شوہر کی غیر ذمہ داری کا رونا رو رہی تھی۔ بقول مہمانوں کا کہنا تھا جس وقت ہم پہنچے پندرہ مہمان جمع ہو چکے تھے۔ دو چار کے پڑوس میں ٹیلی فون آچکے تھے کہ آرہے ہیں۔ خود ٹونی اب کھانے کی کمک لانے کے لئے آرٹلری بازار گیا ہوا تھا۔

مہمانوں میں رشید عطرے (میوزک ڈائریکٹر) اور شاد امرتسری (معروف شاعر) شامل ہیں۔ جاوید ارباب فن کا قدردان ہے۔ قدر دانی کا جذبہ آج کل کچھ اس لئے بھی زیادہ گہرا ہو چلا ہے کہ فوج سے سبکدوشی حاصل کر کے فلمسازی کے میدان میں کودنے کا قصد ہے۔ فوج میں کمیشن (۱۹۴۳ء) لینے سے پہلے بھی فلم سے وابستہ تھے۔ وابستہ تو خیر کیا تھے یہ کہئے کہ بمبئی میں (مشہور فلمی ہیرو) ظہور راجہ کی انگلی پکڑ رکھی تھی۔ ۱۹۴۶ء میں ظہور راجہ سے میں بھی بمبئی میں ملا تھا کہ وہ گورنمنٹ ہائی سکول جہلم میں آٹھویں جماعت میں میرے ہم سبق رہ چکے تھے۔ راجہ سے جاوید کی بات ہوئی تو انہوں نے مجھے بتایا کہ تمہاری فوج نے فلمی صنعت سے مستقبل کا ایک "خوبصورت ہیرو" چھین لیا۔ یہ "خوبصورت ہیرو" کئی برس

کے بعد اب پھر فلمی صنعت کی طرف پر تول رہا ہے۔ اپنی فلمیں خود بنائے گا، کہانی مکالمے، ہدایت کاری ہر چیز اپنی ہوگی۔ سرمایہ بھی اپنا کچھ زمین مردان کی تمباکو کی فصل سمیت فروخت کرے گا۔ کچھ رقم سبکدوشی پر گریجوائٹی کی سبیل سے مل جائے گی۔ کچھ قرضہ بھی ہوگا۔ بہرحال خود کوزہ و خود گل کوزہ۔ موسیقی رشید عطرے کے سپرد رہے گی۔ گیت شاد امرتسری لکھے گا۔

یہ کیسے ممکن ہے کہ جاوید کے گھر دعوت ہو اور "پیر و مرشد" (مولانا میجر چراغ حسن حسرت) موجود نہ ہوں۔ مولانا پہلے حسبِ معمول اپنے خول میں گم سُم بیٹھے رہے۔ رات کے بھیگتے ہی جب "خول" بھی بھیگ کر ٹوٹ گیا تو شعلۂ گفتار کی لپک دیدنی تھی۔ جاوید سے کہا "مولانا صاحب آپ کو شبنم سے سمندر کا راز مل گیا۔ مجھے اس سارے منصوبے میں صرف ایک خرابی نظر آتی ہے اور وہ ہو تم خود"

اس مرحلے پر ہم نے کہ جنوب مشرقی ایشیائی کمان کے زمانے سے مولانا کے ایڈی کانگ چلے آتے ہیں۔ چند مصرعے پیش کر کے مرشد کی ایک مسکراہٹ کا "تمغہ" حاصل کر لیا۔ مصرع جس کا روئے سخن ٹونی کی طرف تھا، یہ تھا:

خاک میں، کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہوگئیں (۳۰/اگست)

آج رات کے کھانے پر مولانا (چراغ حسن حسرت) نے اپنے ہاں (میکلوڈ روڈ پر) محفل جمائی۔ والدہ ظہیر نے پرسوں سے "گوشتابے" کا ایک "دیگ برا" چڑھا دکھا تھا۔ شرکاء میں ان کے فوجی دوستوں کی نمائندگی کرنل مجید ملک، مسعود، ٹونی، ریاض شمیم (ریٹائرڈ میجر جنرل) اور عباسی (افسوس اب نام یاد نہیں آرہا۔ انجینئر افسر تھے۔ دوسری جنگ عظیم میں سنگاپور سپلائی میں کپتان رہے۔ پاکستان میں لیفٹیننٹ کرنل کے رینک تک گئے)، کراچی سے "اتفاقاً" بھائی کپتان انعام قاضی آنکلے۔

شاعروں، ادیبوں میں مولانا عبدالمجید سالک، مولانا صلاح الدین احمد، عبداللہ بٹ، شورش کاشمیری، عبدالمجید بھٹی، کرمانی، محمود نظامی اور ریڈیو ہی کے سجاد سرور نیازی

لطائف اور اشعار کا آبشار جاری رہا۔ بلکہ لطائف کے پردے میں باہمی "نوک جھونک" سے
اندازہ ہوتا تھا کہ دنیا میں ایک جیسے دو انسان بھی بیک وقت سما نہیں سکتے۔ کجا دو بادشاہ؟
کج کلاہ وغیرہ وغیرہ۔ (۱۳ اگست)

لیڈیز کلب میں

"کشمیر کمشن" نے تصفیہ کا پانچواں فارمولا پیش کر دیا۔ وہ یہ کہ "ایڈمرل نمٹز" کو ثالث مان لیا جائے۔ امریکہ کے صدر ٹرومین اور برطانیہ کے وزیر اعظم اٹیلی نے بھی اپیل کی ہے۔ لہجہ دونوں کا ایسا ہے کہ جیسے ڈاکٹر تاثیر کا شعر ہو۔

چھوڑ دیجی اب پچھلی باتیں

جانے دو، مان بھی جاؤ

سوال یہ ہے کہ ہم یہ "خوفناک تجربہ" کیوں کریں۔ ہمارے جسم پر تو "ریڈکلف" کے لگائے ہوئے زخم ابھی بہت تازہ ہیں۔ ٹرومین کا اخلاص ہم نے دیکھ لیا ہے اور اٹیلی صاحب تو ہمارے پرانے مہربان ٹھہرے۔ انہوں نے کس مرحلے پر اور کس کس بہانے سے پاکستان کی مخالفت نہیں کی۔ ہم کو ڈسا نہیں۔

عجیب اتفاق ہے کہ آج ہمارے دوست چوہدری فضل حق نے مجھے اپنی ایک تازہ نظم جرمن "ایڈمرل ڈونیز" کے بارے میں بھیجی ہے۔ ادھر ایڈمرل ڈونیز۔ درمیان میں وارث عالم کا سمندر!

جاوید خشک آگیا اور لے گیا مرزا ادیب کے ہاں۔ وہ لاہور میں ادیبوں سے رابطہ پیدا کرنا چاہتا ہے۔ اس مہم کا آغاز مرزا ادیب سے بہتر نہیں ہو سکتا تھا کہ ان کو اس حلقے میں ایک

مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ مرزا صاحب کے ہاں رحمان مذنب اور شبلی بی کام بھی مل گئے۔ ایک تیر میں تین شکار!

(۴ ستمبر)

ساجد علی خان راز مراد آبادی ملنے آ گئے۔ وہ تبدیل ہوتے ہوتے ریڈیو پاکستان لاہور سٹیشن میں پوسٹ ہو گئے ہیں۔ راز سے ڈھنگ کی ملاقات کرنے کا لطف تو جاوید کے افسر میس میں ہی آتا۔ بہر حال ہم بے وقت کی راگنی الاپنے کے لئے "دفتر غالب" کے نیچے بلیو سٹار ریسٹوران میں جا بیٹھے، تخلیئے کی اوٹ کے لئے ایک سیاہ خانہ یہاں بھی موجود ہے ——— اسی کوٹھڑی کو ہم نے شعر و نغمہ سے روشن رکھا۔

راز۔ جگر مراد آبادی کا شاگرد ہے۔ غزل تو غزل اس کا ترنم بھی جگر ہی کے انداز میں ڈھلا اور ڈھلا ہوا ہے۔ البتہ جگر جتنے غیر مرتب ہیں۔ راز روزمرہ کی زندگی میں اتنا ہی مرتب ہے۔ راز سے پہلی مرتبہ میں غالباً ۱۹۴۲ء میں دہلی میں ڈاکٹر یادو رحیات کے ہاں مشاعرے میں ملا تھا۔ یہ اس وقت ایک نوخیز گورا چٹا نوجوان بلکہ چھوکرا تھا۔ مشاعرے میں یوپی اور پنجاب کے رنگِ سخن کے موضوع پر ہم دونوں میں کافی تلخی بھی ہو گئی۔ اس کے بعد وہ آج مجھے خود ملنے آ گیا۔ یہ اس کی بڑائی ہے۔ ہم نے اس واقعے کا تو آج کوئی ذکر نہ کیا۔ مگر دل ہی دل میں اس مشہور مصرعے سے لطف اندوز ہوتے رہے۔ ؎

بڑا مزہ اس ملاپ میں ہے جو صلح ہو جائے جنگ ہو کر

وزیر داخلہ خواجہ شہاب الدین نے لاہور کے صحافیوں کے اعزاز میں فلیٹی ہوٹل میں عصرانہ دیا۔ لاہور کے صحافیوں نے پنجاب مسلم لیگ کے معاملات میں خواجہ صاحب کی روش پر اچھے خاصے تند و تیز سوالات کئے۔ مگر خواجہ صاحب مشتعل نہیں ہوئے نہ چہرے کا رنگ بدلا یہ ایک وزیر کے لئے بڑی خوبی کی بات ہے۔ بظاہر ان کی شخصیت معمولی معلوم ہوتی ہے۔ مگر ملک کی سیاست پر اُن کا اثر غیر معمولی ہے۔

سرکاری افسروں میں حافظ عبدالمجید، سید فدا حسن (کمشنر) سید سعید جعفری (ڈپٹی کمشنر لاہور) بھی عصرانے میں موجود تھے۔ سید سعید جعفری شعری ادب کے بڑے رسیا ٹھہرے۔ چائے پر مجھے کہنے لگے۔ کوئی تازہ شعر سناؤ۔ میں نے یہ شعر سنا دیا۔

وزیرِ داخلہ کی بات میں کیا دخل منی کا
"نہیں" معلوم ہوتی ہے نہ ہاں معلوم ہوتی ہے

(۶ ستمبر)

"بادِ شمال" کی پیشانی کا ڈیزائن بنوانے کے لئے ـــــــ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ ان کا شمار ہمارے ملک کے چند بڑے آرٹسٹوں میں ہوتا ہے۔ انہوں نے پچاس روپے مانگے جو آرٹ کے لحاظ سے کم تھے۔ مگر ہمیں زیادہ معلوم ہوئے۔

اے کمال افسوس ہے تجھ پر کمال افسوس ہے۔ کمال پر کیا افسوس ـــــــ افسوس تو ہمیں خود اپنے حال پر کرنا چاہیئے۔

(۷ ستمبر)

آج خواجہ صاحب نے صحافیوں کو گورنمنٹ ہاؤس میں مدعو کیا۔ آج وہ صوبائی پریس ایڈوائزری کمیٹی کے ممبروں سے بات چیت کرنا چاہتے تھے۔ اس بات چیت میں مولانا عبدالمجید سالک، کرنل فیض احمد فیض، مولانا اختر علی خان، مسٹر حمید نظامی اور راقم الحروف شامل تھے۔ مجھے روزنامہ غالب کے چیف ایڈیٹر کی حیثیت سے اس کمیٹی میں نامزد کیا گیا ہے۔ غالب کا اپنا علیہ تو کیا ہوتا، یہ حمید نظامی کے اثر و رسوخ کا نتیجہ ہے۔ اگرچہ انہوں نے مجھ سے کبھی اس مروت کا ذکر نہیں کیا۔ افسروں کی سطح پر حکومت کی نمائندگی وفاقی سیکرٹری اکرام صاحب، صوبائی چیف سیکرٹری حافظ عبدالمجید اور میر نور احمد کر رہے تھے۔ نمائندگی کا انداز معاونت کا تھا۔ خواجہ صاحب اپنی میٹھی میٹھی بے تکلف گفتگو کے دوران کسی افسر کی طرف نگاہِ غلط انداز سے دیکھ لیتے تو وہ اعداد و شمار کا لقمہ پیش کر دیتا۔ ورنہ گفتگو کی ڈور خواجہ صاحب ہی کے ہاتھ

یں رہی۔ ہم لوگ بالخصوص حمید نظامی صوبہ سرحد کی وزارت پر بہت گرجتے برستے رہے۔ مگر خواجہ شہاب الدین ـــــ خان قیوم خان کی بڑی گرمجوشی اور اعتماد کے ساتھ مدافعت کرتے رہے۔

گورنمنٹ ہاؤس لاہور کو پہلی مرتبہ اندر سے دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ عالی شان ہے مگر وہ سنگاپور کے گورنمنٹ ہاؤس والی سطوت نہیں ہے۔ تاہم اس میں آ جاؤ تو پھر نکلنے کو جی نہیں چاہتا۔ دیواروں پر آویزاں چند تصاویر میں انگلستان کی زندگی کے مناظر نظر آتے ہیں خاص طور پر گھڑسواروں کے مظاہرے۔ سابق گورنروں کی بڑی بڑی تصاویر نے اس عمارت کو تاریخ کا نگارخانہ بنا رکھا ہے تاریخ کے لمس کو محفوظ رکھنا ضروری بھی ہے اس سے گزری ہوئی منزلوں کی نشاندہی ہوتی ہے۔ خوشیوں کے ساتھ ساتھ دکھوں کو بھی یاد رکھنا چاہیے۔

شام کو لیڈیز کلب میں "انجمن حقوق نسواں" کی دعوت تھی۔ لیڈی سر شفیع، لیڈی سر عبدالقادر، بیگم شاہنواز، بیگم سلمےٰ تصدق حسین اور فاطمہ بیگم جو یہاں تشریف رکھتی تھیں۔ اس تحریک کے ہر اول دستے کی رہنما ہیں۔ یہ سب خواتین حقوق نسواں کی بات اسلام کے حوالے سے کر رہی تھیں

(۷ ستمبر ۱۹۴۹ء)

دولت سے نفرت

عرصہ کے بعد گاؤں میں عید آئی۔ یہ کہیئے کہ ہم عید پر گاؤں آ گئے۔ عید قربان، منظر تو وہی ہے جو بچپن سے دیکھتے چلے آئے ہیں۔ مگر اب بچپن کہاں یوں لگتا ہے جیسے بچپن کی طرح عید بھی پیچھے رہ گئی ہے۔ بابا فضلو شاہ کی بیریاں بھی بوڑھی ہو گئی ہیں۔ ورنہ ان کی کڑیل شاخوں پر عید کے دن پینگیں جھولتی تھیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح منگلا کے قریب دریائے جہلم رُخ موڑ رہا ہے اسی طرح عید کی ہماہمی کا رُخ بھی تبدیل ہو رہا ہے۔ قربانی پہلے سے زیادہ دی جا رہی ہے۔ مجھے یاد ہے پہلے ہم اور بابا حسین لوہار گائے میں حصہ ڈالا کرتے تھے۔ اب کے بابا حسین نے اپنی الگ گائے قربان کی ہے۔ وہ تو کئی برس پہلے حج کی سعادت بھی حاصل کر چکے ہیں۔ تب مکے سے مدینہ منورہ

کا سفر اونٹوں پر کیا جاتا تھا۔ ہمارے ٹبیر میں ابھی تک یہ روایت قائم ہے کہ عید پر سب لوگ گھر آجاتے ہیں اور دو تین روز تک کھانا بھی سب اکٹھے کھاتے ہیں جو عمر میں جتنا بزرگ اس کا نمبر اتنا ہی پہلے۔ اس عمل میں سال بھر کی جمع شدہ خفگیاں دُھل جاتی ہیں۔

سہ پہر کو چچا چنن شاہ صاحب کی سرپرستی میں نیزہ بازی کا "پِڑ" بھی جم گیا۔ اب اگرچہ ان کے اپنے "کِلّے" پر تو کوئی گھوڑی نہیں رہ گئی۔ مگر آنکھوں میں تو دَم ہے۔ گھوڑسواری کے شوقین خود گھوڑیاں لے کر پہنچ جاتے ہیں۔ ہنر آزمائی کا بھرپور مظاہرہ ہوتا ہے اور وہ بھی رضاکارانہ۔ اسپیچ میں نہ کوئی انعام ہے نہ چاندی کا کپ۔ نہ ڈپٹی کمشنر۔ اقبال نے سچ کہا ہے

؎ ہر چیز ہے محوِ خود نمائی

چوہدری مولاداد کے بیل دیدنی ہوتے ہیں۔ وہ ان موقعوں پر اپنے بیلوں کی جوڑی میدان میں اتار دیتے ہیں۔ ان کے گرد مداحوں کا علیحدہ جھرمٹ ہوتا ہے۔ چوہدری صاحب اپنے گاؤں سے ڈھول بجاتے آتے اور ڈھول بجاتے جاتے ہیں۔ علاقے کے لوگوں کو سال بھر بیلوں کی آمد و رفت کا انتظار رہتا ہے۔

چچا مراد علی شاہ کی باتوں کا اپنا رس ہے۔ آج ان سے بھی بیٹھک رہی۔ میں تو ان کی باتیں سننے کو ترستا رہتا ہوں۔ کہیں آمنا سامنا ہو تو سلام کر کے انہیں بٹھا لیتا ہوں یا اُن کے ساتھ ساتھ پیدل چلا جاتا ہوں۔ ان پر صحیح معنوں میں یہ مثل صادق آتی ہے کہ ؏

وہ کہیں اور سُنا کرے کوئی

ان کی باتیں سن کر مجھے ہمیشہ خیال آتا ہے کہ فیادت اور دانائی صرف مدرسے ہی سے پیدا نہیں ہوتی۔ میں نہیں سمجھتا کہ چچا مراد شاہ کبھی سکول گئے ہوں۔ لیکن آج انہوں نے جو بات کہی وہ نوٹ کرنے کے لائق ہے۔ باتوں باتوں میں جہلم کے لکھ پتی ساہوکار رامے شاہ کا ذکر آگیا تو چچا نے کہا رامے شاہ کی اس خوبی کا اعتراف کرنا چاہیئے کہ اس شخص کو دیکھ کر دولت سے نفرت ہو جاتی ہے۔ عید گاؤں میں گذار کر راولپنڈی آگیا۔ (۲۵ ستمبر ۱۹۴۹ء)

غسل خانے کا پنچھی

لاہور سے ڈاکٹر اختر کے چھوٹے بھائی اصغر بھی آ گئے۔ مہمان تو آتے جاتے ہی رہتے ہیں۔ مگر اصغر تو الگ کمرے اور الگ غسل خانے کے بغیر رہ ہی نہیں سکتا۔ الگ کمرے کا انتظام تو خیر کیا جا سکتا ہے مگر مکان میں غسل خانہ صرف ایک ہے۔ کلائیڈ روڈ (راولپنڈی) پر واقع اکثر مکان پرانے طرزِ معاشیات کی "اکائی" کے اسلوب پر تعمیر شدہ ہیں۔ ایک خاندان۔ ایک مکان، ایک چولہا۔ ایک غسل خانہ، ادھر اصغر صاحب غسل خانے میں جاتے ہیں تو نکلنا بھول جاتے ہیں۔ دن میں تین مرتبہ لباس بدلتا ہے۔ اور لباس ہر بار نہا کر بدلتا ہے۔ صبح و شام حجامت، وقت کی شامت، انگریزی کا ایم اے پاس، ابھی تک آزاد ہے۔ نہ سرکار کی ملازمت نہ بیوی کی۔ ملازمت کی اُن کی طرف سے ایک ہی شرط ہے کہ دفتر میں الگ کمرہ اور الگ غسل خانہ دیا جائے۔ نہ غسل خانہ ملتا ہے نہ ملازمت، ملازمت کے سلسلہ میں ایک مرتبہ لاہور میں میر نور احمد صاحب (ڈائریکٹر تعلقات عامہ پنجاب) سے ملنے نیڈوز ہوٹل گئے تھے۔ ایک ایک کمرے میں دو دو اور تین تین انفارمیشن افسروں کو بیٹھا دیکھا تو اپنی بات کئے بغیر اُلٹے پاؤں لوٹ آئے۔ میر صاحب نے پوچھا کہو "کیسے آئے تھے؟" کہا۔ "آپ ہمارے بزرگ ہیں۔ سوچا۔ پوچھ آؤں کہ میرے لائق کوئی خدمت ہو اور میں آپ کے کسی کام آ سکوں تو مجھے بڑی خوشی ہوگی۔" دن بھر سرخ پنسل لے کر انگریزی کے اخباروں میں زبان اور املا کی غلطیاں نکالتے رہتے ہیں اور آنے جانے والوں کو تصحیح شدہ اخبار فخریہ دکھاتے ہیں کہ ؎

انگلش ہے جس کا نام ہمیں جانتے ہیں داغ

دوسرا شغل گورنمنٹ کالج لاہور کے سابق پرنسپل سوندی کو، جو دہلی میں ہیں، ہفتے کے ہفتے خط لکھنا ہے۔ بقول غالب ؎

خط لکھیں گے گرچہ مطلب کچھ نہ ہو

یہ چونچلے اس لئے چل رہے ہیں کہ منہ میں چاندی کا چمچہ لے کر پیدا ہوئے ورنہ آٹے دال کا بھاؤ معلوم ہو جاتا۔

مزے کی بات یہ ہے کہ راولپنڈی میں آپ فوج کے تعلقاتِ عامہ میں اپنی ملازمت کے امکانات کا جائزہ لینے آئے ہیں۔ کرنل شہباز خاں کی کوئی "درک" لائے ہیں۔ میں حیران ہوں کہ یہ ان کو کیا سوجھی، فوج میں ان کو غسل خانہ کہاں ملے گا۔

اکیلے اصغر صاحب سے تو ہم عہدہ برآ ہو بھی لیتے مگر مشکل یہ ہے کہ نوشہرہ سے زین العابدین اُترا ہوا ہے بلکہ ایک مہینے سے گیا ہی نہیں، پٹرولیم کی اچھی خاصی انسپکٹری چھوڑ کر اب ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھا ہے۔ اس کا بھی زیادہ وقت غسل خانے میں گزرتا ہے۔ اپنے خاندان کے بزرگوں سے (جن میں بعض سفیر شامل ہیں) اس نے دو چیزیں سیکھی ہیں۔ نماز پڑھنا اور رات کا کھانا ڈنر سوٹ پہن کر کھانا۔ احتشام (میرا بیٹا جس کی عمر اس وقت چند ماہ تھی) کو بہلانے کھلانے میں جتنی ریاضت یہ کر رہا ہے، مجھ سے بھی نہیں ہوتی۔

(۱۸ر اکتوبر ۱۹۴۹ء)

ذاتی ساکھ

لاہور میں تین دن کی دوڑ دھوپ کے بعد واپس آ گیا۔ دوڑ زیادہ دھوپ کم۔ موسم تو نیم رس تھا۔ مگر دل میں راکھ اُڑتی رہی۔ اس بار بھی اخبار کے "ڈیکلریشن" کی چارہ جوئی میں "خجل خوار" ہونا پڑا۔ ایک کے بعد ایک کئی کنوئیں جھانک کر دیکھے۔ ؏

جس طرح پانی کنوئیں کی تہہ میں تارا ہو گیا

چوہدری محمد حسین نے بہت وقت دیا۔ اپنی پریس برانچ کو بھی بہت پریس (PRESS) کیا۔ حرفِ تسلی دیا۔ ہمت بندھائی۔ اس مرتبہ کرنل مجید ملک کی چٹھی بھی ان کے نام لے گیا تھا۔ لیکن وہی بھائی انعام قاضی والی بات کہ نہ چوہدری صاحب کی گرم جوشی کا اندازہ ہوتا ہے نہ

سرد مہری کا ـــــ ٹیلی فون کی "فال مغال" سے اندازہ ہو رہا تھا کہ عہ

سارے جہاں کا درد انہی کے جگر میں ہے

کوئی نصف گھنٹہ مولانا چراغ حسن حسرت سے کسی لفظ کی تذکیر و تانیث پر گفتگو ہوتی رہی۔ حسرت صاحب حسرت نہ نکال سکے تو آپ نے مولوی محمد شفیع صاحب سے رجوع کیا۔ پھر کہیں ہماری طرف مراجعت فرمائی۔

لاہور میں اپنے مولانا (حسرت صاحب) سے تو ملنا تھا ہی۔ ان کے علاوہ مولانا عبدالمجید سالک، ڈاکٹر تاثیر، راجہ محمد افضل خان (سول سروس) اور حبیب ملک (پاکستان پولیس) سے بھی ملاقات رہی۔ تاثیر اپنے گھر پر چند دانشوروں میں۔ جن میں خضر تمیمی اور خلیل صحافی موجود تھے، پیر مغاں بنے بیٹھے حسن عسکری کی چمڑی اُدھیڑ رہے تھے۔ خضر تمیمی کبھی بڑے تیکھے مزاج گو شاعر رہے ہیں۔ آجکل خالص دانشوری اور بھرپور وکالت نے ان کو گرفت میں لے رکھا ہے۔ میں جب تک وہاں رہا مجھے ڈاکٹر صاحب سے شملے میں اپنی کئی برس پہلے کی ملاقات یاد آتی رہی۔ یہ شاید ۱۹۴۳ء کی بات ہے۔ تاثیر وزارتِ محنت میں ڈپٹی ڈائریکٹر تھے۔ میں اور آغا اکرم (کراچی کے متمول سوداگر) اور یامین نقش (وفاقی حکومت میں جوائنٹ سیکرٹری رہے۔ آج کل اسلام آباد میں گوشہ گیر ہیں) گاہے گاہے ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ حاضر ہوئے تو ڈاکٹر تاثیر کی والدہ محترمہ بھی لاہور سے ان کے پاس شملے آئی ہوئی تھیں۔ ہم لوگ دیوان خانے میں بیٹھے تھے۔ والدہ کا پلنگ ملحقہ کمرے میں تھا۔ وہ ہر پانچ سات منٹ کے بعد بیٹے کو، خالص لاہوری پنجابی میں پکارتیں ـــــ پُت محمد دین ـــــ وے پُت محمد دین اور ہم دیکھتے کہ ڈاکٹر ایم۔ ڈی تاثیر ماں کی آواز سنتے ہی آٹھ دس برس کے "محمد دین" کی طرح بے قرار ہو کر بھاگ کر اندر جاتا۔ لبیک میں پکارتا ہوا۔

"آیا بے جی"

"آیا بے جی"

ایک مرتبہ ہم نے ڈاکٹر ایم۔ ڈی تاثیر کو "بے جی" کے لئے حقے کی چلم بھرتے بھی دیکھا۔



محرم الحرام کی پانچویں ہو گئی تھی مگر مجھے ابھی تک کسی مجلس میں حاضری کی توفیق نہ ہوئی۔ حافظ کفایت حسین صاحب کی مجلس میں حاضری کا ارادہ کر لیا۔ مجھے ذاتی طور پر حافظ صاحب اور مولانا اظہر زیدی کا اندازِ خطابت پسند ہے۔ مگر جب اندرون موچی دروازے کی طرف جا رہا تھا کہ بیرون موچی دروازے نے قدم روک لئے۔ باغ میں سید عطاء اللہ شاہ بخاری کا خطاب جاری تھا۔ بڑھاپے کے باعث گھن گرج میں تو قدرے کمی کا احساس ہوا تاہم شیرینی و لطافت کا جادو وہی تھا۔ حضرتِ داغ جہاں جا کر کھڑے ہوئے دو گھنٹے تک وہیں کھڑے رہے۔ اُن کی سیاسی جماعت (مجلس احرار) کی ساکھ ملک میں ختم ہو چکی۔ مگر اس شخص کی ذاتی ساکھ شاید کبھی ختم نہ ہو گی۔ جلسے میں بیس ہزار سے کم سامعین نہ تھے۔ اتنے ہی لوگ گھروں کی منڈیروں سے شیر کی دھاڑ سُن رہے تھے۔

(لاہور ۷۔۲ر اکتوبر ۱۹۴۹ء)

کچھ مجرّب نسخے

پرسوں رات کوئی بارہ بجے دروازے پر دستک ہوئی۔ مسعود اور قاضی کھڑے تھے۔ پوچھا ــــ "خیریت"؟ ــــ بولے۔ "خیریت ــــ بلکہ خوشخبری۔ اسی وقت اُٹھو ایک بجے کی گاڑی سے لاہور چلے جاؤ"۔

کیوں؟

بولے۔ "ڈیکلریشن گورنر ہاؤس میں تیار پڑا ہے۔ تم نکلوا لاؤ۔

عرض کیا۔ "میں کھجور پہ اٹکے ہوئے ڈیکلریشن کو تو نکلوا نہ سکا۔ آسمان پر سے کیسے اتاروں گا۔

بولے ــــ "حبیب ملک کے پاس چلے جاؤ انہی نے ٹیلی فون پر خبر دی ہے۔ چو بولے

سو کنڈی کھوئے"۔

مسعود اور قاضی مجھے گاڑی پر سوار کر کے گھر واپس آ گئے۔ وہ نہ ہوتے تو شدید رش کی وجہ سے میرا گاڑی میں داخل ہونا مشکل ہو جاتا۔ انہوں نے گویا مجھے عملاً اٹھا کر ایک کھڑکی سے سیکنڈ کلاس کی بوگی کے اندر پھینک دیا۔ میں دو مسافروں کے اُوپر جا پڑا۔ وہ غضبناک تو ہوئے مگر کسمسا کر رہ گئے۔ ہم نے غنیمت جانا کہ مار کٹائی کے بغیر گاڑی میں کھڑا ہونے کی جگہ مل گئی تیکنیکی کی صرف یہ صورت تھی کہ بوگی میں آٹھ، دس مسافر کھڑے تھے۔ جہلم تک کھڑے رہے۔ وہاں سے بیٹھے اور گوجرانوالہ میں مسافروں کا ریلا اتنا زبردست آیا کہ سیٹ پر دراز ہونے کا حوصلہ نہ ہوا سویرا ابھی ہو چلا تھا۔ سفر تکلیف دہ رہا۔ جب سے فرسٹ کلاس ہاتھ سے نکلی ہے۔ گاڑی میں مسافروں کے ہجوم سے سخت وحشت ہوتی ہے۔ سمجھوتہ کرنا ہی پڑے گا۔ مگر

واقعہ سخت ہے اور جان عزیز

سیکرٹریٹ میں حبیب ملک اور خان بہادر محمد حسین صاحب سے ملا۔ حبیب نے گورنر کے سیکرٹری سے رابطہ قائم کیا۔ معلوم ہوا کاغذ تو ڈاک سے چلے بھی گئے۔ آج خان بہادر صاحب کے تپاک میں غیر معمولی گرمجوشی پائی۔ انہوں نے اخبار کی کامیابی کی دعا فرمائی۔ کچھ مجرب نسخے بھی بتائے۔ تاخیر کی معذرت کرتے رہے حالانکہ تاخیر کے ذمہ دار وہ نہ تھے۔ ان بزرگوں کا ظرف دیکھئے کہ اس عمل میں کاغذات کو جن جن ـــــ "مقاماتِ آہ و فغاں" ـــــ سے گزرنا پڑا تھا۔ اُن کی نشاندہی سے بھی گریز کیا۔ شام کو مولانا حسرت کے ساتھ ہاؤ ہو رہی۔ راتوں رات ڈاکٹر اختر حسین کے ساتھ ان کی موٹر میں خیر سے بدھو گھر کو آئے۔

(۳۰ اکتوبر)

عاشورہ محرم الحرام ـــــ بھائی صاحب کا تار آیا پڑا تھا کہ ضرور پہنچو۔ وہ خط بھی لکھتے ہیں تو عموماً یہ لکھتے ہیں کہ خط کو تار سمجھو ـــــ یہ تو تھا ہی تار ـــــ چل پڑے ـــــ موٹر ہماری ـــــ ڈرائیونگ قاضی بھائی کی کہ وہ باجرے کی روٹی کھانے کو ترسے ہوئے تھے اچھوٹی سی "مارس" کو

گاؤں کے بنے باڑے ہیں لے کر جانا ہے تو سخت زیادتی مگر مجبوری تھی۔



ہم کوئی ساڑھے دس بجے گاؤں رچک عبدالخالق ضلع جہلم) جا پہنچے۔ بیٹھک مہمانوں سے بھری ہوئی تھی۔ بھائی صاحب نے تار محض اس لئے بھیجا تھا کہ اتنے مہمانوں کی آؤ بھگت کرنے کے لئے مجھے اُن کا ہاتھ بٹانا چاہیئے۔ جہلم لے جا کر وہ مجھے بعض اپنے ہم عصر مجسٹریٹوں سے بھی ملوانا چاہتے تھے۔ تاکہ میں ان کی غیر حاضری میں بھی براہِ راست سفارش کر لیا کروں۔ گاؤں میں حسبِ معمول لوگوں کا بہت ہجوم تھا۔ امام باڑہ میں عاشورے کی مجلس۔ مسجد میں سید غوث شاہ صاحب کی مجلس وعظ۔ دونوں طرف شہید کربلا کے فضائل کا تذکرہ مبارک!

(۲ر نومبر)



"ڈیکلریشن" آج بھی موصول نہیں ہوا۔ نورالحسن جعفری اور (ممتاز شاعرہ) ادا جعفری ہمارے دفتر کے پڑوس میں رہتے ہیں۔ ہماری ڈاک بعض اوقات اُن کے ہاں تقسیم کر دی جاتی ہے۔ اُن سے بھی پوچھ دیکھا۔ ع

تسکین کی صورت نہ اُدھر ہے نہ اِدھر ہے

ڈپٹی کمشنر سے ایک تار خان بہادر چوہدری محمد حسین صاحب کو بھجوایا۔ حفیظ جالندھری صاحب کو بھجوایا۔ حفیظ جالندھری صاحب نے گورنر گورمانی سے ٹیلی فون پر بات کرنا چاہی۔ مگر پہلے تو کئی گھنٹے تک نمبر نہ ملا۔ پھر گورنر صاحب نہ ملے۔ ہم نے اُن سے اخبار کے افتتاحی اجلاس کی صدارت کی درخواست بھی کر رکھی ہے۔

(۳ر نومبر)

کبھی درویشوں کی باری

اخبار کا ڈیکلریشن آج بھی نہیں پہنچا۔ اب یہ ڈاک کے پیٹے میں جا پڑا ہے۔ ہم نے ڈپٹی

کمشنر راولپنڈی سے ایک اور تار خان بہادر چوہدری محمد حسین کو دلوا دیا۔ اخبار جاری ہوگا تو انشاءاللہ ہمارے ایک ایک شذرے پر بقول شخصے ایوانِ حکومت میں تھرتھلی برپا ہو جایا کرے گی۔ مگر اب تو کوئی پوچھ نہیں رہا کہ بھیا کیسی ہے؟ روزنامہ "غالب" ہی کا ایک واقعہ یاد آگیا۔ اخبار ابھی نیا نیا نکلا تھا۔ پرانا تو وہ ہونے بھی نہ پایا کہ ؎

حسرت ان غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مرجھا گئے

بہر حال "غالب" میں جب ہم نے پنجاب کے صوبائی سیکرٹری ہیلتھ کرنل ملک کے خلاف مضامین کا سلسلہ شروع کیا تو دوسری ہی قسط پر چیف سیکرٹری سید فدا حسین نے ہمیں یاد فرمایا طلب نہیں کیا۔ چائے پر مدعو کیا۔ جہاں کرنل ملک بھی موجود تھے۔ تو یہ ٹھاٹھ ہوتے ہیں۔ اربابِ صحافت کے چلئے۔ ؎

کبھی درویشوں کی باری کبھی سلطانوں کی

ایک اور پریشانی بھی سر اٹھا رہی ہے۔ اگرچہ ہمارے مسعود صاحب اس پر بھی خوش ہیں کہ ہمارے ہاں کوئی چیز تو سر اٹھا کر چل رہی ہے۔ پریشانی یہ ہے کہ ہم نے نواب مشتاق احمد گورمانی (جو اُس وقت غالباً وزیر امورِ کشمیر تھے) سے اخبار کی افتتاحی تقریب کی صدارت کی درخواست کر رکھی ہے۔ ان کی منظوری بھی آچکی ہے۔ اُن کے پرائیویٹ سیکرٹری نصرت صاحب ہفتے میں ایک مرتبہ پیش رفت کے بارے میں پوچھ گچھ کرتے رہتے ہیں۔ یہ نواب صاحب کی شفقت ہے۔



ہماری اُس زمانے کی یاد اللہ ہے۔ جب وہ (۱۹۴۲ء میں) شملے میں مرکزی محکمہ محنت کے ڈائریکٹر جنرل تھے۔ اور ڈاکٹر ایم ڈی تاثیر ان کے ڈپٹی تھے اور وہاں کی ثقافتی سرگرمیوں کی بہت سی رونق انہی کے دم سے تابندہ تھی۔ ضمناً یاد آگیا۔ گورمانی صاحب کا یہ "حوصلہ" اپنی جگہ بے حد قابلِ داد ہے کہ وہ پنجاب اسمبلی کے ممبر اور صوبائی حکومت سے پارلیمنٹری سیکرٹری ہونے کے باوجود "ڈائریکٹر جنرل" کے عہدے کے لئے ایک اُمیدوار کی حیثیت سے "انٹرویو"

کی قطاروں میں کھڑے ہوتے رہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اُن کو اپنی زمینداری پر ہی نہیں اپنی ذاتی لیاقت پر بھی اعتماد ہے۔ اب وزیر کی حیثیت سے وہ بے حد مصروف ہیں۔ سُنا ہے کہ رات کو دیر تک کام کرتے ہیں۔ اس لئے صبح کے وقت عموماً دیر سے ملاقاتیوں کو ملتے ہیں۔

خبر ہے کہ گورمانی صاحب کل بیرونی ممالک کے دورے پر جارہے ہیں۔ ہماری سمجھ میں نہیں آرہا کہ ان کے "نعم البدل" کا انتظام کس طرح کریں۔ وزیروں کی تو کمی نہیں۔ ان میں سے بعض ایسی تقریبات کے لئے دیدہ و دل فرشِ راہ بھی کئے رکھتے ہیں۔ مگر ایک تو وزراء کا مستقر کراچی ٹھہرا دوسرے یہ کہ گورمانی صاحب والی شیرینیٔ گفتار کہاں سے آئے گی۔



آج ایک شعر نے تڑپا دیا۔ شاید ہمارے حسبِ حال تھا۔ شفیق الرحمان سے سنا مصنف کا نام معلوم نہیں۔ کوئی پرانا شاعر ہے۔ رنگ سخن گو پرانا ہے مگر ایسے شعر صدیوں کے ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ ہمیشہ سرسبز۔ ہر زماں جاتے دِگرا شعر!!

اپنے ہی ہاتھ سے دیدے جو مجھے دینا ہے
میری تشہیر نہ فرما مجھے سائل نہ بتا

(۴ر نومبر ۱۹۴۹ء)

طوفانی سمندر کی طرف

کفر ٹوٹا خدا خدا کر کے ——— !

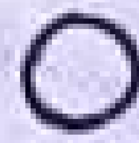
کتنا زندۂ جاوید مصرع ہے۔ جو زندگی کے کس کس موڑ پر آدمی کے ذہن میں ستارے کی طرح ٹوٹے جاتا ہے۔ جگمگا اٹھتا ہے۔

آج اخبار "بادِ شمال" کا ڈیکلریشن مل گیا۔ وہ دستاویز آ گئی جس کے انتظار میں ہماری آنکھیں اور ٹانگیں سُوکھ چلی تھیں۔ اللہ اللہ کاغذ کے اس پُرزے نے ہمیں کتنا چکر ائے رکھا

کتنے کنوئیں جھنکوائے۔ نقصانِ مایہ الگ، شماتتِ ہمسایہ الگ۔ بہر حال ؏

افلاک سے آتا ہے نالوں کا جواب آخر

ہمیں یہ پروانہ ملتے ہی کام میں جُٹ جانا چاہیے تھا۔ مگر آج کا دن تو ہم نے "پروانے" کے پروانہ وار خیر مقدم میں گزارا۔ راولپنڈی کلب میں باقاعدہ "جشنِ پروانگی" منایا گیا۔ اتفاقاً ریاض شمیم بھی آ گئے۔



رات شورز ہوٹل میں مسعود کے ہاں چند دوستوں کو کھانے پر مدعو کیا۔ زین بھابی نے (ان کا تعلق سنگاپور سے ہے) دسترخوان کو ایسی ایسی لذیذ "ملائی ڈشنز" سے آراستہ کیا کہ آدمی دیکھتا ہی رہ جائے اور کھاتا ہی رہ جائے۔ جاوید خٹک بھی موجود تھا۔ وہ بار بار یہ شعر الاپتا رہا۔

اچھا ہے دل کے پاس رہے پاسبانِ عقل
لیکن اسے کبھی کبھی تنہا بھی چھوڑ دے

سہ پہر کو راولپنڈی کلب میں اور پھر رات کو کھانے پر احباب سے افتتاحی تقریب کے خدوخال کے بارے میں مشورہ ہوتا رہا۔ سرمایہ ہمارے پاس پر زیادہ نہیں۔ گزشتہ چند ماہ میں عملے کی تنخواہ کے تاوان نے ہماری کمر توڑ دی ہے۔ مالی حالت اچھی نہیں۔

صورتِ حال کا تقاضا یہ ہے کہ قدم پھونک پھونک کر اٹھایا جائے گا۔ مگر ناک تو اونچی رکھنی ہے۔ "روزنامہ تعمیر" کا مقابلہ تو کرنا ہے۔ خواہ اس میں تخریب کا دروازہ ہی کیوں نہ کھل جائے۔ مسعود "فن فیئر" FUN FAIR کے حق میں نہیں۔ مگر قاضی بھائی PRESTIGE اور وضعداری کو بڑی اہمیت دیتے ہیں۔ کاروباری لحاظ سے بھی اس کا خیال ہے کہ ؎

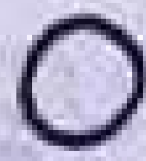
مایہ کو ملے مایہ کر کر لمبے ہاتھ

یعنی مایہ حاصل کرنی ہے تو مایہ خرچ کرو انہوں نے پانچ سو مہمانوں کی فہرست ٹائپ کروا رکھی ہے۔ ان میں دو ڈھائی سو کے قریب ہمارے فوجی احباب و اکابر ہیں جو نہ چندہ

دیں نہ اشتہار دیں مگر ان کے بغیر ہم کوئی تقریب برپا کرنے کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ سیاست کے میدان میں ہم قطعی نووارد ہیں۔



نواب مشتاق احمد گورمانی ہاتھ سے نکل گئے۔ قائد ملت چوہدری غلام عباس ہاتھ آ گئے۔ وہ ان دنوں مری میں ہوتے ہیں! ٹیلیفون پر مل گئے۔ پروفیسر شوکت واسطی کا حوالہ دیا۔ ہم ان کے شکر گزار ہیں کہ انہوں نے ہماری درخواست قبول فرمائی۔ ۱۹۴۸ء میں ایبٹ آباد کے مشاعرے میں مجھے اُن سے کچھ قرب حاصل ہوا تھا۔ تقریب ۱۲ر نومبر کو طے پائی ہے۔ مسلم کانفرنس کے ایک سو لیڈروں اور کارکنوں کا جتھہ ان کے ہمراہ ہوگا۔ گویا اب چھ سو مہمانوں کے لئے چائے کا انتظام کرنا ہوگا۔



جب تک اخبار نکالنے کا اجازت نامہ نہیں ملا تھا ہم اجازت نامے کے حصول کے لئے کوشاں رہے۔ مگر اب کہ اخبار نکلنے والا ہے۔ کچھ اس طرح محسوس ہو رہا ہے جیسے پرسکون ساحل کو چھوڑ کر طوفانی سمندر کی طرف جا رہے ہیں۔

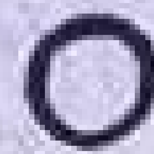
(۷ر نومبر ۱۹۴۹ء)

کاغذ کم ـــ کارکردگی زیادہ

آج دن بھر مکمل آرام کیا۔ آرام کرنے ہی کے لئے ہم کوئٹہ آئے تھے۔ یہ کہئے کہ ہم نے آرام کرنے کا تہیہ کر رکھا ہے۔ ہم تو کہیں جاتے ہی نہیں۔ آج کوئی آیا بھی نہیں۔ ورنہ یہاں چھاؤنی میں شام کے وقت گھروں میں آنے جانے کی لین ڈوری بندھی رہتی ہے مشقت کرنے والوں کا سننے بولنے کو جی تو چاہے گا آخر۔ پھر وہ ہمارے والا زمانہ بھی تو نہیں رہا کہ جب ہم نے نوکری شروع کی تھی تو موٹر صرف جرنیلوں کے پاس ہوتی تھی۔ ہمارے نکلنے تک موٹر کرنیلوں تک آ گئی۔ زمانہ آگے چلتا ہے۔ اس پر ہمیں اسلام آباد کی نقشہ آرائی کا ایک واقعہ یاد آ گیا ہمارے دارالحکومت کا کلیدی نقشہ (MASTER PLAN) شہر کاری کے شہرہ آفاق ماہر ڈاکٹر ڈکسا ایڈس نے سوچا اور سمویا تھا۔ خاکہ بندی کے ابتدائی مرحلے میں وہ دارالحکومت کے موجودہ ترقیاتی ادارے کے پیش رو) کیپیٹل کمیشن کے ارکان کے سامنے اپنے خاکہ کے خدوخال پیش کر رہے تھے کہ ایک مقام پر کمیشن کے (جز وقتی) چیئرمین میجر جنرل آغا یحییٰ خان نے (جو اس وقت پاکستان کے چیف آف سٹاف بھی تھے) کہا ـــــ کیا سڑکیں کچھ زیادہ نہیں ہیں۔

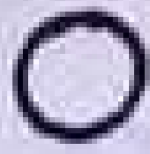
ڈاکٹر ڈکسا ایڈس نے برجستہ جواب دیا۔

"سر کیا پاکستان میں ہمیشہ اتنی ہی موٹریں رہیں گی؟"



اسٹاف کالج کوئٹہ نامور جرنیلوں کا گہوارہ رہا ہے۔ شہرہ آفاق برطانوی سپہ سالار فیلڈ مارشل منٹگمری (غالباً ۱۹۳۴ء سے ۱۹۳۸ء تک) اسی کالج میں سینئر انسٹرکٹر کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ وہ اس وقت کرنل تھے۔ یہیں سے ترقی پر انگلستان گئے۔ اُن کا تعلق برٹش آرمی سے تھا۔ کوئٹہ میں ہم جہاں مقیم ہیں۔ اس مکان سے چند گھر آگے وہ بنگلہ واقع ہے۔ جس میں کرنل منٹگمری رہتے تھے۔ آج کل اس گھر کو ایک عسکری عجائب گھر

میں تبدیل کر دیا گیا ہے۔ مگر اُستاد کپلنگ کے بقول یہ ایک دوسرا قصہ ہے۔



عجیب اتفاق ہے کہ آج عسکری لٹریچر ہی ہمارے مطالعہ میں رہا۔ ایک کتاب فیلڈ مارشل سلم کی (DEFEAT INTO VICTORY) ہاتھ آگئی۔ دو کتابیں۔ دوسری عالمی جنگ کے دو سب سے بڑے حریف سپہ سالاروں میں فیلڈ مارشل برنٹرڈ منٹگمری اور فیلڈ مارشل سر کلاڈ آکنلک کے متعلق تھیں کچھ نکات کا کچھ "ملغوبہ" رقم کر رہا ہوں۔ ایک بات کا دوسری بات سے کوئی تعلق نہیں۔ مگر سب باتوں کا تاریخ سے اور زندگی سے گہرا تعلق ہے۔

- ایک چینی جرنیل نے جنرل سلم کو بتایا کہ جاپانی صرف دس روز کا راشن لے کر لڑتے تھے۔
- "ہمارے پاس کاغذ کم تھے۔ اس لئے کارکردگی زیادہ تھی"۔ (سلم)
- حوصلے (مورال) کے بنیادی عناصر روحانی، ذہنی اور مادی ہیں"۔ (سلم)
- جاپانیوں کے بارے میں "اُن کی نفری ہم سے زیادہ تھی۔ وہ ہم سے بہتر لڑے۔ اُن کے جرنیل ہم سے بہتر تھے"۔ (سلم)
- "وجوہات کچھ بھی ہوں۔ جرنیل کی کارکردگی کا اندازہ اُس کی کامیابیوں اور ناکامیوں ہی سے کیا جائے گا"۔ (سلم)
- ۱۹۴۱ء میں مشرق وسطےٰ کے محاذ پر ہندوستانی سپاہیوں کی تعداد دو لاکھ تھی۔ انگریزوں کی تعداد دو لاکھ ستائیس ہزار، برٹش انڈین آرمی میں انگریز افسروں کی تعداد آٹھ ہزار تھی۔ ۱۹۴۷ء میں برٹش انڈین آرمی کی نفری بیس لاکھ تھی۔
- دوسری عالمی جنگ میں مشرق وسطیٰ میں جنگی پروپیگنڈے کے انچارج سر والٹر مانکٹن تھے۔ (قاہرہ میں تعلقات عامہ کا شعبہ انہی کے ماتحت تھا۔ عسکری حوالے سے ان کو بابائے تعلقات عامہ کہنا چاہیئے۔)
- ۱۹۴۱ء میں جب عراق میں رشید علی گیلانی نے انگریزوں کے خلاف بغاوت کی تو جنرل

ویول "سیاسی حل" کے حق میں تھے اور جنرل آکنلک "فوجی حل" کے "فوجی حل" آزمایا گیا۔

- دوسری جنگ میں بہادری اعزازات متعلقہ سپاہی کو تو اُسی وقت بتا دیئے جاتے مگر اخبارات میں ان کا اعلان بادشاہ سلامت کی منظوری کے بعد ہوتا جس میں کئی کئی مہینے لگ جاتے۔ آکنلگ نے اس طریق کار پر احتجاج کیا۔
- "افسر کا رینک اُس کے کام کی نوعیت کے مطابق ہونا چاہیئے۔ (آکنلگ)
- موت جتنی قریب ہوتی ہے، مرنا اتنا ہی مشکل ہوجاتا ہے۔ (آکنلگ)
- "رائے پورے تجزیئے کے بعد قائم کرو۔ اگر آپ اپنی رائے کو درست سمجھتے ہیں تو اُس کی پروا نہ کرو کہ کون کیا کہتا ہے یا کوئی کیا کہے گا"۔ (آکنلگ)
- "غیر معمولی لوگ غیر معمولی ذمے داری اور خطرات سے نمودار ہوتے ہیں"۔ (چرچل)

(کوئٹہ۔ ۳۰ ستمبر ۱۹۸۳ء)

۔۔۔ کیونکہ میں شاعر تھا

کمشنر ہاؤس میں شاعری ہوتی رہی۔ میں ہادی حسن صاحب (کمشنر) سے ملنے گیا۔ وہ مصروف تو بہت تھے کہ گوجر خان میں کسی وزیر غالباً سردار شوکت حیات خان کے جلسے کا انتظام کرنا تھا۔ مگر ہماری اطلاع ملتے ہی بلوالیا۔ تپاک سے ملے۔ دھیان سے ہماری بات سنی۔ کام ہو چکا تو کلام ہونے لگا۔ انہوں نے ہم سے غزلیں سنیں۔ ہم نے ان سے نظمیں فرمائش کی ابتدا ہماری ہی طرف سے ہوئی۔ ہادی حسن صاحب پہلے تو انکار کرتے رہے۔ کہنے لگے میں دفتر میں شاعری نہیں کیا کرتا۔ لیکن آخر ہمارے اصرار پر پسیج گئے۔ چند نظمیں سنائیں۔ یادداشت ان کی غضب کی ہے۔ لمبی لمبی نظمیں لکھتے بھی نہیں۔ چھوٹی چھوٹی خوبصورت خیال انگیز نظمیں فرانسیسی لٹریچر پر ان کی نظر وسیع ہے۔ تراجم تو تراجم ان کی طبعزاد تخلیقات پر بھی اجنبی ساحلوں کی ہوا اور شبنم بہت ملتی ہے۔ یہ بات کسی نے

ٹھیک کہی ہے کہ اگر زبان کا دریچہ بیرونی علوم وفنون کی طرف بند ہو جائے تو وہ زبان سوکھ جاتی ہے۔ ان کے ہاں اظہار کے نئے نئے تجربے ملتے ہیں۔ میں نے ایک مقام پر عرض کیا کہ آپ بعض اوقات اپنے سانچوں کو کچھ زیادہ پگھلا دیتے ہیں۔ بولے۔ تنقید کی پروا خالق نہیں کرتا۔ موجد کرتا ہے۔ میرے اصرار کو تو وہ خاطر میں لاتے یا نہ لاتے۔ اتفاقاً اوپر سے نواب زادہ اعتزاز الدین احمد آف لوہارو انسپکٹر جنرل پولیس بھی آگئے۔ وہ خود شاعر ہیں ہمایوں تخلص ہے۔ میرے پرانے مہربان ۱۹۴۰ء میں جب وہ ہمارے ضلع کے پولیس کپتان تھے تو جہلم سول لائن میں اُن کے بنگلے پر ہفتہ وار شعری نشست رہتی تھی۔ منشی خادم حسین حیدری ایڈیٹر "نئی زندگی" اس کے منصرم تھے۔ اسی پر ایک مرتبہ نہری زمین ان کو مل گئی۔ شعراء میں سے مولانا غلام اعظم اور تلوک چند، ایڈووکیٹ ذوالفقار علی نسیم تحصیل دار انسپکٹر رام الفت، سنتوکھ سنگھ کامل، حوالدار رام جویا خنداں پابندی سے ان محفلوں میں شریک ہوتے۔ لاہور سے کبھی کبھی سراج الدین ظفر بھی آنکلتے۔ عبدالحمید عدم بھی ہوتے تو جہلم ہی تھے مگر ان کو پولیس کپتان بھی کسی بات کا پابند نہیں کر سکتا تھا۔ وہ کبھی آتے کبھی نہ آتے۔ پنجابی کے شاعر درشن سنگھ آوارہ کا بھی یہی چلن تھا۔ ایک مرتبہ ہم نے نواب زادہ صاحب کی سرپرستی میں دریا کے کنارے ایک کل ہند مشاعرہ کر ڈالا دہلی سے نواب سراج الدین سائل مدعو تھے۔ آخر وقت اُن کی طبیعت ناساز ہو گئی تو انہوں نے اپنے ایک شاگرد دنہال سیوہاروی کو بھیج دیا۔ لاہور سے اختر شیرانی مشاعرے کے اسٹار شاعر تھے۔ دہلی سے نواب زادہ کے ایک نوخیز عزیز جمیل الدین عالی بھی آئے۔ آج کمشنر ہاؤس میں ان محفلوں اور ان لوگوں کی یاد تازہ ہوتی رہی ہادی حسن صاحب کو بھی نواب زادہ ہی نے آمادہ بہ سخن کیا۔ خود بھی چند غزلیں مرحمت فرمائیں۔ ان کی غزل زبان کی غزل ہوتی ہے۔ روزمرّہ اور محاکات نواب زادہ صاحب نے اشعار بیاض میں سے سنائے جو ان کے ساتھ تھی اگرچہ ان کے پاس نہیں تھی۔ بیاض ایک چرمی تھیلے میں تھی جو

ایک پولیس انسپکٹر کی تحویل میں تھا اور انسپکٹر صاحب باہر انسپکٹر جنرل پولیس کی سٹاف کار میں بیٹھے تھے۔

اتفاقاً ایک مختصر مگر دلچسپ محفل شعروسخن کا سامان ہو گیا۔ عدالت کے جس کمرے میں ہم شعر پڑھ رہے تھے۔ ۱۹۴۰ء میں ٹھیک اسی جگہ پہ میں جنرل سر ایلن ہارٹلے اور کمشنر مسٹر کیتھرٹ کنگ کے سامنے فوج میں کمیشن افسری کے امیدوار کے طور پہ پیش ہوا تھا اور انہوں نے مجھے اسی بنا پر رد کر دیا تھا کہ میں شاعر تھا۔ ع

زندگی تو کہاں سے کہاں آ گئی

میرا کالم بھی دلچسپی سے پڑھا جا رہا ہے

پچھلے ہفتے مسلسل بیس بیس گھنٹے کام کرتے رہے۔ کھانا پینا سونا۔ سب کچھ دفتر میں۔ کام کا ڈگرہ بندھنے میں نہیں آ رہا۔ اخبار بھی بستی کی طرح بستے بستے بستا ہے۔ انتظامات ناقص ہیں۔ خامیوں کو دُور کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اگلے دن جاوید خٹک مخابرت کے شعبے میں آ کر بیٹھ گیا۔ وہ بعض پرانی خامیاں دور کر گیا مگر بعض نئی خامیاں پیدا بھی کر گیا۔ عملے میں منتخب اہلِ قلم ہیں۔ نوجوانوں میں جمیل ملک اور احمد ظفر ادبی حلقوں میں خاصے جانے پہچانے جاتے ہیں۔ ذہین بھی ہیں۔ کراچی کے اہلِ زبان کرار نوری صاحب سے بھی بڑی رونق رہتی ہے۔ اُن کی بہت کوشش ہے کہ ہم روزانہ ان کا کوئی چٹ پٹا قطعہ پہلے صفحہ پہ دیا کریں۔ مگر مسعود کو قطعہ بازی پسند نہیں۔ عملۂ ادارت کی سب سے گراں بہا متاع جناب م حسن لطیفی ہیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ وہ روزانہ اخبار کے عام قارئین کی سطح پر اُتر کر آسان اُردو نہیں لکھ سکتے۔ مگر ان کا "بادِ شمال" سے تعلق ہی ہمارے لئے افتخار و اعزاز کا باعث ہے۔ چند دن ہوئے مولانا صلاح الدین احمد (ایڈیٹر "ادبی دنیا") یہاں آئے تو لطیفی صاحب سے ملتے ہمارے دفتر بھی تشریف لائے۔

اشتہارات نہیں مل رہے ۔ راولپنڈی میں اشتہارات کم ہی ملیں گے ۔ انڈسٹری یہاں نہیں ۔ دوکانداروں کو اشتہار دینے کی عادت نہیں ۔ مرکزی حکومت کراچی میں صوبائی حکومت لاہور میں ۔ بلدیہ اور چھاؤنی کے دفتروں یا جنرل ہیڈ کوارٹر سے کچھ مل جائے تو مل جائے ۔ پچھلے ہفتے میں سب سے بڑا اشتہار مالیتی سو روپے چوہدری مولاداد نے بلدیہ سے بھجوایا ۔ اس سے کیا ہوگا ۔ ہم نے اس پہلو پر غور ہی نہیں کیا تھا ۔ اشتہارات اخبارات کی زندگی میں شہ رگ کی حیثیت رکھتے ہیں ۔ "شورز ہوٹل" میں مسعود کے ہاں آج ہماری ایک لمبی کانفرنس ہوئی جس میں ہم لوگ کوئی دو گھنٹے تک اپنی خامیوں کی نشاندہی کرتے رہے ۔ مسعود ہر صبح سُرخ پنسل لے کر اخبار کی خامیوں پر نشان بناتا ہے ۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ سارا اخبار ہی لہولہان نظر آتا ہے ۔ اپنی خامیوں کو دیکھ کر بعض اوقات حیرت ہوتی ہے کہ کیسے کیسے "بلنڈرز" (BLUNDER) ہم سے سرزد ہو جاتے ہیں ۔ خیر یہ تو من آنم من دانم والی بات ہوئی ۔ ورنہ صحافتی دنیا کو ہم نے خدا کے فضل سے چونکا دیا ہے ۔ میرا کالم (پانچواں کالم) بھی دلچسپی سے پڑھا جا رہا ہے ۔ میں نے اپنا قلمی نام "انچے سعدون" رکھا ہے ۔ انچے سعدون سنگاپور کے نامور ملائی بیرسٹر ہیں ۔ ان کو پتہ چلے تو شائد ہم پر مقدمہ ہی کھڑا کر دیں ۔

(۲۰ نومبر ۱۹۴۹ء)

اب کچھ نہیں کہہ سکتے

آج روالپنڈی واپس آگیا ۔ لاہور سے بس میں آیا ۔ وہی عالم کہ مسافر پر مسافر سوار تھا ۔ بس بہی خستہ و شکستہ ۔ بے بسی کا عالم رہا ۔ چناب سے گذرنے کے بعد، کچھ دور ادھر آتے ہوئے دائیں ہاتھ کو ایک مسجد آتی ہے ۔ یہ مسجد ۱۹۳۸ء میں، جب ہم اسلامیہ کالج لاہور میں پڑھتے تھے ۔ تعمیر ہو رہی تھی ۔ میں جب کبھی اس

کے سامنے سے گزرتا ہوں۔ اس مسجد کو بڑے غور سے دیکھتا ہوں۔ معلوم نہیں کیوں۔؟

"معلوم نہیں کیوں" پر ——— پنڈت ہری چند اختر کا ایک شعر یاد آگیا۔

پتّا بھی نہیں ہلتا بغیر اس کی رضا کے

اور بندہ گنہگار ہے معلوم نہیں کیوں

"معلوم نہیں کیوں" مجھے یہ شعر یاد آگیا۔

(۲۸ر دسمبر ۱۹۴۹ء)

لیجئے ہمارے مہربان بریگیڈیئر گلزار احمد جنرل ہیڈکوارٹرز میں "ڈی، ایم، او" کے منصب پر فائز ہو گئے۔ ان سے پہلے بریگیڈیئر شیر خان اس منصب پر فائز تھے۔ کہتے ہیں کہ جنرل ہیڈکوارٹرز میں یہ اہم ترین کلیدی پوزیشن ہے جس پر کسی بریگیڈیئر کو متعین کیا جاسکتا ہے۔ کہتے ہیں کہ لڑائی تو بے شک جوان لڑتے ہیں مگر لڑائی لڑواتا بھی بریگیڈیئر ہے۔ اُوپر سے حکم تو خیر کمانڈر انچیف ہی دیتا ہے مگر یہ بات کہ فوج کا کونسا یونٹ کہاں رہے گا، یا کس وقت جائے گا، اس بارے میں حکم "ڈی۔ ایم۔ او" کے قلم ہی سے نکلنا ہے۔ آج بریگیڈیئر صاحب (گلزار) ملنے آئے تو خود ہی یہ خبر لائے۔ خوش تھے۔ اتنے خوش کہ بقول لالہ مصری خان ——— خوشی کی لالی گالوں سے "چوچو پیندی" تھی ——— یہ سب آزادی کی جوالا ہے۔ ورنہ انگریز ——— کا ہمیں پتہ نہیں چلتا تھا کہ کون ہے اور کہاں ہے؟

(۳۰ر دسمبر ۱۹۴۹ء)

سالِ رواں کا آخری دن ——— زندگی کا ایک اور سال کم ہوگیا۔ موسم ابر آلود تھا۔ پنڈی کلب میں زندہ دلوں کے خاصے بڑے ہجوم نے سالِ نو کے استقبال میں رتجگا منایا۔ ہم بھی گئے۔ چند جھلکیاں دیکھ کر واپس آگئے کہ اخبار بھی نکالنا تھا۔ خدا معلوم "زندہ دلانِ شب" کا صبح کو کیا حال ہوگا۔

اب تو آرام سے گذرتی ہے ——— عاقبت کی خبر خدا جانے

(۳۱ر دسمبر ۱۹۴۹ء)

۱۹۵۰ء پہلی صُبح

نئے سال کی پہلی صبح ۔ یہ سطور اگرچہ شام کو بلکہ رات کو لکھی جا رہی ہیں ۔ مگر ذہن پر صبح مستولی ہے ۔ انسان کے دل میں روشنی کی آرزو کتنی شدت سے موجود رہتی ہے ۔ آدمی اندھیرے سے کتنا ڈرتا ہے ۔ اندھیرا صرف شب و روز ہی کا نہیں ہوتا ۔ کسی مقام ہی سے مخصوص نہیں ہوتا ۔ اندھیرا زمانے کا بھی ہوتا ہے ۔ اللہ کرے نیا سال روشنی کا سال ثابت ہو ۔

سال گزشتہ ذاتی طور پر میرے لئے ایک فیصلہ کن موڑ لے کر آیا ۔ ہم نے اخبار نکال لیا ۔ چھاؤنی چھوڑ کر شہر میں آ گئے ۔ اس تب و تاب کا اپنا صلہ ہے ۔ مگر فوج کی زندگی بھی عجیب ۔ ایک مرتبہ کسی آدمی کے خون میں اُتر جائے تو پھر اس کی مہک اور کسک بھولتی نہیں ۔ ایسا نہ ہوتا تو دوسری جنگ عالمگیر میں ایک اسی سالہ انگریز بریگیڈیئر برطانیہ سے چل کر شمالی افریقہ میں اپنی پلٹن سے ملنے کیوں آتا ۔

آج مولوی غلام اعظم صاحب کے خط نے بھی حوصلہ بندھایا ۔ (جہلم کے جیّد عالم، مفکر اور مفسّر ۔ اکتوبر ۱۹۸۴ء میں ۹۰ برس کی عمر میں انتقال ہوا ۔ اکتوبر ۱۹۴۸ء میں پنجاب کا انگریز گورنر سر ایون جنکنز جہلم آیا تو مولانا سے ملنے کی خواہش ظاہر کی ۔ ڈپٹی کمشنر نے ان کو تحصیلدار کے ہاتھ بُلوا بھیجا ۔ مگر مولانا نے یہ کہہ کر ملنے سے انکار کر دیا کہ میں بہت مصروف ہوں) اپنے مخصوص کھُردرے مگر گہرے اسلوب میں لکھتے ہیں ۔ شاہ بچے ۔ شاہین بچے سے بھی اونچے ہوتے ہیں ۔ گھبرانا نہیں ۔ ہتھیار نہیں ڈالتے ۔ مقصد کے لئے لڑتے لڑتے مرجانے میں بھی ایک آن ہوتی ہے" ۔ کیسا عمدہ خط ملا ہے سال کے پہلے دن ۔

پاکستان کے لئے یہ سال نہ اچھا رہا نہ بُرا ۔ میں تو خیر اچھا ہی کہوں گا ۔ مشکلات و مسائل کا اندازہ تو کیجیے ۔ کشمیر کا مسئلہ جُوں کا توں ہے ۔ سلامتی کونسل اپنی خیر منا رہی ہے ۔ وہ جنگ بندی ہی کو اپنی بڑی کامیابی سمجھ رہی ہے ۔

اس سال کا سب سے اہم واقعہ میرے خیال میں انڈونیشیا کی آزادی ہے دنیا کے مزید سات

کروڑ مسلمان آزاد ہو گئے۔ انڈونیشیا کی آزادی کا عالمی بالخصوص عالم اسلام کی سیاست پر گہرا اثر پڑے گا۔ اگر وہ اسلامی ملک بنا تو پاکستان کے لئے بڑی قوت ثابت ہو گا۔ لیکن میرا اندازہ ہے کہ انڈونیشیا، ہندوستان کی طرح ایک غیر مذہبی جمہوریت بنے گا۔ بلکہ شائد پایا کان کاراشتراکی خطوط پر جا پڑے۔ جن دنوں ہم وہاں تھے۔ آثار کچھ ایسے ہی نظر آرہے تھے۔ اب حالات تبدیل ہو گئے ہوں تو کچھ کہہ نہیں سکتا۔ ایک بات ضرور ہے کہ ڈاکٹر عبدالرحیم سوئیکارنو کی ذات میں وہاں ایک روشنی کا بہت بلند مینار موجود ہے۔

جو کچھ ہے یہی کچھ ہے

۱۹۴۹ء میں ہندوستان سے کشمیر میں مڈبھیڑ کے بعد پچھلے دنوں میں ہندوستان اور پاکستان جنگ کے جس قدر قریب آگئے ہیں اتنے پہلے کبھی نہ تھے۔ ہندوستان نے کثیر جمعیت واگہ کی سرحد پر جمع کر رکھی تھی۔ بھارت کا دوسرا ٹڈی دل مشرقی پاکستان کی سرحدوں پر منڈلا رہا ہے قیاس یہ تھا کہ بھارت کسی آن مشرقی پاکستان پر حملہ کر کے ایشیا (بلکہ دنیا بھر) کے امن کو دیا سلائی دکھا دے گا۔ مگر وزیر اعظم پاکستان لیاقت علی خان کے تدبر نے معاملہ سنبھال لیا کمال دانشمندی سے کام لیتے ہوئے وہ دہلی چلے گئے۔ جواہر لال نہرو سے بات کی مذاکرات نتیجہ خیز رہے۔ دونوں ملک مسئلہ کشمیر سے قطع نظر باقی تمام متنازعہ فی مسائل کو پُرامن ذرائع سے حل کرنے پر رضامند ہو گئے۔ "معاہدہ دہلی" کے عنوان سے ایک دستاویز پر بھی دستخط ہو گئے۔ لیاقت علی خان نے اس اقدام سے ایک مرتبہ پھر دنیا پر یہ ثابت کر دیا کہ پاکستان امن کا حامی ہے اور لیاقت علی خان امن کا آدمی ہے۔ میں خیال کرتا ہوں کہ لیاقت علی خان کا ایک یہی کارنامہ اُن کو پاکستان کی تاریخ میں امر رکھنے کے لئے کافی ہے۔ پنڈت جواہر لال نہرو بھی یقیناً تحسین کے مستحق ہیں۔ جن سنگھیوں کا محاصرہ توڑنا اُن کے لئے کچھ آسان نہ تھا۔

(۵ اپریل ۱۹۵۰ء)

آزاد کشمیر ریڈیو نے اپنی دوسری سالگرہ منائی۔ چودھری غلام عباس صاحب کی صدارت میں مشاعرہ ہوا۔ مولانا عبدالمجید سالک، ڈاکٹر ایم ڈی تاثیر، پروفیسر سید عابد علی عابد، محترمہ ادا جعفری اور مجید لاہوری نے بڑی ولولہ انگیز نظمیں سنائیں۔ حالانکہ تاثیر صاحب شعر میں اتنی براہ راست گھن گرج کے قائل نہیں ہیں۔ مجید لاہوری کراچی سے آئے تھے۔ کراچی کے تازہ سیاسی لطائف سے لدے پھندے۔ مزے کا آدمی ہے۔

(۶ اپریل)

حفیظ جالندھری کی گولڈن جوبلی ملک گیر تحریک بن گئی ہے۔ آج اس سلسلہ میں نواب

مشتاق احمد گورمانی (وزیر امور کشمیر) سے ملاقات ہوئی۔ ایک اجلاس کی صدارت وہ کریں گے۔ ہم نے ان کے خطبے کا مسودہ لکھنے کی پیش کش کی، تو نواب صاحب بولے، حفیظ صاحب کے بارے میں کچھ کہنے کے لئے مجھے لکھے ہوئے خطبے کی ضرورت نہیں۔ حفیظ صاحب کی شاعری کے اتنے پہلو ہیں کہ آدمی دیر تک یہ حکایت مزے لے لے کر بیان کر سکتا ہے۔ اس نشست میں بھی گورمانی صاحب خاصی دیر تک ادب اور ادیبوں کی باتیں مزے لے لے کر کرتے رہے۔ جوبلی کی مرکزی تقریب ۱۴ مئی کو ہو گی۔ گویا تقریب سر پہ آ گئی۔

(۹ مئی)

مسئلہ کشمیر میں مجلسِ اقوامِ متحدہ کے ثالث سر اوون ڈکسن (OWEN DIXON) کراچی سے یہاں پہنچے۔ صحافیوں کے گروہ کے ساتھ ہم بھی ایئر پورٹ پر موجود تھے۔ پاکستان کی طرف سے جنرل راس میکے، کمشنر انعام الرحیم اور وزارت امور کشمیر کے انگریزی سیکرٹری مسٹر ٹفنل بیرٹ ہوائی اڈے پر موجود تھے۔ کراچی سے وزارت امورِ کشمیر کے مسٹر ایوب ان کے ہمراہ آئے۔ یاد آیا کہ ۱۹۴۳ء میں مسٹر ٹفنل بیرٹ حکومتِ ہند میں لیبر ڈیپارٹمنٹ میں جوائنٹ سیکرٹری تھے اور خان بہادر نواب مشتاق احمد گورمانی ان کے ماتحت ڈائریکٹر۔ اب گورمانی صاحب وزیر ہیں اور ٹفنل ان کے سیکرٹری۔ مقامات کی یہ اتھل پتھل آزادی کے ثمرات ہیں۔ سر اون کے ساتھ ایک اسٹینو گرافر لڑکی بھی ہے محض لڑکی۔

شام کو سردار محمد ابراہیم خان نے چند صحافیوں کو چائے پر مدعو کر رکھا تھا۔ مسئلہ کشمیر پہ گفتگو ہوتی رہی۔ مسئلہ تو صاف ہے۔ سوال یہ ہے کہ پیش رفت کیونکر ہو۔

(۷ جون)

ریلوے انسٹی ٹیوٹ میں انجمن تعمیر پسند مصنفین کا سالانہ اجلاس ہوا۔ ہمارے دوست عزیز ملک اس انجمن کی روحِ رواں ہیں۔ ابوالاثر حفیظ جالندھری صدارت کر رہے تھے۔ حفیظ صاحب نے "خطبۂ صدارت" کے عنوان سے ایک نظم لکھ

رکھی ہے جو کوئی چالیس منٹ میں ختم ہوتی ہے۔ ہم نے آج یہ نظم ساتویں مرتبہ سنی۔ حفیظ صاحب کے علاوہ اتنی طویل نظم کو اور کون شاعر اتنی مرتبہ سنا سکتا ہے۔

اخبار (بادِ شمال) بند ہے۔ سردار کوٹ (سردار سر محمد نواز خان آف فتح کوٹ) اخبار کے معاملے میں کچھ دلچسپی لے رہے ہیں۔ آج ایک قاصد ان کا پیغام لایا۔ شاید سردار صاحب نے اپنا پورا عندیہ ظاہر نہیں کیا یا قاصد کا ذہن صاف نہیں۔ اصل میں سردار صاحب کو اس رُخ پر ہمارے مہربان خان بہادر قاضی نذیر احمد ایڈووکیٹ نے متوجّہ کیا ہے۔ ورنہ سردار صاحب کہاں۔ سُنا ہے کہ وہ ایک روشن خیال زمیندار ہیں۔ کتابوں کی بہت بڑی لائبریری جمع کر رکھی ہے۔ بہرحال اس معاملے میں ہمارا ذہن صاف ہے کہ اگر اخبار کو جاری رکھنا ہے تو اس کے ساتھ کوئی ایسا تار ہرگز بندھنے نہ دیں گے جو کسی دوسرے کے ہاتھ میں ہو۔ اخبار ہو گا تو تار بھی اپنا ہو گا۔ (۸ جون)

مسٹر لینگن کی کُتیا نے چھ مزید پلّے جنے ہیں۔ "دس کتورے" پہلے گھر میں موجود ہیں۔ اس شخص کی ساری دلچسپی ان "کتوروں" میں مرکوز ہے۔ ایک ملازم ہمہ وقت ان کی دیکھ بھال پر مقرّر ہے۔ خوراک باقاعدہ چارٹ کے مطابق دی جاتی ہے۔ اپنی نہ جورو نہ جاتا۔ جو کچھ ہے یہی کچھ ہے۔ نصف تنخواہ ان پر اٹھ جاتی ہے۔ نصف تنخواہ کی "رم" پی جاتا ہے۔ اپنی غذا چار پہر میں دو چار ٹوسٹ۔

(مسٹر لینگن ریلوے میں سفید گہ یڈ کے انجن ڈرائیور تھے۔ ہم کچھ عرصہ وسٹ ریج میں ان کے کشادہ سرکاری بنگلے کے ایک حصّے میں مقیم رہے۔ بلکہ بنگلے کے تین کمرے ہمارے تصرّف میں تھے اور ایک کمرے میں مسٹر لینگن اپنے "کتوروں" کے ساتھ پڑے رہتے۔ ص ن)

وہ وردی اُتار چکے مگر.......

رمضان کا مہینہ شروع ہو گیا۔ اس مرتبہ کے روزے خاصے کڑاکے دار ہوں گے۔ دل گردے کی خاصی آزمائش رہے گی۔ میں ایسے کئی دوستوں کو جانتا ہوں کہ گھر ان کے خسخانے ہیں اور افطاری پر انواع و اقسام کے پرفائے ان کو میسر ہیں۔ مگر اُف اُف کر رہے ہیں۔ ادھر ہمارے گاؤں کے سید محمد غوث شاہ ہیں کہ روزہ بھی رکھتے ہیں، ہل بھی چلاتے ہیں۔ کھیت سے چارہ بھی کاٹتے ہیں۔ چارہ کاٹتے ہی نہیں، سر پر لاد کر گھر تک بھی لاتے ہیں۔ نہ روزہ قضا کرتے ہیں۔ نہ نماز قضا کرتے ہیں۔

(۱۸ جون ۱۹۵۰ء)

راجہ فضلداد خان ذیلدار سلطان پور (یہ گاؤں کبھی منگلا قلعہ کے سامنے دریا کے پار واقع ہوتا تھا۔ اب دریا کے اندر چلا گیا ہے ص) بڑے وضعدار بزرگ ہیں چند ماہ ہوئے ان سے سرِ راہ سیشن جج جہلم کی کچہری میں ملاقات ہو گئی تھی۔ جہاں آپ "اسیری" کرنے آئے تھے۔ "اسیری" میں بھی ان کی شہرت اسیروں کی رہائی کے ناطے سے ہے۔ حسبِ معمول پیچھے پیچھے دو ملازم ایک کے ہاتھ میں حقہ، دوسرے کی کلائی پر شکرا۔ نیلی بار میں دو مربعے زمین تھی۔ ایک مربعہ کا حقہ پی چکے ہیں۔ دوسرے مربعے کو ان کے شکرے چُگ رہے ہیں۔ ذیلدار ہیں مگر کیا مجال کہ حاجت مندوں کے ہاں سے پانی بھی پی جائیں۔ میں نے اس روز ان کے "باز" کی طرف ذرا "نگاہِ نیم باز" سے دیکھ لیا تھا۔ آج دیکھا تو تین ملازموں اور چار بازوں کے ہمراہ میرے ہاں تشریف لے آئے۔ اتنے اور اس قسم کے مہمانوں کو دیکھ کر میرے تو پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ بازوں کو دیکھ کر کبوتر یاد آ گئے جن کا تازہ خون راجہ

صاحب اپنے بازوؤں کو چٹاتے تھے۔ اوپر سے رمضان کا مہینہ، ذرا دم لیا تو بولے۔

"شاہ زادے! میں جانوں تو بازوں کا شوق رکھتا ہے۔ ان میں سے جو پرندہ تجھے پسند ہے رکھ لے۔ ایک بلوچی ہے۔ ایک ایرانی ایک عراقی دچا ہے تو تینوں رکھ لے میں تو تینوں تیری نیت سے لایا ہوں۔"

راجہ صاحب کی پیش کش پر میری تو اُوپر کی سانس اُوپر اور نیچے کی سانس نیچے رہ گئی۔ یہاں ان دنوں اپنے نان نفقے کے لالے پڑ رہے ہیں۔ بازداروں کے لئے تو ڈیرہ غازی خان کا "بزدار" (زمیندار) ہونا چاہیئے میں نے شکریہ کے حوالے سے کچھ ایسا پیرایہ اختیار کیا کہ سانپ بھی مر گیا اور ہم بھی ٹوٹنے نہ پائے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہا کہ "چاچا جی۔ میں بازوں سے باز آیا۔"

آج یہ باز ہمارے مہمان ہیں۔ حسنِ اتفاق سے ساتھ کی کوٹھی (کلائیڈ روڈ نزد شوز ہوٹل) میں چکوال کے کیپٹن اللہ داد صاحب رہتے ہیں۔ انہیں اور ان کے بیٹوں افتخار اور ریاض (بریگیڈیئر افتخار احمد چوہان اور بریگیڈیئر ڈاکٹر ریاض احمد چوہان) کو بازوں کا ٹھرک تھا۔ بازوں اور بازداروں کی خاطر تواضع انہوں نے اپنے ذمے لے لی ہے۔

(۱۹ رجون)

کل رات بازوں کے بعد گاؤں سے بابا الف دین حجام آ پہنچا۔ بابا الف دین کی آمد کا مطلب واضح ہوتا ہے کہ شادی یا غمی کی خبر لائے ہوں گے۔ آج غمی کی تو نہیں، تشویش کی خبر لائے تھے۔ وہ یہ کہ میر پور میں ہمارے عزیزوں کے ایک خاندان کے لوگ ایک خانقاہ کی گدی نشینی کے تنازعے پر آپس میں لڑ پڑے ہیں۔ زندہ انسانوں میں مردوں کے لین دین، گویا ہڈیوں کی تقسیم پر فساد برپا ہے۔ اس سلسلہ میں عزیزوں کی طرف سے ہمارے لئے میر پور میں

طلبی کا پروانہ آیا تھا۔ ہم نے راجہ صاحب سے مشورہ کیا۔ مخلص بزرگ۔ انہوں نے اتنا تردّد ظاہر کیا گویا فساد ہی ان کے خاندان میں ہوا ہو۔ فرمایا۔ ابھی چلو۔ میرے دوست راجہ گلاب خان (شکر پڑیاں۔ اسلام آباد) کا بیٹا حامد مختار وہاں ڈپٹی کمشنر ہے۔ سیدھے ان کے پاس چلتے ہیں۔ خاندانی لوگ خاندانی لوگوں کا آدر کرتے ہیں۔ سو اُٹھ کھڑے ہوئے۔ چل پڑے۔ حقہ ساتھ آیا۔ باتیں پیچھے آتے رہے۔ سیدھے ڈپٹی کمشنر صاحب کی کوٹھی میں اُترے۔ میرپور شہر کے ایک حصے میں کھنڈر پھیلے دیکھے۔ جیسے اس شہر پر سے جنگ گزری ہو۔ سید علی اصغر شاہ صاحب (ممبر پارلیمنٹ رہے) سے موٹر مانگ لی تھی۔ رات تک واپس آ گئے۔ دن بھی تو بہت طویل تھا۔ بلکہ رات واپس آ کر زرین بھابی (مسز کرنل مسعود احمد) کو اسٹیشن پر الوداع کہنے بھی گئے۔ وہ سنگاپور جا رہی ہیں۔ ریلوے اسٹیشن پر کرنل فیض احمد فیض سے بھی ملاقات ہو گئی۔ وہ وردی اُتار چکے۔ مگر ہم اُن کو کرنل ہی کہتے ہیں۔ (۲۰ جون)

بات کم کہی مسکراتے زیادہ رہے

آج کچھ ترشح ہو گیا۔ اشک شوئی ہی سہی۔ تاہم گرمی کا زور قدرے ٹوٹ گیا۔ روزے بھی لوگوں پر کچھ سہل ہو گئے۔ ویسے روزہ رکھنا قضا نہیں فرض کا معاملہ ہے لگلے روز میں گاؤں گیا تو سید محمد غوث شاہ صاحب کو دیکھا کہ روزے کی حالت میں اور چلچلاتی دھوپ میں گاؤں کے "سرحدہ" سے کہ کم از کم ایک میل دور ہو گا، چارے کا گٹھا سر پر اُٹھائے گھر کو جا رہے تھے۔ حالانکہ وہ اپنے ہزار ہا ارادت مندوں کے لئے پیر طریقت حضرت پیر سید محمد غوث شاہ کی حیثیت رکھتے ہیں اور درجنوں مرید اُن کے آستانے پر بھی ہر وقت موجود رہتے ہیں۔ غوث شاہ صاحب کی تو خیر ایک استثنائی مثال ہے کہ وہ تو دین اور دنیا کو ساتھ لے کر چلنے کا عملی مظاہرہ بلکہ ہمارے چچا سید چنن شاہ صاحب کے لفظوں میں مجاہدہ کر رہے ہیں۔ ویسے بھی عام سطح پر لوگ اس کی بڑی پابندی کرتے ہیں۔ (۲۱ جون ۱۹۵۰)

ابوالاثر حفیظ جالندھری کے ہاں افطاری کی دعوت دی تھی۔ بیشتر تو اپنے ادباء و شعراء دوستوں کو جمع کر رکھا تھا۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ حفیظ صاحب کے ہاں دعوت ہو (یوں بھی یہ واقعہ شاذ شاذ ہی ہوتا ہے) اور اس میں عزیز ملک، عبدالعزیز فطرت، کرم حیدری، ہیڈ ماسٹر ترمذی، طارق سوہدروی، اے ڈی شیخ اور اگر مرزا منور اور حافظ لدھیانوی یہاں ہوں تو یہ دونوں ان کے "جگر ٹوٹے" موجود نہ ہوں۔ متفرق یعنی معزز مہمانوں میں سے میجر جنرل (نواب زادہ) محمد رضا مہمانِ خصوصی معلوم ہو رہے تھے۔ بریگیڈیئر گلزار بھی تھے۔ حفیظ صاحب نے جنرل رضا کو رات کو بارہ بجے تک مشاعرہ سنوایا۔ ظاہر ہے کہ شعر خوانی میں LIONS SHARE ان کا اپنا ہی تھا۔ یہ "ایکسر سائیز" کچھ ایسی بے کار بھی نہ گئی۔ جنرل رضا۔ اردو اشعار پر

بڑے سلیقے سے فارسی میں داد دیتے رہے۔ کہیں کہیں تو فارسی کا برمحل متبادل شعر بھی نکال لاتے تھے۔ دو ایک اشعار تو حفیظ صاحب کے اشعار کے اتنے قریب آگئے کہ اگر حفیظ صاحب کو فارسی ادبیات پر عبور ہوتا تو ہم سمجھتے کہ آپ ادھر سے کچھ کشید کر لائے ہیں۔

اہلِ قلم میں سے مشہور ناولسٹ عزیز احمد سے اسی تقریب میں ملاقات ہوئی۔ وہ وزارتِ امورِ کشمیر میں شعبۂ تعلقاتِ عامہ کے ڈپٹی ڈائریکٹر کے منصب پر فائز ہو کر حال ہی میں یہاں آئے ہیں۔ گورے چٹے دیکھنے میں خود ہی کشمیری معلوم ہوتے ہیں۔ بات کم کہی اور مسکراتے زیادہ رہے۔ ان کی آمد سے راولپنڈی کے ادبی حلقوں میں چہل پہل رہے گی کہ نقد و نظر کے اکھاڑے میں ان کی شخصیت متنازعہ فی بھی ہے۔ (۲۲ جون)

اخبار کے دفتر میں گنّے کا سٹاک

آج رات بھائی انعام قاضی کے ہاں انطاری تھی۔ افسوس کہ عزیز دوستوں میں سے ماشو (کرنل مسعود احمد) اور زین بھابی موجود نہ تھے۔ زین اگلے دن سنگاپور روانہ ہو گئی ہیں اور ماشو کو یہی سمجھ میں نہیں آ رہا کہ وہ اس کے بغیر کیا کرے۔ ان دنوں اُس کا زیادہ وقت مطالعہ میں گزرتا ہے۔ تقریبات سے گریز کرتا ہے، ہجوم میں اس کا دل گھبراتا ہے۔ قاضی بھائی کی انطاری کی خصوصیت بہ غایب میں لگے ہوئے آم تھے۔ جن کا انتخاب کرتے ہوئے نہ معلوم وہ کتنے نروٹ فروشوں سے لڑے ہوں گے۔

کپٹن عنایت چودھری بھی شادی شدہ ہو گئے۔ بڑی مدّت کے بعد آخر یہ شاہین زیرِ دام آیا۔

آج مسز عنایت چودھری سے ملاقات ہوئی۔ بھابی اپنے میاں سے کچھ زیادہ ہی پڑھی ہوئی ہیں۔ مگر خاموش گھریلو سی لڑکی ہے۔ عنایت بھی فیض صاحب (بڑے بھائی فیض احمد فیض) کی طرح کم گو ہے۔ مگر شادی کے بعد تو بہت چونچال ہو گیا ہے۔ شادی کی یہ تاثیر کم ہی دیکھنے میں آئی ہے۔ (۲۵ رجون)

انطاریوں کا دَور چل رہا ہے۔ آج نواب مشتاق احمد گورمانی کے ہاں افطاری تھی۔ عشائیہ بھی۔ عمائدین کا بھاری اجتماع تھا۔ آخر وزیر کی افطاری تھی۔ ادیب اور صحافی بھی خاصی تعداد میں مدعو تھے۔ کھانا تو نواب صاحب گھوم پھر کر نہیں کھاتے مگر عشائیے کے بعد وہ کچھ دیر اہلِ قلم کے حلقے میں کھڑے باتیں کرتے رہے۔ ان کی گفتگو میں کمال کی مٹھاس اور سلجھاؤ ہوتا ہے۔ عمل کا معلوم نہیں کیا حال ہے۔ مگر ہر مسئلے پہ ان کے ذہن کو صاف پایا اور مسائل پہ ان کی گرفت مضبوط معلوم ہوئی۔ تقریب حفیظ صاحب کے اشعار پہ ختم ہوئی۔ اور جلد ختم ہو گئی کہ ادھر ان کی ایک نظم ختم ہوئی اور اُدھر

تراویح کا وقت ہو گیا۔

گرمی پھر زور پکڑ رہی ہے۔ نواب صاحب نے باریک سا انگرکھا پہن رکھا تھا، عشائیے کے وقت وہ بھی اتار دیا۔

(۲۳؍ جون)

اخبار (بادِ شمال) بند پڑا ہے۔ اخبار تو بند ہے مگر دفتر کھلا رہتا ہے۔ دن بھر احباب آتے جاتے رہتے ہیں۔ اب تو بعض احباب کو جن کے گھر میں مہمانوں کے لئے گنجائش نہیں۔ اپنے مہمانوں کو بھی یہیں سلا جاتے ہیں۔ مہمان ناشتہ ہمارے ساتھ کرتے ہیں اور دوپہر کے کھانے کے لئے یہاں سے نہا دھو کر میزبان کے ہاں چلے جاتے ہیں۔ آج تو حد ہو گئی۔ جب گنے سے لدا ہوا ایک ٹرک دفتر کے سامنے آ کر ٹھہرا اور پٹھان ڈرائیور نے ہمارے دوست میاں زین العابدین کا رقعہ لا کر ہمیں دکھایا۔ میاں صاحب نے لکھا تھا۔ میں مردان شوگر ملز کا مینجر ہوں۔ تمہارا اخبار تو آج کل بند ہے۔ چند دنوں کے لئے ہمارے گنے کا سٹاک تو اپنے دفتر میں رکھا دو۔ یہ خیال رہے کہ گنا ننگے فرش پر نہ رکھا جائے۔ بہتر ہوگا کہ وہ جو تمہارے ہاں کاتبوں کے لمبے لمبے تخت پوش پڑے ہوئے ہیں اُن پہ گنے کے انبار کر دو۔ دو تین روز کے بعد میں خود بھی آؤں گا۔ تمہیں ٹیلی فون کرتا رہا جو نہ مل سکا۔ کیا NON PAYMENT کی وجہ سے ٹیلی فون کٹ تو نہیں گیا۔

ہمیں اس رقعے سے علم ہوا کہ عابدین نے تیل (وہ برما شیل میں انسپکٹر تھے) کی نوکری چھوڑ کر گنے کی نوکری کر لی ہے۔

(۲۶؍ جون)

بہتر ہے یہ واقعہ لکھ دوں

آج کرنل ڈرنگ (DRING) وزیر اعظم ریاست بہاولپور سے ملاقات ہو گئی مگر ہم سے بات ہی نہ ہو سکی۔ ریاست کے مسائل پر صحافیانہ گفتگو کر کے بے نیل مرام واپس آگئے۔ مسعود نے سختی سے کہہ دیا تھا کہ اخبار کی بندش منظور مگر ضمیر کا سودا نامنظور۔ ہم نے اپنے مہربان خان فقیرا خان جدون کو بھی مایوس کیا۔

بہتر ہے اس دلچسپ واقعے کو لکھ دوں۔ محترم خان فقیرا خان جدون ایڈیٹر ہفت روزہ "انکشاف" ایبٹ آباد" ہمارے ہاں اکثر آتے جاتے رہتے ہیں۔ ملک بھر کے اکابرین سیاست اور عمائدین حکومت سے ان کے گہرے مراسم ہیں۔ ایبٹ آباد میں ان کی بیٹھک کو نگار خانہ سیاست کہنا چاہیئے۔ کون بڑا لیڈر رہا ہے جس نے ان کے ہاں کھانا نہیں کھایا جس کی تصویر ان کے ہاں موجود نہیں۔ ہمارے اخبار کے مالی بحران میں وہ اکثر تشویش کا اظہار کرتے رہتے تھے۔ ایک دن ایک "نسخہ" بھی بتا گئے کہ ریاست بہاولپور کے وزیر اعظم کرنل ڈرنگ کو خط لکھو کہ جناب وہ جو اُن کی ملی بھگت سے فلاں صاحب نے لاکھوں روپے کی گندم کا سیکنڈل کیا ہے۔ ہمارے دوست فقیرا خان جدون نے ہمیں اس کی گھناؤنی تفصیلات سے آگاہ کر دیا ہے۔ مگر اُن کے بہی خواہ کی حیثیت سے انہوں نے ہمیں تاکید کی ہے کہ اخبار میں ملاقات کی تشہیر سے پہلے ہم اُن سے رجوع کریں تاکہ تصویر کا دوسرا رخ مکمل طور پر سامنے آجائے۔ میں نے اور انعام بھائی نے مسعود کو بیچ میں لائے بغیر کرنل ڈرنگ کو خط لکھ دیا۔ وہاں سے خط ملتے ہی تار آگیا کہ بہاولپور آئیے۔ ہم گھبرائے نیت جو ٹھیک نہیں تھی۔ جواب میں مصروفیت کا بہانہ کر دیا حالانکہ دن بھر بیٹھے مکھیاں مارا کرتے۔ معلوم ہوتا ہے خان فقیرا خان جدون نے اپنی طرف سے بھی براہ راست

محاذ کھول رکھا تھا۔ آج صبح خان صاحب دفتر تشریف لائے اور کھڑے کھڑے ہی انہوں نے کہا۔

"اٹھو مرزا"

"کہاں"

ریلوے سٹیشن کے ریفرشمنٹ روم میں جس کا ٹھیکہ غالباً خان صاحب ہی کی تحویل میں تھا، کرلل ڈرنگ بیٹھا ہے۔

ہم چلے جاتے مگر اس درمیان میں مسعود رنگ بین بھنگ ڈال چکے تھے۔ خان فقیرا خان ہماری گڈی بہت چڑھاتے رہے۔ مگر ہم نے خود ہی ڈور کاٹ دی۔ اللہ نے بچایا مجھے، ڈوب چلا تھا۔ اخبار بند کرنے کا فیصلہ کیا۔ (۳۰ جون ۱۹۵۵ء)

شمالی اور جنوبی کوریا میں جنگ چھڑے ایک ہفتہ ہو گیا۔ رشتہ دار، رشتہ دار آپس میں لڑ رہے ہیں۔ امریکہ، جنوبی کوریا کی مدد کر رہا ہے اور شمالی کوریا کو روس کی پشت پناہی حاصل ہے۔ ملک دوسروں کے، چھاؤنیاں ان کی۔ دوسری جنگِ عالمگیر میں روس کی حیثیت امریکہ اور برطانیہ کے حاشیہ بردار کی سی تھی۔ اب یہ ان کی بالادستی کو چیلنج کر رہا ہے۔ کہیں تیسری عالمی جنگ ہی نہ چھڑ جائے۔ غنیمت ہے کہ فی الحال جاپان کی طبیعت لڑائی کی طرف نہیں آ رہی۔ ورنہ کوریا سے تو اس کا نکلنا خُلد سے آدم کے نکلنے سے کچھ کم نہ تھا۔ خیر کوریا کی جنگ کے باعث ہماری کپاس کی مانگ بڑھ گئی ہے۔ مانگ بڑھ جائے تو دام بھی بڑھ جاتے ہیں۔ زمینداروں اور کارخانہ داروں کے وارے نیارے ــــ سانوں کی۔

(یکم جولائی)

چلو یہ بھی اچھا ہوا

کوریا کی جنگ شدید ہوتی جا رہی ہے۔ امریکہ جنوبی کوریا کی پشت۔ روس کی فوجیں جنوبی کوریا میں اتر رہی ہیں۔ بہت جلد میدانِ جنگ میں یہ صورت نظر آئے گی کہ امریکہ آگے ہوگا اور جنوبی کوریا پشت پر۔ امریکہ نے اس کو اپنی جنگ بنالیا ہے۔ روس اس کو اپنی جنگ بنالے گا۔ چین مضطرب ہے۔ ہمارا جھکاؤ امریکہ کی طرف ہے۔ وزیر اعظم نے تو، جو ان دنوں امریکہ میں ہیں وہیں سے کچھ اشارہ بھی اس مضمون کا کر دیا ہے۔ (۴، جولائی)

کرنل ممتاز علوی نے کراچی سے اطلاع دی ہے کہ "ماہ نو" کی ایڈیٹری ہاتھ سے نکل گئی۔ چلو یہ بھی اچھا ہوا۔ خواہ مخواہ قدم ڈگمگانے لگے تھے۔ ہم فیصلہ نہ کر سکے تو وقت نے کر دیا۔ وقت اور دریا کا پانی کسی کا انتظار نہیں کرتے۔ میں اس خبر سے دل گرفتہ تو ہوا مگر اس اثنا میں جہلم سے مولانا غلام اعظم صاحب آگئے۔ وہ ایک ہی قلندر شخص ہیں۔ دنیاداری کی بات کرتے ہیں نہ سنتے ہیں۔ دین کی بات بھی کچھ ایسے زاویے سے کرتے ہیں کہ بادی النظر میں عام لوگوں کو وہ بے دینی کی بات معلوم ہوتی ہے۔ آپ سنسکرت کے عالم ہیں۔ ہندوؤں کے تمام "اوپنشد" "ختم شد" کئے بیٹھے ہیں۔ گھر میں "رگ وید" کے ایک ورق پر ان کے چھوٹے بیٹے شیر اعظم نے سیاہی چھڑک دی تھی۔ آپ راولپنڈی میں "رگ وید" ڈھونڈنے آئے ہیں۔ یہاں کہاں۔ "رگ وید" نہ ملا تو بازار سے دو چھوٹے حقّے خرید کر لے گئے۔ ایک اپنے لئے، ایک ہمارے عمِ محترم سید چنن شاہ صاحب کے لئے کہ دونوں بزرگ حقّے کے بہت رسیا ہیں۔ دونوں کی بیداری کا تقریباً نصف وقت حقّہ نوشی میں گزرتا ہے۔ چچا جان نے تو مردانہ نشست گاہ میں گویا حقّہ نوشی کا لنگر کھول رکھا ہے اور ان کے گھر کو انواع و اقسام

کے حقوق کا عجائب گھر کہنا چاہیئے ۔ (۷ رجولائی)

آج بارش ہوئی ۔ خاصی تیز تیکھی ۔ مون سون برسات کی سی سانولی سلونی ۔شاید موسم تبدیل ہونے لگا ہے ۔ تبدیلی کی خوشبو کو روح کتنی جلد محسوس کر لیتی ہے اور اس کا خیرمقدم کرتی ہے ۔

میں اور انعام بھائی کل لاہور جا رہے ہیں ۔ مقصد ـــــ تلاشِ روزگار ۔ میری دِلی خواہش ہے کہ انعام بھائی کا کہیں روزگار لگ جائے ۔ وہ بہت بلند معیارِ زندگی کا عادی ہے ۔ دو گھنٹے تک غسل خانے سے نہیں نکلتا ۔ معمولی ہوٹل میں کھانا نہیں کھاتا ۔ غسل کے بعد پورا ایک ڈبہ ٹالکم پاؤڈر کا جسم پر چھڑکتا ہے ۔ رؤسا میں اٹھتا بیٹھتا ہے ۔ اکثر رؤسا ان کو اپنے سے زیادہ رئیس سمجھتے ہیں ۔ کسی کو کیا معلوم کہ رئیسی پیچھے ابالے چھوڑ آئے ۔ وہاں سے صرف سفید پوشی ساتھ لائے ۔ بڑے بھائی نے ولایت میں آٹھ دس برس کیمبرج میں فیل ہو ہو کر اس سفید پوشی کو بھی رفو کے لائق بنا دیا ۔ (۸ رجولائی)

بے چاروں کے سینگ

میں اور بھائی انعام قاضی صبح سویرے راولپنڈی سے چلے اور اتنے لمبے دن کے باوجود تقریباً شام کے وقت لاہور پہنچے۔ طویل مسافتوں کے لئے ہمارے ہاں پہلے پہل (قیام پاکستان سے قبل) ایک ہندو تاجر مسٹر نندہ نے "نندہ بس سروس" کے نام سے ایک باقاعدہ سروس قائم کی تھی۔ جس کے اپنے ٹکٹ گھر، اپنی فرودگاہیں اور اپنے ٹکٹ کلکٹر تھے۔ ان کی بسیں لاہور سے کشمیر تک چلتی تھیں۔ سنا ہے نندہ صاحب نے اب بھارت میں بھی اپنی سروس کا تانا بانا پھیلا دیا ہے۔

لاہور میں ہم کینال بنک پر میاں عبدالحیٔ مرحوم کے صاحبزادے میاں حمید کے ہاں ٹھہرے ہیں۔ عالی شان کوٹھی ہے۔ میاں عبدالحیٔ یونینسٹ پارٹی کے دورِ اقتدار میں طویل مدت تک پنجاب کے وزیرِ تعلیم رہے۔ ان کی کوٹھی میں جابجا جو تصویریں آویزاں ہیں اُن سے یہ گھر اُس زمانے کا سیاسی عجائب گھر معلوم ہوتا ہے۔ سر فضل حسین، سر سکندر حیات، سر جوگندر سنگھ، سر چھوٹو رام، راجہ نریندرا ناتھ اور (ممتاز دولتانہ کے والد) نواب احمد یار خان دولتانہ کس کس کی تصویر یہاں نہیں ہے۔ ایک فوٹو میں میاں صاحب نے درباری لباس میں کمر کے ساتھ تلوار باندھ رکھی ہے۔ گویا وزیر با شمشیر۔ آخر ہندوستان کے بازوئے شمشیر زن کے وزیر تھے نا۔ ادب سے بھی مرحوم کو گہرا لگاؤ تھا۔ میں نے کرنل ممتاز علوی (رجحان کے داماد تھے۔ ض) کے ہاں دیوانِ حافظ کا ایک نسخہ دیکھا جس کے حاشیوں پر میاں حیٔ نے شرح کے طور پر بڑے گنجان نوٹ لکھ رکھے تھے کہ اس مضمون کو نظیری نے کس طرح باندھا اور یہ استعارہ سعدی کے ہاں کس تلازمے سے آیا۔ قانون دانی میں ان کا لوہا سر شادی لال بھی مانتا تھا (سر شادی لال لاہور ہائی کورٹ کے چیف جسٹس تھے۔ وہ فرقہ وارانہ تعصّب میں پرلے درجے کے سنگھٹنی ہندو تھے) ان کے ہاتھوں کی ایک توصیفی دستاویز

میاں صاحب کے کاغذات میں موجود تھی۔ جس میں میاں صاحب کی قانونی بصیرت اور اخلاقی دیانت کا تذکرہ تھا۔

میاں حمید نے لاہور میں ایک برف خانہ کھول رکھا ہے۔ وزیر زادہ اور برف خانہ؟ یہ بات کچھ عجیب معلوم ہوئی۔ روٹی تو کما کھائے.....

ایک صاحب اور ــــ مسٹر جبار بھی میاں حمید کے ہاں مہمان ٹھہرے ہوئے ہیں۔ اورنگ آباد (دکن) میں کلکٹر تھے۔ مہاجر ہو کر یہاں آئے تو اکاؤنٹ کے محکمے میں بینگ۔ سمائے۔ سینگ ان بےچاروں کے ہیں ہی کہاں۔ نہایت نستعلیق، شائستہ حیدرآبادی شرفا میں سے ہیں۔ ولی دکنی زبانی یاد ہے۔ بتا رہے تھے کہ دکن میں ابھی تک بعض شعراء ریختی میں کلام کہتے اور زنانہ تخلص کرتے ہیں۔ ہم سے ہنستے بولتے تو بہت رہے مگر دکن کے المیے نے ان کا دِل خون کر رکھا ہے۔ ویسے اپنے دل کو تسلّی دینے کے لئے اس بات کو بار بار دہراتے رہے کہ ہم وہاں تھے تو مرقدِ عالمگیر کے قریب تھے۔ یہاں ہیں تو مسجدِ عالمگیری کے زیرِ سایہ ہیں۔

رات مولانا (چراغ حسن حسرت چیف ایڈیٹر روزنامہ امروز۔ ض) سے ملنے دفتر "امروز" میں گئے۔ مولانا علیل ہیں۔ گھر پہ تھے۔ حال ہی میں رائل پارک (میکلوڈ روڈ) سے وارث روڈ پر منتقل ہوئے ہیں۔ اب کل ان سے ملاقات ہوگی۔

(۱۰ جولائی ۱۹۵۰ء)

مولانا حسرت کی باتیں

شام، ٹونی (جاوید خٹک) نے اپنے ہاں کھانے پہ بلا رکھا تھا۔ فلمی ستاروں کا ہجوم تھا۔ ہم سمجھ رہے تھے۔ ضیافت کا اہتمام ہمارے اعزاز میں تھا۔ دعوت کشور ساہو کے بھائی اوندر کے اعزاز میں تھی۔ معبر صاحب کے گھر میں کسی فلمی نگار خانے کا گمان ہو رہا تھا۔ فوج میں کمیشن حاصل کرنے سے پہلے مردان کا یہ خوبصورت نوجوان (جاوید) کچھ عرصہ بمبئی اور کلکتے کے نگار خانوں کی چاندنی پی چکا تھا۔ نگار خانوں کی بات کرتے ہوئے یہ کہنا تو مناسب نہیں کہ وہ نگار خانوں کی خاک چھان چکا تھا۔ ٹونی نے مولانا (چراغ حسن حسرت) کو بھی مدعو کر لیا تھا۔ مگر وہ کچھ بجھے بجھے رہے۔ خاموش بیٹھے سگریٹ پھونکتے رہے یا کسی وقت عینک اُتار کر اس کے شیشے صاف کر لیتے۔ سنہری ڈبیہ کا گولڈ فلیک ان کو مرغوب ہے۔ سنگاپور میں بھی یہی برانڈ پیتے تھے۔ شکور صاحب (یاد نہیں رہا یہ کون صاحب تھے (فلمی صنعت ہی کے وابستگان میں سے تھے۔ مں) سے مولانا کی جھڑپ بھی ہو گئی۔ شکور صاحب نے مولانا کو بڑا آدمی کہہ دیا جس پر مولانا نے جواب دیا۔ " خدا مجھے بڑا آدمی نہ بنائے۔ بڑے آدمی کی غلامی کا حلقہ بڑا بھاری ہوتا ہے۔ سیاست کا غلام، شہرت کا غلام، منصب کا غلام ...... نہ بابا ہم بڑے آدمی نہیں۔" دو چار اور بہت چمکتے ہوئے الفاظ مولانا کے منہ سے نکلے۔ پتہ نہیں کیا بحث چل رہی تھی۔ مولانا نے کہا " انقلاب دولت کی افراط یا غربت کی زیادتی سے رونما ہوتے ہیں۔" کاش کوئی مولانا کی گفتگو کو محفوظ کر لیا کرے۔

کھانے کے بعد گانے کی محفل جمی۔ اہتمام گھاس کے قطعے پہ تھا۔ ساز بیٹھی اور سبز بیٹھی۔ کراچی سے رُشدی آئے ہوئے تھے۔ یہ جواں سال موسیقار ابھی اس طرف تو کچھ ایسا معروف نہیں۔ کراچی میں اس کی بڑی دھوم ہے۔ شکل بھی سلونی۔ فن بھی سلونا۔ مولانا کو اس کا انگریزی انداز کی موسیقی میں ڈھُننا پسند نہ آیا۔ وہ درمیان میں اُٹھ کر چلے گئے۔ رات

کا سناٹا۔ پھر رشدی کی آواز کی گونج۔ آرڈی ننس آفیسرز میس پاس ہی تو تھا، وہاں سے کرنل درانی، کرنل صادق ملک اور شیر محمد شاد اٹھ کر آ گئے۔

(کرنل درانی حیدر آباد دکن کے تھے۔ کرنل شیر محمد شاد ہنڈی گھیب کے تھے دونوں کا انتقال ہو چکا۔ ریٹائرڈ کرنل صادق کا تعلق بھی اٹک سے ہے۔ آپ لیفٹیننٹ جنرل اختر حسین ملک اور لیفٹیننٹ جنرل عبدالعلی ملک کے چچا زاد بھائی ہیں۔ آج کل کراچی میں کاروبار کرتے ہیں ض ۱۹۸۵ء)

دن میں انعام بھا ٘ ئی ملازمت کے سلسلے میں جناب نسیم حسن مشیر تعلیمات صوبہ پنجاب سے ملے۔ بڑے تپاک اور اخلاق سے ملے۔ میٹنگ میں تھے، مگر کارروائی کو درمیان میں روک کر ہم سے ملنے کے لئے آ گئے۔ آخر ممتاز حسن صاحب (نامور دانشور۔ گورنر اسٹیٹ بنک، چیرمین منصوبہ بندی کمیشن۔ وفاقی سیکرٹری مالیات ض) کے بھائی ہیں۔ اخلاق ہی نہیں خدوخال میں بھی دونوں بھائی آپس میں ملتے جلتے ہیں۔ ممتاز حسن صاحب کے ہم خصوصی نیاز مند ہیں۔ ہمیں ان سے شاعر اور ماہر لسانیات اے ڈی اظہر صاحب نے ملوایا تھا۔ ان کو تہذیب اور شائستگی کا پیکر کہنا چاہیئے۔ ان کے جگری دوست نذیر احمد شیخ (منفرد مزاج گو شاعر۔ مارچ ۱۹۷۱ء میں انتقال ہوا۔ ض) کہا کرتے ہیں کہ مختار حسن پیدل چل رہے ہوں اور کوئی چڑیا ان کی ٹانگوں میں سے گزر جائے تو مختار حسن سر سے اپنی انگریزی فلیٹ ٹوپی اتار کر چڑیا کا شکریہ ادا کریں گے۔

دوپہر کا کھانا ڈاکٹر اختر حسین اعوان اور اختری بھابی کے ہاں تھا۔ دونوں ڈاکٹر ہیں۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ دونوں میں سے کون بڑا ڈاکٹر ہے۔ گفتگو میں تو اختری تیز ہیں۔

(لاہور۔ ۱۱ جولائی ۱۹۵۰ء)

اور ہمیں بھی معافی مل گئی

ہمارے ہاں انگریزوں کی یادگاریں جُوں کی توں کھڑی ہیں۔ بعض یادگاریں رہنی بھی چاہئیں۔ ہمیں وہ بُری ہی کیوں نہ لگیں وہ ہماری تاریخ کے راستے کی نشانیاں ہیں۔

البتہ آج ایک کباڑئیے کی دکان پر پنجاب کے ایک گورنر سر ہربرٹ ایمرسن کی فریم شدہ روغنی تصویر آٹھ آنے میں فروخت ہو رہی تھی۔ ان صاحب کے نام پر غالباً ملتان میں ایک کالج بھی قائم ہے۔ تصویر پر گورنر کے دستخط ثبت تھے۔ انہوں نے شاید یہ تصویر اس علاقے کے کسی خان بہادر یا رائے بہادر کو اپنے دستِ مبارک سے عطا کی ہوگی۔ ہر کمالے را زوالے۔

جاپانیوں نے جب ملایا پر قبضہ کیا تو پہلا فرمان یہ جاری کیا کہ برطانیہ کے شہنشاہ جارج ششم اور چین کے چیانگ کائی شیک کی تصویریں اُتار دی جائیں۔ جلا دی جائیں!

جاپانیوں کا یہ حکم آج یوں یاد آگیا کہ آج بریگیڈیئر حبیب الرحمن سے ملاقات ہو گئی (آپ انڈین نیشنل آرمی کے بریگیڈیئر تھے۔ جنگ کے خاتمہ پر سنگاپور سے ٹوکیو جاتے ہوئے سبھاش چندر بوس جس طیارے کے حادثے میں ہلاک ہوئے۔ حبیب الرحمن بھی اسی طیارے میں تھے۔ ض ۱۹۸۵ء) وہ مل گئے تو آئی این اے کی باتیں چھڑ گئیں ان کا کہنا ہے کہ جنوب مشرقی ایشیا میں آزادی کی پہلی تنظیم سبھاش بوس نے نہیں، راس بہاری بوس نے قائم کی تھی۔ راس بہاری بوس ۱۹۱۶ء سے جاپان میں جلاوطنی کی زندگی گزار رہے تھے۔ یہ ان سے آج نئی بات معلوم ہوئی۔ تاہم اتنی بات تو ماننی پڑے گی کہ راس بوس کی قیادت میں یہ تحریک زمین بوس رہی۔ سبھاش بوس نے اس کو فلک بوس کر دیا۔

(۲۰ جولائی)

حفیظ صاحب نے عید پر دوستوں کی ضیافت کیا فرمائی کہ بیمار ہی پڑ گئے۔ آج ان کی خدمت میں حاضری دی۔ کمزور نظر آئے۔ ایک تازہ نظم بھی کہہ لی ہے۔

سُنائی - ان کا جسم کمزور ہوا ہے، آواز کمزور نہیں ہوئی۔

کوریا کی جنگ جاری ہے - آگ شدت اختیار کر رہی ہے - امریکی سپاہی پٹ رہا ہے - کوئی اور ملک ابھی تک براہ راست اس اکھاڑے میں نہیں اُترا - پنڈت جواہر لعل نہرو نے مارشل استالین اور امریکی وزیر خارجہ کو مصالحت کے لئے لکھا ہے - بین الاقوامی محاذ پر پنڈت جی بہت تیز رہتے ہیں - ادھر دہلی میں آج ہی مسئلہ کشمیر کے بارے میں (یو این او کے نمائندے) سر اوون ڈکس، خان لیاقت علی خان اور پنڈت جواہر لعل نہرو کے درمیان مذاکرات ہو رہے ہیں - دیکھنا یہ ہے کہ پنڈت جی اس معاملے میں کیا روش اختیار کرتے ہیں - زبانی کلامی تو وہ یہی چاہتے ہیں کہ دنیا ہمیشہ نرم سنہری دھوپ میں ہنستی کھیلتی رہے -

شام ہم "شورز ہوٹل" میں احسن اور کھوکھر کے ساتھ تاش پر جٹے رہے - دیر سے گھر پہنچے تو بیوی کے شور سے سابقہ ہوا - زیادہ اودھم اس وجہ سے تھا کہ احتشام (بچے) کو شدید بخار تھا - اُس کا جسم بخار سے پُھنک رہا تھا اور ہم تاش میں سگریٹ پھونک رہے تھے - خیر ہم نے اسی وقت پڑوس سے کیپٹن اللہ داد کی موٹر نکلوائی اور ان کے بیٹے ریاض (آج کل کرنل ڈاکٹر ریاض چوہان ۱۹۸۵ء) کو لیا اور شامے کو لے کر ڈاکٹر علوی کا دروازہ جا کھٹکھٹایا - ڈاکٹر صاحب اُسی وقت اُٹھ کر کلینک میں آ گئے - جو کچھ کرنا تھا کیا - کچھ دوائی کھلائی - کچھ ساتھ کر دی - بخار تو بچے کا جب اُترے گا سو اُترے گا ماں کے دل کو تو کچھ سکون ہوا - اور ہمیں معافی مل گئی -

(۲۰ر جولائی)

جتنی دیر ہم وہاں رہے، یہی ڈر رہا کہ
نہ جانے کب کوئی آجائے گا

گزشتہ دو دن فیلڈ مارشل منٹگمری کے ساتھ گذرے یعنی اُن کی کتاب کے ساتھ۔ فیلڈ مارشل نے اس کتاب میں شمالی افریقہ میں العالمین سے لے کر اٹلی میں جرمن سپہ سالار فیلڈ مارشل رومیل سے اپنے معرکوں کا حال لکھا ہے۔ منٹگمری کی آٹھویں فوج میں برٹش انڈین آرمی کے تین ڈویژن شامل رہے۔ چوتھا اور پانچواں ڈویژن افریقہ میں معرکہ آراء آٹھواں ڈویژن اٹلی میں جاملا۔

فیلڈ مارشل منٹگمری دوسری عالمی جنگ کے کامیاب ترین اتحادی جرنیل سمجھے جاتے تھے۔ کسی جرنیل کی کامیابی کا ایک ہی معیار ہے کہ وہ شکست نہ کھائے۔ پس منظر جو بھی رہا ہو، منٹگمری ہر معرکے میں کامران رہا۔ اس نے ۱۹۴۲ء کے وسط میں جب آٹھویں فوج کی کمان سنبھالی تو رومیل قاہرہ کے دروازے پر دستک دے رہا تھا۔ آٹھویں فوج ایک لہولہان فوج تھی۔ ہمارے دوست ممتاز علوی (لیفٹیننٹ کرنل پاکستان کے سیکرٹری خارجہ) کے بقول "اس فوج کے چھکے تو ابھی چھوٹے تھے مگر حوصلہ ضرور چھوٹا ہوا تھا۔"

جنرل رومیل کی شخصیت کے گرد ایک افسانوی طلسم کا خیرہ کُن ہالہ موجود تھا۔ اس کی فوج ناقابل تسخیر معلوم ہوتی تھی۔ منٹگمری نے تین مہینے کے اندر اندر بن غازی، طبروق، طرابلس اور تیونس فتح کر کے پورے شمالی افریقہ کو جرمن اور اطالوی لشکروں سے خالی کرالیا اور ۳۱ دسمبر ۱۹۴۳ء کو جب انہوں نے اس فوج کی کمان چھوڑی تو یہ فوج اٹلی کی زمین پر تین سو میل اندر دریائے سانگرد کے کناروں پر لڑ رہی تھی۔ آٹھویں فوج کی اڑھائی ہزار میل کی یہ مسلسل پیش رفت اس جنگ کے حیرت انگیز

کارناموں میں سے ہے۔

ہم نے اس عظیم سپہ سالار کو قریب سے ۱۹۴٦ء میں سنگاپور میں دیکھا۔ منٹگمری اس وقت برٹش آرمی کا سب سے بڑے سپاہی یعنی چیف آف دی امپیریل جنرل سٹاف" کے عہدے پر فائز تھے۔ سنگاپور میں انہوں نے شہر کے کشادہ ٹاؤن ہال میں فوجی افسروں سے خطاب کیا تھا۔ ستمبر ۱۹۴۵ء میں اس ایوان کے بیرونی زینوں پر کھڑے ہوکر ایڈمرل لارڈ لوئی مونٹ بیٹن نے جاپانی سپہ سالار سے تلوار رکھوائی تھی۔ فیلڈ مارشل منٹگمری کا خطاب انگریز افسروں کے لئے ہی مخصوص تھا۔ مگر ہمارا ہم جُو دوست ٹونی (کیپٹن جاوید خٹک)، نہ جانے کس طرح ہم تین چار دو) کپتانوں کے لئے بھی داخلے کا پروانہ ہتھیا لایا۔ ہم وہاں جاکر کچھ پریشان بھی ہوئے کہ لیفٹیننٹ کرنل سے کم رینک کا کوئی انگریز افسر بھی وہاں بار نہیں پا سکا تھا جتنی دیر ہم وہاں رہے، یہی دھڑکا لگا رہا کہ کب کوئی آکر اٹھا دے گا۔ کہ یوں ! ۔ مگر خیریت رہی۔ منٹگمری کے قد و قامت سے بڑی مایوسی ہوئی۔ اتنا مُنحنی سا جرنیل ہم نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اس فاتح جرنیل کے مقابلے میں تو آٹھویں فوج کا ناکام جرنیل جنرل آکنلیک کہیں زیادہ بارعب شخصیت کا مالک تھا مگر فیلڈ مارشل نے جب جنوب مشرقی ایشیا کے دفاعی منظر نامے کا جائزہ پیش کیا تو بات سمجھ میں آگئی کہ اصل چیز جسم نہیں دماغ ہے۔

(۲٦ جولائی ۱۹۵۰ء)

کتب خانہ کا بساطی خانہ

مولوی غلام اعظم صاحب جو گھر سے کبھی نکلتے ہی نہیں، اپنے بیٹے شبرّ اعظم کو ساتھ لے کر اچانک راولپنڈی آ گئے۔ مَیں تو اُن کو یہاں اپنے سامنے دیکھ کر حیران رہ گیا۔ معلوم ہُوا "اپنشد" کے نسخے ڈھونڈ رہے ہیں۔ ویدانتی سنسکرت کے اس عالم شخص کی لگن نے مجھے تو ششدر کر دیا۔ کتابوں کی دکانیں چھان ماریں۔ "اُپنشد" یہاں کہاں۔ قومی کتب خانے کے مولوی عبدالغنی نے مری روڈ پہ راولپنڈی کے نامور قانون دان اور شعلہ بیان کانگرسی لیڈر (دیوان چمن لال کے والد) دیوان دولت رام کے کتب خانے کی نشاندہی کی۔ کہا کہ اُن کی حویلی میں جھانک آئیے۔ شاید ابھی تک کتابیں موجود ہوں اور وہاں یہ کتاب مل جائے۔ وہاں پہنچے۔ کتب خانہ۔ بساطی خانہ میں تبدیل ہو چکا ہے۔

ہم سنٹرل ہوٹل میں ٹھہرے ہیں۔ یہ مری کا "انگریز ہوٹل" تو نہیں ہے۔ ہاں "دیسی شرفا" کے ہوٹلوں میں خاصا سرکردہ مقام رکھتا ہے۔ کمرے روشن اور ہوادار ہیں۔ لاری بس کا مرکز قریب ہے۔ قیامِ پاکستان سے قبل یہ ہوٹل کسی سکھ کی ملکیت تھا۔ اب پٹھان کوٹ کے شیخ حفیظ صاحب کی تحویل میں ہے۔ نواب صداقت علی خان ہمارے ساتھ کے کمرے میں مقیم ہیں۔ کسی سے باجے کے ساتھ غالب کی غزلیں سُن رہے تھے۔

(۲۷ جولائی ۱۹۵۰ء)

آج بھی نصف دن تو جنرل (نواب زادہ محمد) رضا کے ہاں اُن سے یورپ اور ترکی کے تاثرات سنتے گزر گیا۔ جنرل صاحب ترکی سے بہت متاثر معلوم ہوتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ جدت پسندی اور مغربی زندگی میں بڑا فرق ہے۔ وہ تو مغرب کی کشمکش کے ہی گرویدہ ہیں کہ جہاں کشمکش نہیں وہاں زندگی نہیں۔ رات کو انہوں نے پھر ڈنر پہ مدعو فرمایا۔ مگر مجھے تو دوپہر کے کھانے پر میجر فخرالدین اور رات کے کھانے پر محمود نظامی

(وہ اُن دنوں ریڈیو سٹیشن کے ڈائریکٹر تھے) نے پہلے سے کہہ رکھا تھا۔ میجر فخر الدین (آزاد کشمیر کے سپلائی کے محکمہ کے ڈائریکٹر تھے) مدراسی ہیں۔ انہوں نے پتوں کی روایتی طشتریوں میں خالص مدراسی "رائس کری" (RICE CURRY) سے تواضع کی۔ اور محمود نظامی تے نان کباب کے علاوہ اپنے سدا بہار لطائف سے۔ زمین سے اس شخص کا رشتہ بہت مضبوط ہے۔ اس کی شخصیت سورج کے مانند ہے کہ سورج کے رنگ بھی سب سے زیادہ اُسی وقت بکھرتے اور نکھرتے ہیں جب سورج زمین کے زیادہ قریب ہوتا ہے۔

مری آج کل خوش وقت سیاحوں سے چھلک رہا ہے۔ شام کو مال روڈ پر رنگ اور خوشبو کا سیلاب بہتا دیکھ لیجئے۔ میں سوچتا ہوں کہیں ہم طبقاتی کشمکش کی طرف تو نہیں بڑھ رہے؟ (۲۸ر جولائی)

والدہ صاحبہ گاؤں سے اچانک آگئیں۔ گاؤں سے کوئی عزیز ساتھ نہ آسکا تو گاؤں سے صادق کمہار ہی کو لے آئیں۔ چھوٹی پوتی عزیزہ بھی ساتھ ہے۔ مجھ سے خط لکھنے میں غفلت ہوگئی تو ماں بے چین ہوگئی۔ یوں تو ماں جب بھی آئے اس کے ساتھ برکت آتی ہے۔ مگر اب کے تو کشائش کی ایک بہت ہی خوش آئند لہر اُن کے ساتھ آئی۔ ہم میاں بیوی چند دنوں سے آپس میں کچھ کھچے کھچے تھے، اگرچہ گھر میں کھانا پک رہا تھا۔ بول چال بند تھی۔ سرد جنگ چل رہی تھی۔ "بے جی" آگئے تو فضا یکایک نارمل ہوگئی۔ ہم اُن کا دل تو نہیں دکھا سکتے۔ "بے جی" حسبِ معمول تین زندہ مرغیوں کے علاوہ ایک توڑے میں مختلف دالیں بھر لائی ہیں۔ گڑ شکر بھی۔ یہ راشن کوئی دو مہینے تو چلے گا۔ (۲۹ر جولائی)

کیسی کیسی افواہیں

گارڈن کالج کے دو لڑکے پوچھنے آئے کہ دوسری جنگ عظیم کیوں چھڑی تھی۔!

مجھے پہلے تو ہنسی آئی کہ بڑے بڑے سپاہیوں کے اس شہر میں یہ بچے آخر مجھ سے یہ سوال پوچھنے کیوں آئے، ہم ڈھنگ کے سپاہی بھی کہاں تھے۔ یوں دل میں خوش بھی ہوئے کہ ہمارے بارے میں کیسی کیسی خوش آئند افواہیں شہر میں گشت کر رہی ہیں۔ کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا؟ خیر۔ بچّوں کو ایک جواب تو ہم نے یہ دیا کہ برخوردار جنگ ہم نے نہیں چھیڑی تھی۔ بہرحال جب چائے کی پیالی پر ذہن کی سوئی حرکت کرنے لگی تو ہم تاریخ اور فلسفہ بھی چھانٹنے لگے۔ ہم نے کہا۔ اس سوال کے جواب میں بہت عوامل کی نشاندہی کی جا سکتی ہے۔ ایک (غالباً) سب سے بڑی وجہ تو خود معاہدہ ورسیلز تھا، جس کی ذلت آمیز شرائط نے جرمن قوم کے سینے کو انتقام کی آگ سے بھر دیا تھا۔ غالب نے سچ کہا ہے ؏

مری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی

مطلب یہ کہ اتحادیوں نے فتح کے نشے میں فراخدلی کا ثبوت نہ دیا۔ ایک اور وجہ جاپان کا منچوریا پر حملہ اور حبشہ پر اطالیہ کی یلغار تھی۔ ان واقعات سے "مجلس اقوام" کا بھرم جاتا رہا۔ یوں جنگ کا فوری باعث پولینڈ پر جرمنی کا حملہ ہوا۔

بچے بہت کچھ کریدنے آئے تھے۔ مگر ہم نے ان کو چائے کے بعد شاعری پر لگا لیا۔ دل میں یہ کھٹکا ہو رہا تھا کہ کہیں وہ ہم سے یہ سوال نہ پوچھ لیں کہ آپ نے جرمن کے خلاف اعلانِ جنگ کیوں کیا تھا۔

انیس کے انتقال پر آج چھ برس گزر گئے۔ وقت کتنی تیزی سے اُڑتا ہے۔

(۳۰ر جولائی ۱۹۵-)

مسعود کو سنگاپور سے خبر آئی ہے کہ اللہ نے اس کو دوسرا فرزند دیا ہے۔ یقیناً چاند سا بیٹا ہوگا۔ کہ ماں باپ خود چاند سے ہیں۔ مسعود نے بیٹے کا نام بھی طے کر لیا۔ جہانگیر۔ اولاد کے معاملے میں مسعود نے تاریخ اسلام کھول کر سامنے رکھ لی ہے۔ صلاح الدین کے بعد جہانگیر آگیا۔

آگے آگے دیکھئے آتا ہے کیا

ادھر ہمارے ہاں احتشام کے بعد بیٹی پیدا ہوئی پڑی ہے اور ہمیں اس کا نام رکھنے کی فرصت نہیں۔ ہم میاں بیوی کا آپس میں کسی نام پر اتفاق نہیں ہو رہا۔ میں جس طرح کے چمکیلے نام تجویز کرتا ہوں۔ وہ حاج (ہماری بیوی جہاں آراء) کو "شریفانہ" معلوم نہیں ہوتے اور بیٹی کے لئے جو نام وہ ڈھونڈ کر لاتی ہیں وہ اتنے رسمی اور لمبے لمبے ہیں کہ تین تین لڑکیوں کے لئے کافی ہو سکتے ہیں۔ فی الحال "ببو" سے کام چلایا جا رہا ہے۔

(بعد میں اس بچی کا نام تابندہ قرار پایا۔ مگر نام رکھنے کی دیر تھی کہ یہ ننھی سی جان سوا برس کی عمر میں ہم سے ہمیشہ کے لئے جُدا ہو گئی۔

(۳۱ر جولائی)

حفیظ صاحب (ابو الاثر) پاکستان کی جدوجہد کی تاریخ منظوم کرنا چاہتے ہیں۔ نام ہوگا "نظم پاکستان"۔ حفیظ صاحب اگر اس منصوبے سے لپٹ گئے تو کر ہی ڈالیں گے۔ تاریخ کو شاعری میں سمونے کا نسخہ انہیں خوب آتا ہے۔

بھائی آغا سید محمد افضل شاہ صاحب کے ہاں چھپر سیداں کے سید محمد شاہ کے ساتھ لدھو ہار کے ایک رئیس سے ملاقات ہوئی۔ دونوں حضرات

اپنی بعض خصوصیات کے سبب منفرد ہیں۔ سید محمد شاہ بیک وقت پانچ چھ اشخاص سے گفتگو کر سکتے ہیں۔ ایک کا سوال سن رہے ہیں دوسرے کو جواب دے رہے ہیں بات میں شیرینی بھی ہوتی ہے۔ دوسرے بزرگوار اس اعتبار سے منفرد ہیں کہ ان کو مختلف سُنت کی پگڑی باندھنے کا شوق ہے کوئی پگڑی "لمبی سحر" میں ہوتی ہے کوئی چھوٹی سحر میں۔ کوئی پیچ دار۔ کوئی سلیس۔ سفر پر نکلتے ہیں تو کلاہ پر بندھی ہوئی دو تین پگڑیاں حقے کے ہمراہ ملازم کے ہمراہ رہتی ہیں۔

(یکم اگست ۱۹۵۰ء)

اے ڈی اظہر اور حمید نظامی

چٹاگانگ سے مسٹر اے ڈی اظہر نے تار کے ذریعے کل پاک و ہند مشاعرے میں شرکت کی دعوت دی ہے۔ یہ مشاعرہ ۱۴ اگست کو یوم آزادی کی خوشی میں رکھا ہے۔ اپنی زبان و تہذیب میں اظہر صاحب جیسی لگن بہت کم لوگوں میں نظر آئی۔ سوچ اور تمدن کے لحاظ سے وہ ہمارے اعلیٰ سرکاری افسروں کی عام کھیپ سے بالکل الگ نظر آتے ہیں۔ ان کی جڑیں اپنی زمین میں بہت گہری ہیں۔ ان کے قریبی دوست مثلاً چوہدری محمد علی (پاکستان کے وزیر اعظم رہے) اور ممتاز حسن احسن (وفاقی سیکرٹری مالیات رہے) ان کو پیار سے "جنرل" کہا کرتے ہیں۔ وہ کہا کرتے ہیں کہ "جنرل" خواہ لندن میں ہو، صبح کا ناشتہ دہی اور لسی سے کرے گا۔ تو جنرل نے چٹاگانگ پہنچتے ہی اُردو کی سبھا جما لی۔ پنجاب سے (جہاں وہ سیکرٹری خزانہ تھے۔ اور انہوں نے انگریز گورنر سر فرانسس موڈی سے پوچھے بغیر اپنے محکمے میں اردو زبان نافذ کر دی۔ ص ن) تو اظہر صاحب کو اُردو نے نکلوایا۔ دیکھئے بنگال میں کتنے دن ٹکتے ہیں۔

چلئے اس بہانے ہم مشرقی پاکستان دیکھ لیں گے۔ اس سے پہلے "بنگال" دیکھا تھا۔ بنگال بھی کیا دیکھا تھا۔ کچھ دن بارک پور کی بارکوں میں رہے اور دوسری مرتبہ کچھ دن چورنگی کے گرانڈ ہوٹل میں (دوسری عالمی جنگ میں یہ ہوٹل فوجی افسروں کی فرودگاہ کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ ص ن)۔ دوسری مرتبہ (یہ ۱۹۴۶ء کا ذکر ہے ص ن) کلکتہ کا شہر ہندو مسلم فسادات کی فیصلہ کن لپیٹ میں تھا۔ بنا بریں جتنے دن وہاں رہے کلکتہ بھی کیا دیکھا۔ ہوٹل ہی کو دیکھتے رہے۔ یا انگریز افسروں اور انگریز "ویکاٹیوں" کے رقصِ محبوبی کو دیکھتے رہتے تھے جو الگ تھلگ کھڑے ہماری "آگ" کو دیکھ رہے تھے۔

ہاں ایک مرتبہ اس سے بھی پہلے جب ہم جاپانی جنرل یاماشیٹا سے دو دو ہاتھ کرنے

ملایا جا رہے تھے تو ہمارا لشکر بردار جہاز چٹاگانگ کے بندر پر ٹھہرا تھا لیکن ساحل پر اُترنے کی اجازت نہ ملی۔ جاپانیوں کی بمباری سے بندرگاہ کی عمارتوں کی چھتیں اُڑ گئی تھیں۔ جہاز کے عرشے سے ان لٹی پٹی بارکوں میں بنگالی مزدوروں کو دیکھتے رہے۔ جو بارکوں سے زیادہ لٹے پٹے تھے۔ نحیف و نزار، جبڑے نکلے ہوئے، زنگ دھڑنگ۔

(۳۔ اگست ۱۹۵۰ء)

ہم جیسے متوسط الحال خاندان جو صرف کھیت پر زندگی کا کھیل نہیں کھیل سکتے۔ اور تجارت سے رغبت نہیں رکھتے، ملازمت کرنے پر مجبور ہیں۔ ہم لوگ شادی غمی کی تقریبات پر ہی گاؤں میں جمع ہوتے ہیں۔ کبھی بیاہ کرنے کے لئے آگئے اور کبھی کسی عزیز کو قبر میں اُتارنے کے لئے یا خود دفن ہونے کے لئے۔ ورنہ زندگی گھروں سے دُور دُور دانہ دُنکا چگنے میں گزر جاتی ہے۔ آج میں آغا سید محمد افضل شاہ (میرے پھوپھی زاد کے چچازاد بھائی۔ ص) کے ہاں گیا تو وہاں بھاپا سید عدالت حسین شاہ مل گئے۔ وہ عمر میں ہم سب سے بڑے ہیں۔ منصب میں بھی ہم سب سے اونچے ہیں (وہ اُن دنوں محکمہ امداد باہمی کے ڈپٹی رجسٹرار تھے۔ ص) کردار و ایثار کے اعتبار سے بھی اُن کی پوزیشن خاندان کے سربراہ کی ہے۔ آج ایک عرصہ کے بعد ان سے اچانک ملاقات ہوئی۔ میں بہ نگاہِ اوّل ان کو پہچان نہ سکا۔ انہوں نے ڈاکٹروں کے مشورے پر دانتوں کی پوری بتیسی نکلوا دی ہے۔ دانتوں کے نکلنے سے آدمی کی عجیب صورت نکل آتی ہے۔ میں تو بڑی مشکل سے ہنسی ضبط کر سکا۔

(۴۔ اگست)

حمید نظامی (ایڈیٹر روزنامہ نوائے وقت) بڑا وضع دار انسان ہے وہ جب کبھی راولپنڈی آتے ہیں اس ناچیز کو ضرور یاد کرتے ہیں۔ حالانکہ ان جیسے معروف شخص کے لئے ہم سے خالی ہاؤ و ہُو کرنے والوں کے لئے چند ساعتیں نکالنا بھی مشکل ہوتا ہے۔ مگر یہ شخص اسلامیہ کالج لاہور میں ہم سبق ہونے کے رشتے کا

بہت پاس کرتا ہے۔

آج ہم نے ان کو شام کے وقت چائے کے پیالے پر صدر کے ایرانی ریستوران میں بلا لیا صحافتی حلقے سے کرنل شہباز خان (ڈائریکٹر عسکری تعلقات عامہ) اور جواد صاحب (ڈائریکٹر تعلقات عامہ آزاد کشمیر) تھے۔ اور ادب و شعر کے حوالے سے اپنے حضرت ابوالاثر نذیر احمد شیخ۔ افسانہ نگار عزیز احمد اور انشا پرداز عزیز ملک۔ اکابرین میں سے میجر جنرل نذیر احمد اتفاقاً ہاتھ آ گئے۔ ہم اُن کو بھی ہاتھوں ہاتھ لے آئے۔ ادب اور سیاست زیر بحث رہے۔ حمید نظامی مسلم لیگ کے اندرونی انتشار سے پریشان ہیں۔ چوہدری خلیق الزمان اور ممتاز دولتانہ کے خلاف ان کا لہجہ خصوصیت کے ساتھ نوکیلا تھا۔ ادب کے حوالے سے وہ ادب کی پاکستانی شناخت کے خدوخال کی فکر کرتے رہے۔ ہم نے عرض کیا۔ صاحب یہ تو نکلتے نکلتے نکلیں گے۔ اب تو وہ سیاست کی منجدھار میں رہتے ہیں۔ کالج کے زمانے میں ہلکے پھلکے مضامین لکھنے کے لئے بھی ان کی دھوم تھی۔ خطابت اور قیادت کے علاوہ۔ میاں بشیر احمد اور مولانا حامد علی خان (مدیرانِ رسالہ "ہمایوں"۔ ض) بڑے اہتمام سے ان کے مضامین "ہمایوں" میں چھاپتے تھے۔ یہ دیکھ کر خوشی ہوئی ابھی تک ان کی روح میں ادب کا چراغ ماند نہیں ہوا۔

جنرل نذیر کا ایک لطیفہ اس صحبت کا حاصل ہوا۔ جنرل صاحب ۴۸ ۱۹ء کی جنگ کشمیر کے تذکرے میں انہوں نے کہا۔ ہم گریسی (کمانڈر انچیف جنرل سر ڈگلس گریسی) سے انگریزی بولتے تھے اور جنگ اردو میں لڑتے تھے۔

(۶۔ اگست)

ایک نشست بریگیڈیئر الطاف قادر کے ساتھ

شیخ عبدالقادر کو حفیظ صاحب اپنا محسن سمجھتے ہیں۔ اُن کی اولاد سے بھی خصوصی تعلق خاطر رکھتے ہیں۔ جس طرح کوئی مرید اپنے مرشد کے صاحبزادوں کے لئے ارادت رکھتا ہو اسی جذبے کے تحت وہ گاہے گاہے بریگیڈیئر الطاف قادر (پاکستان آرمی میں لیفٹیننٹ جنرل ہوئے) سے ملنے چلے جاتے ہیں۔ جو ایک بریگیڈ کمان کر رہے ہیں۔ آج کشاں کشاں مجھے بھی ساتھ لے گئے۔ میں نے دیکھا کہ شیخ صاحب کی اولاد بھی حفیظ صاحب کے ساتھ ایک قلبی تعلق محسوس کرتی ہے۔ حفیظ صاحب کو بریگیڈیئر صاحب سے اُن کے بچپن کے زمانے کی چھیتی بلیّوں اور کبوتروں کی باتیں پوچھتے رہے۔ لیکن ہم نے اُن سے عسکری موضوعات پر اچھا خاصا انٹرویو کر لیا۔ کچھ اپنے صحافتی پیشے کی ترنگ اور شاید کچھ یہ جتانا بھی منظور ہو کہ ہم بھی پانچ سواروں میں سے ہیں۔ ؏

جس طرف جاؤ گے دیوارِ انا بھی آئے گی

بریگیڈیئر صاحب کے خیالات کا خلاصہ بلکہ "ملغوبہ" کچھ اس طرح بنتا ہے۔

- فرانس کی شکست کا باعث سیاستدانوں کی دھڑا بندی تھی۔
- برطانیہ کا سٹاف کالج سپاہی کم اور مفکر زیادہ پیدا کرتا ہے۔
- جدید جنگ کو سپاہی سے زیادہ ایک سائنسدان کی نظر سے دیکھنا ہو گا۔
- جنگ کسی اعلیٰ مقصد کے بغیر چھیڑی تو جا سکتی ہے لڑی نہیں جا سکتی۔
- توپ خانہ ابھی ایک مدت تک ٹینک کے ساتھ ایک مؤثر قوت ثابت ہو گا۔
- اقتصادی استحکام کے بغیر جنگ دیر تک نہیں لڑی جا سکتی۔
- برما میں جاپانیوں نے اپنی مہم بڑی مہارت سے لڑی۔ اُن کو ہوائی طاقت اور جنگل کی لڑائی میں واضح فوقیت حاصل رہی۔ وہ بڑے بڑے خطرات میں کود گئے اور نکل گئے۔

• زمانہ امن میں فوج کی یہ حالت ہونی چاہیئے کہ جنگ چھڑنے پر وہ بھرپور حملے اور مکمل دفاع کی پوری صلاحیت رکھتی ہو۔ مختصر مگر کارفرما ہو۔ سامان نہ اتنا کم ہو کہ لڑنا مشکل ہو، نہ اتنا زیادہ کہ اٹھانا مشکل ہو۔ انفنٹری ڈویژن میں سپاہیوں کی تعداد کم کر کے توپ خانے کے عنصر کو زیادہ کرنا چاہیئے۔ بھاری مشین گن اب قطعاً فضول ہو چکی ——— بنیادی اصول تین ہیں ——— ایمانداری - انصاف اور صلاحیت۔

بریگیڈیئر صاحب نے جب یہ محسوس کیا کہ عسکری محاذ پر ہماری پیش قدمی ضرورت سے زیادہ بڑھتی جا رہی ہے تو انہوں نے ٹینک۔ توپ وغیرہ کو روک کر حفیظ صاحب سے کلام سنانے کی فرمائش کر دی۔ مگر بہ تاکید غزل کی فرمائش کی۔ حفیظ صاحب بھلا کوئی چیز تمہید کے بغیر کیوں سنانے لگے۔ انہوں نے ایک غزل اس تمہید کے ساتھ سنائی کہ یہ غزل انہوں نے ۱۹۳۸ء میں لندن کے ایک جلسے میں سر عبدالقادر کی صدارت میں سنائی تھی اور شیخ صاحب نے انگریزوں کو اس کا ترجمہ سنایا تھا۔ غزل کا مطلع یہ ہے

ہم ہی میں تھی نہ کوئی بات یاد نہ تم کو آ سکے
تم نے ہمیں بھلا دیا ہم نہ تمہیں بھلا سکے

(۷ر اگست ۱۹۵۰ء)

جنرل ناصر علی خان سے پہلی ملاقات

جنرل ناصر علی خان کو سٹاف کار میں گزرتے دیکھا تو ان سے پہلی ملاقات کی یاد تازہ ہو گئی۔ یہ ملاقات ۱۹۴۶ء میں غالباً نومبر یا دسمبر کے مہینے میں نئی دہلی میں ڈاکٹر ایم ڈی تاثیر کے ہاں ایک شعری نشست میں ہوئی تھی۔ شرکار محفل میں جہاں سائل اور بیخود جیسے دہلوی استاد تشریف فرما تھے وہاں پنجابی شعرار و ادبا کا بھی پورا جتھہ موجود تھا۔ ان میں سے مجھے کرنل مجید ملک، پروفیسر احمد شاہ بخاری، ابوالاثر حفیظ جالندھری، فیض احمد فیض، ن م ۔ راشد، حفیظ ہوشیار پوری، اے ڈی اظہر، اسد ملتانی، شوکت تھانوی، ہری چند اختر، ضیا جالندھری اور بالمکند عرش کے نام یاد آرہے ہیں۔ میں کپتان تھا اور جنوب مشرقی ایشیائی کمان سے چھٹی پر جہلم جاتے ہوئے چند دن کے لئے دہلی میں رک گیا تھا۔

نشست میں شعرار کرام کے علاوہ چند اکابرین وافسران بھی موجود تھے۔ مثلاً خواجہ حسن نظامی، میاں امین الدین۔ (پنجاب کے گورنر رہے) کنور مہندر سنگھ بیدی (جو بھارت میں کمشنر ہوئے مگر شہرت شاعری کے ناتے پائی) پی این تھاپر (حکومت ہند کے سیکرٹری رہے)۔ تھاپر کے ہمراہ اُن کے چھوٹے بھائی بھی تھے۔ وہ بھی پی این تھاپر۔ ایک پران دوسرا پریم۔ چھوٹا بھائی فوج میں لیفٹیننٹ کرنل تھا (بھارتی

فوج میں جنرل ہوئے) مجید ملک اور فیض احمد فیض کے علاوہ ایک اور فوجی افسر اس نشست میں موجود تھے۔

کرنل ناصر علی خان R

آپ فل کرنل تھے اور جنرل ہیڈ کوارٹر (انڈیا) کی ملٹری سیکرٹری برانچ میں ڈپٹی اسسٹنٹ ملٹری سیکرٹری کے منصب پر فائز تھے۔ ڈاکٹر صاحب نے جب کپتان صاحب کا یعنی ہمارا تعارف کرنل صاحب سے کرایا تو کپتان صاحب کے حواس کے طوطے اڑ گئے۔ دیسی کرنل ان دنوں خال خال نظر آتا تھا۔ سرخ فیتے والا پہلا دیسی افسر جو ہم نے مشرقِ بعید میں دیکھا وہ ایک مرہٹہ کرنل کھنولکر تھا۔ بریگیڈیئر گلزار کی ترقی کی خبر ضرور پڑھی تھی لیکن فل کرنل کی وردی میں ان کو دیکھا نہیں تھا۔ مور کسی جنگل میں ناچتا رہا۔ ہم پہ فل کرنل کی وہ دہشت تو خیر نہیں تھی جو پلٹن اور بارک میں رہنے والے ایک عام کپتان پر ہوتی۔ کیونکہ ہمارے اپنے باس مجید ملک فل کرنل تھے۔ اور اس رینک کے باوجود اندر سے وہی لاہور کے بارود خانے کے ٹھنڈے میٹھے، ادب کی شیرینی میں رچے بسے دوستدار شخص تھے۔ تاہم کرنل ناصر علی خان کے روبرو آنے پر تھوڑی سی کپکپی ضرور محسوس ہوئی۔ کیونکہ وہ ہمارے محکمے کے افسروں کی طرح "کاغذی پیرہن" کے قلمی افسر نہ تھے۔ ان کے نام کے ساتھ "بلوچ رجمنٹ" کا طغریٰ چسپاں تھا۔ شروع میں تو اتفاقاً ہم اُن کے ساتھ ہی بیٹھ گئے تھے مگر جب اُن کے نام اور رینک کی سنسنی تیز ہوئی تو دبے زبان اُن سے معذرت کر کے اور دبے پاؤں چلتے ہوئے دوسرے کونے میں بالمکند عرش ملسیانی کے پاس جا بیٹھے۔

کرنل ناصر علی چھریرے جسم اور ملاحت مائل رنگت کے سمارٹ افسر تھے۔ کم گو، باوقار لئے دیئے۔ ادبی نشستوں میں لوگوں کے درمیان تیکھے تیکھے جملوں کی جو پتنگ بازی ہوتی ہے اُس میں انہوں نے قطعاً کوئی حصہ نہ لیا۔ البتہ جب شاعری کا دَور چلا تو اچھے

شعر پہ "سلو مارچنگ" کی دھن میں سر ہلاتے رہے۔ سادگی اور انکسار ان کے ماتھے پہ لکھا نظر آتا تھا۔ کرنیلی کے ٹھاٹھ کی ایک ہی ادا دیکھی کہ ایک گھوڑے والی بید کی ہلکی پھلکی فٹن پہ آئے اور گئے۔ سوار بھی خود سائیس بھی خود۔ ان دنوں پٹرول کی راشننگ کے باعث اکثر افسر سائیکلوں پہ آتے جاتے تھے۔ ہاں جو افسر زیادہ طرحدار ہوتے یا جس کسی کے پیچھے کوئی سر گورنجش سنگھ یا سر عمر حیات خان ٹوانہ یا مہاراجہ الور ہوتا تو اس قسم کے "شہزادے" ایک یا دو گھوڑے والی فٹن پہ نکلتے۔

مجھے اپنی بے دلی اور اپنے شب و روز کی یکسانیت کے باعث لگتا تھا کہ آج ایک لفظ بھی نہ لکھ پاؤں گا۔ جنرل صاحب کا شکریہ کہ وہ اتفاقاً نظر آ گئے۔ سٹاف کار ہی میں سہی۔ (۸ر اگست ۱۹۵۰ء)

کرسی۔ ریڈیو اور سیلاب

ملک فیروز خان نون گورنر مشرقی پاکستان یہاں آئے ہوئے ہیں۔ وہ مال روڈ پہ اپنے بھائی کرنل علی نون کے گھر ٹھہرے ہیں۔ ہم بھی ملنے گئے۔ ملاقاتیوں کا میلہ لگ رہا تھا۔ یہ سب گورنری کی جوالا ہے۔ ورنہ گورنری سے پہلے ہی ملک فیروز خان نون جب لاہور میں ریس کورس کے پیچھے رائے بہادر لالہ سوہن لال کی کوٹھی میں رہتے تھے تو چند پرانے جاں نثاروں کے سوا کون ملنے آتا تھا۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب آپ لاہور سے روزنامہ "غالب" نکالتے تھے۔ یعنی نکلواتے تھے۔ ملاقاتیوں کی اتنی بھیڑ میں یہ بھی غنیمت ہے کہ ہر ملنے والے سے مسکرا کے ملے اور بڑی اپنائیت سے ہر کسی کی بات سنی۔ دل میں تو کہہ رہے ہوں گے کہ — کس (بلکہ کس کس) کی حاجت روا کرے کوئی۔ قرائن سے لگتا تھا کہ صبح سے شام مسکراہٹ اور مٹھاس کا میلہ بھرا رہے گا۔ مسکراہٹ فیروز خان نون کی اور شربت علی نون کا۔ (۹ر اگست ۱۹۵۰ء)

راولپنڈی میں بھی ریڈیو اسٹیشن کھل گیا۔ نواب مشتاق احمد گورمانی (وزیر امور کشمیر) نے افتتاح کیا۔ کنٹرولر جنرل مسٹر زیڈ اے بخاری نے خطبۂ استقبالیہ پڑھا۔ لکھا ہوا خطبہ کم پڑھا، منہ زبانی زیادہ بولے۔ موتی جھڑتے ہیں اس شخص کے منہ سے۔ ریڈیو فنکاروں کا محکمہ ہے۔ اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس کا سربراہ اس محکمے کا سب سے بڑا فنکار ہے۔ اسٹیشن ڈائریکٹر محمود نظامی کی شگفتہ گفتاری بھی اپنا جواب نہیں رکھتی۔ انہوں نے اپنے ابتدائی اور اختتامی کلمات سے ماحول کو الگ روشن رکھا۔ بنیادی طور پر یہ ایک رسمی سی سرکاری تقریب تھی۔ مگر بخاری اور نظامی کی پھلجھڑیوں نے تقریب کو ریڈیو کا ایک ہلکا پھلکا فیچر پروگرام بنا کر رکھ دیا۔ نواب مشتاق احمد گورمانی خود شیریں کلام شخص ہیں۔ ان کی گفتگو نے اپنی جگہ سماں باندھا۔ کوئی اور وزیر ہوتا تو سخت پھیکا رہتا۔

ریڈیو اسٹیشن ۲۰۳ پشاور روڈ پر قائم کیا گیا ہے۔ یہ ویران کوٹھی — سانپوں والی کوٹھی کے نام سے مشہور ہے۔ اللہ جانے کیوں ؟

(یکم ستمبر ۱۹۵۰ء)

پنجاب کے لئے ستمبر کا سارا مہینہ سیلابوں کا مہینہ رہا۔ پہلے راوی میں طغیانی آئی۔ پھر چناب اچھل پڑا۔ راوی نارمل ہو کر چناب کی دیکھی دیکھا پھر اچھل پڑا۔ وہی مضمون کہ مردہ جب بولے تو کفن ہی پھاڑے۔ دونوں ندیاؤں نے وسیع تباہی مچائی۔ نصف پنجاب تہہ آب آ گیا۔ فصلیں برباد ہو گئیں۔ مویشی بہہ گئے۔ مکان ڈھہ گئے۔ اتلافِ جان کا کوئی اندازہ نہ ہو سکا۔ ہاں اس بات کا اندازہ ہو گیا کہ سیلاب کی انسدادی اور امدادی کارروائیوں کے لئے ہمارے پاس پہلے سے کوئی تنظیم یا منصوبہ موجود نہیں ہے۔ سیلاب آتا ہے تو — دوڑیو، لینا، پکڑیو کی دہائی دی جاتی ہے۔ ڈپٹی کمشنروں کے ہاتھ پاؤں پھولنے لگتے ہیں تو فوج بلوا لی جاتی ہے۔ اس سیلاب نے نہروں کو بھی

عظیم نقصان پہنچا۔ دریاؤں کے اشتعال پر جگر مراد آبادی کا ایک مصرع یاد آگیا۔

ع دل سا دوست نہ دل سا دشمن

(یکم اکتوبر ۱۹۵۰ء)

عطاء اللہ شاہ بخاری اور ڈاکٹر تاثیر

کئی برسوں کے بعد آج احرار تبلیغ کانفرنس کے جلسے میں امیرِ شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی تقریر سنی۔ شیر بوڑھا ہو گیا مگر دھاڑ کی گھن گرج وہی ہے۔ حاضرین کی تعداد تقریباً بیس ہزار ہو گی۔ شاہ صاحب کی تقریر اڑھائی گھنٹے جاری رہی۔ کیا مجال کہ کوئی ایک شخص بھی اُٹھ سکا ہو۔ ایک طلسم تھا جس نے روحوں کو گرفت میں لے رکھا تھا۔ ان کے منہ سے نکلے ہوئے الفاظ حاضرین کے چہروں پر شعلے بن کر دمک رہے تھے۔ وہ قرآن پڑھتے تو کائنات جھومنے لگتی۔ انہوں نے جب چاہا لوگوں کو ہنسا دیا، جب چاہا رُلا دیا۔ کبھی ٹھیٹھ سرائیکی، کبھی کوثر میں دھلی ہوئی اُردو۔ برصغیر ہندو پاکستان نے اتنا سحر بیان خطیب شاید ہی کوئی دوسرا پیدا کیا ہو۔ (۲ اکتوبر ۱۹۵۰ء)

کل سے ایبٹ آباد میں ہوں۔ پروفیسر شوکت واسطی نے گورنمنٹ کالج میں دو روزہ مشاعرہ برپا کر رکھا ہے۔ سپرنگ فیلڈ ہوٹل میں ٹھہرا ہوں۔ ۱۹۴۸ء میں ۹ فرنٹیئر ڈویژن کے اکثر افسر اسی ہوٹل میں رہتے تھے۔ اتفاق دیکھئے کہ مجھے وہی کمرہ ملا ہے جہاں میں ۱۹۴۸ء میں رہ چکا ہوں۔ میجر زین الدین میرے ایک بازو میں رہتے تھے اور کیپٹن قیوم دوسرے پر۔ ع

آتا ہے یاد مجھ کو وہ اُن کا چھپانا

کبھی انگریزی میں چھپاتے، کبھی فارسی میں۔ برآمدے میں ہوتے تو انگریزی گاتے، غسل خانے میں ہوتے تو فارسی کو نوازتے۔

ع شاید کہ باز بینم آں یارِ آشنا را

یہ ہوٹل اب نئی انتظامیہ کے ہاتھوں میں ہے ۔ فرنیچر بھی وہی ہے، کھانا بھی وہی ۔ چمن بہتر ہو گیا ہے ۔

مشاعرے کی ایک نشست کی صدارت کا اعزاز مجھے دیا گیا ۔ شوکت واسطی کی دوست پروری کہیئے ۔ دوسری نشست کے صدر میاں جعفر شاہ وزیر تعلیم صوبہ سرحد تھے ۔ اشتہار میں عابد علی عابد اور فیض احمد فیض کے نام بھی لکھے تھے ۔ وہ نہیں پہنچے ۔ شہرت بخاری کی سبک غزل اور شیریں ترنم نے بڑا رنگ باندھا ۔ کلب میں خان فقیرا خان جدون کی چائے پر جناب محمد اسلم خٹک ڈائریکٹر تعلیمات (بعد میں گورنر اور وفاقی وزیر داخلہ) سے طویل ملاقات رہی ۔ ان کو صوبہ سرحد میں ادبی سرگرمیوں کے فروغ میں مستعد پایا ۔ یہ پہلا ماہر تعلیم دیکھا جو دیکھنے میں ماہرِ تعلیم معلوم نہیں ہوتا ۔ دیکھنے میں یہ وہی معلوم ہوتا ہے جو اصل میں وہ ہے ایک ٹھیٹھ ، مخلص ، پُرجوش ، ہمدرد ، روشن خیال اور وضع دار پٹھان ۔

(۱۲ ۔ نومبر ۱۹۵۰ء)

بریگیڈیئر گلزار اور کرنل شہباز خان فوج میں میری واپسی کے لئے کوشاں ہیں ۔ جی ہمارا ابھی للچا رہا ہے ۔ اس عرصے میں یہ بھی دیکھ لیا کہ اس وردی سے زیادہ معتبر کوئی پیرہن نہیں ۔

اے ڈی اظہر نے پھر چاٹگام بلوایا ہے ۔ دس دسمبر کو مشاعرہ رکھا ہے ۔ ادھر لاہور سے ۷ دسمبر تک ہوائی جہاز پہ ایک نشست بھی نہیں مل سکتی ۔ آج لاہور جا رہا ہوں، وہاں سے کراچی ۔ وہاں ہمارے دوست مشتاق احمد یوسفی (طنز و مزاح نگار) کی سعی سفارش سے شاید سیٹ مل جائے ۔

(راولپنڈی ۲۲۶ کلائیڈ روڈ ۔ ۲۸ ۔ نومبر ۱۹۵۰ء)

لاہور سے واپس آ گیا ۔ اظہر صاحب کا تار مل گیا کہ مشاعرہ سولہ دسمبر پر ملتوی ہو گیا ۔ لاہور میں مولانا چراغ حسن حسرت ۔ فیض احمد فیض ۔ حمید نظامی سے ملاقات

رہی۔ راجہ محمد افضل خان (ترقی دیہات فیم) کے ہاں نشست تھی۔ حبیب ملک (ڈپٹی انسپکٹر جنرل پولیس) اور حسیب ملک (آل انڈیا ریڈیو فیم) بھی موجود تھے۔

۳۰ نومبر کو گیارہ بجے حمید نظامی کے پاس بیٹھا تھا کہ ڈاکٹر تاثیر کے انتقال کی خبر ملی۔ رات کو دل کا دورہ پڑا۔ رات گیارہ بجے تک بھلے چنگے تھے۔ تاثیر کی موت ادب و فن کے لئے ایک عظیم حادثہ ہے۔ یہ خلا مشکل سے پورا ہوگا۔ یہ شخص ایک تحریک تھا۔ انجمن تھا اپنی ذات میں۔ عہد ساز۔ کتنی جلد اٹھ گیا۔ اردو ادب کی رونق جاتی رہی۔ ایک بڑا روشن ستارہ ٹوٹ گیا۔

(راولپنڈی - ۴؍ دسمبر)

چٹاگانگ اور ڈھاکہ میں

صبح ساڑھے دس بجے کراچی پہنچے۔ انعام بھائی اسٹیشن پر موجود تھے۔ دوپہر کا کھانا ایک ریستوراں میں ممتاز علوی کی طرف سے تھا۔ قدرت اللہ شہاب اور میجر غلام رشید سے بھی ملاقات ہوگئی۔ ممتاز علوی کی باتوں کی دلآویزی اور تابناکی کے کیا کہنے۔ ان کے مشاہدات کی نیرنگی میں اب آسٹریلیا کی خوشبو بھی شامل ہوگئی ہے۔ "اورینٹ ایرویز" سے ڈھاکہ کی نشستیں بک ہوگئیں۔ حفیظ صاحب اس معاملے میں اسکندر مرزا (سیکرٹری دفاع) تک جا پہنچے ورنہ غالب کی آبرو کیا تھی۔

(۱۴؍ دسمبر)

صبح چار بجے ہم کراچی سے اُڑے اور سہ پہر کے چار بجے چٹاگانگ میں آ بیٹھے۔ سید محمد جعفری، ظریف جبل پوری اور ادیب سہارنپوری بھی ہمسفر تھے۔ سفر نہایت پُرلطف گزرا۔ سید محمد جعفری کے ہر جملے میں کوئی نہ کوئی تازہ لطیفہ چمکتا رہا۔ ہوائی جہاز دہلی میں بھی رکا۔ نکلتے ہوئے سورج میں جاگتی ہوئی دہلی کا منظر بڑا دلفریب تھا۔ اظہر صاحب ہمیں لینے کے لئے ڈھاکہ کے مطار پر موجود تھے۔

(۱۵؍ دسمبر)

رات مشاعرہ ہوا اور ساری رات ہی ہوتا رہا۔ جناب زاہد حسین گورنر سٹیٹ بنک

صدرِ مشاعرہ تھے اور مشاعرے کے دوران میں جو ادبی ٹکڑے وہ جا بجا پھینکتے رہے ان سے اندازہ ہوا کہ زاہد صاحب مانیں یا نہ مانیں، وہ اندر سے شاعر تھے۔ حاضر شاعر نہیں تو سابق شاعر سہی۔ اساتذہ میں سے جگر مراد آبادی، حفیظ جالندھری اور جلال الدین حیدر دہلوی نے کلام سے نوازا۔ حیدر دہلوی کی درویشانہ وضع اور شعر پڑھنے میں ان کے لہجے کا جلالی طنطنہ دل کو بہت متاثر کرتا ہے۔ ان کا یہ شعر حاصلِ مشاعرہ رہا۔ ؎

چمن والوں سے مجھ صحرا نشیں کی بود و باش اچھی
بہار آکر چلی جاتی ہے، ویرانی نہیں جاتی

فنا نظامی کانپوری کے سحر آفریں ترنم نے بھی سماں باندھا۔ دیکھنے میں فنا ایک کٹر مولوی معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن شعر میں شوخی کا امتزاج، زندگی کے خوبصورت رنگوں کی غمازی کرتا ہے۔ کسی نے سچ کہا ہے کہ پورا آدمی کبھی نظر نہیں آتا۔

پاکستان سول سروس کے نوجوان افسروں کا ایک گروپ ان دنوں چٹاگانگ میں تربیت پا رہا ہے۔ ان میں الطاف گوہر بھی شامل ہیں جو ضیا جالندھری وغیرہ کے ساتھ، حلقۂ اربابِ ذوق کے خاصانِ خاص میں سمجھے جاتے ہیں۔ گوہر نے جدید لہجے کی ایک نظم سنائی۔ ویسے بھی ان کو بہت داد ملی مگر داد کے شور میں ان کے ایک گورے چٹے ساتھی جو پیچھے بیٹھے تھے شاید آفتاب احمد خان تھے (وفاقی سیکرٹری دفاع ہوئے) کی آواز سب آوازوں سے الگ اور اونچی تھی اور برجستہ چٹکلوں سے بھرپور بھی۔

(۱۶ ۔ دسمبر)

رات کی گاڑی سے ڈھاکہ روانہ ہوئے، صبح ڈھاکہ پہنچے۔ اطہر صاحب ساتھ آئے (سفر، جوان کے سیلون میں ایک دو آتشہ سلیمہ بن گیا۔ گورنر صاحب نے شرف باریابی عطا کیا۔ وہاں ڈاکٹر محمود حسین (وزیر تعلیم) اور مسٹر عبدالقادر وفاقی سیکرٹری

مالیات سے ملاقات ہو گئی۔ شام کو ڈھاکہ کلب میں ایک غیر رسمی سی مشاعری جم گئی۔ میزبان ڈھاکہ کے سرکردہ صنعت کار کیپٹن رشید اور بیگم انیس تھے۔ بیگم انیس جو ایک روشن خیال خاتون ہیں اور غالباً صرف انگریزی ہی میں بات کرتی ہیں سر حسن امام کی صاحبزادی ہیں۔ کلب میں جنرل محمد ایوب خان، مسٹر نیاز محمد خان اور پیر احسن الدین سے بھی ملاقات ہوئی۔ جنرل صاحب نے فوج کو اور نیاز محمد خان نے سول کو سنبھال رکھا ہے۔ ڈھاکہ کلب میں زندگی اور زندہ دلی کا روشن ترین دائرہ مسٹر شو دبسانی کے گرد دیکھا جو ایک زمانے میں اجمیر کے چیف کمشنر تھے اور آج کل ڈھاکہ میں حکومتِ ہند کے ٹریڈ کمشنر ہیں۔

(۲۳ دسمبر)

ہمیشہ تازہ و شیریں ہے نغمۂ خسرو

موضع بڈالہ کے سید سردار شاہ کے جنازے میں شامل ہوا۔ میت کو قبر میں اتارنے کے بعد نقدی اور جنس (گندم، شکر، پھل وغیرہ) کی صورت میں اتنی خیرات بانٹی گئی کہ پس ماندگان واقعی پسماندہ ہو گئے۔ آخرت کی نجات اگر خریدی جا سکتی ہو تو سب لکھ پتی بچ جائیں۔ میں معتقدات سے بحث نہیں کرتا، اعتدال کی بات کر رہا ہوں۔

آج ہی ڈھاکہ سے لاہور پہنچا۔ ہوائی اڈے پر اب کے بھی میجر شیر محمد شاد سے اتفاقاً ملاقات ہو گئی ـــ سامانِ صد ہزار نمکداں کیے ہوئے ـــ آگرہ اور دہلی کے درمیان جہاز شدید طوفان کے درمیان تشویش انگیز ہچکولے کھاتا رہا۔ سیاحت کا سارا سرور کرکرا ہو گیا۔

(چک عبدالخالق - ۲۴ دسمبر)

ممتاز علوی کراچی سے آئے ہوئے ہیں۔ وہ آتے ہیں تو زیادہ سے زیادہ وقت احباب کے ساتھ بیٹھنا اور گھومنا چاہتے ہیں۔ کل شب فاضل صاحب (ایڈیٹر روزنامہ "تعمیر") اشرف صاحب (آرمی پریس راولپنڈی) کو اور راقم الحروف کو بچوں اور برف پر پھسلنے کے لئے مری لے گئے۔ یہ شخص اپنی ذات میں ایک زلزلہ، ایک طوفان

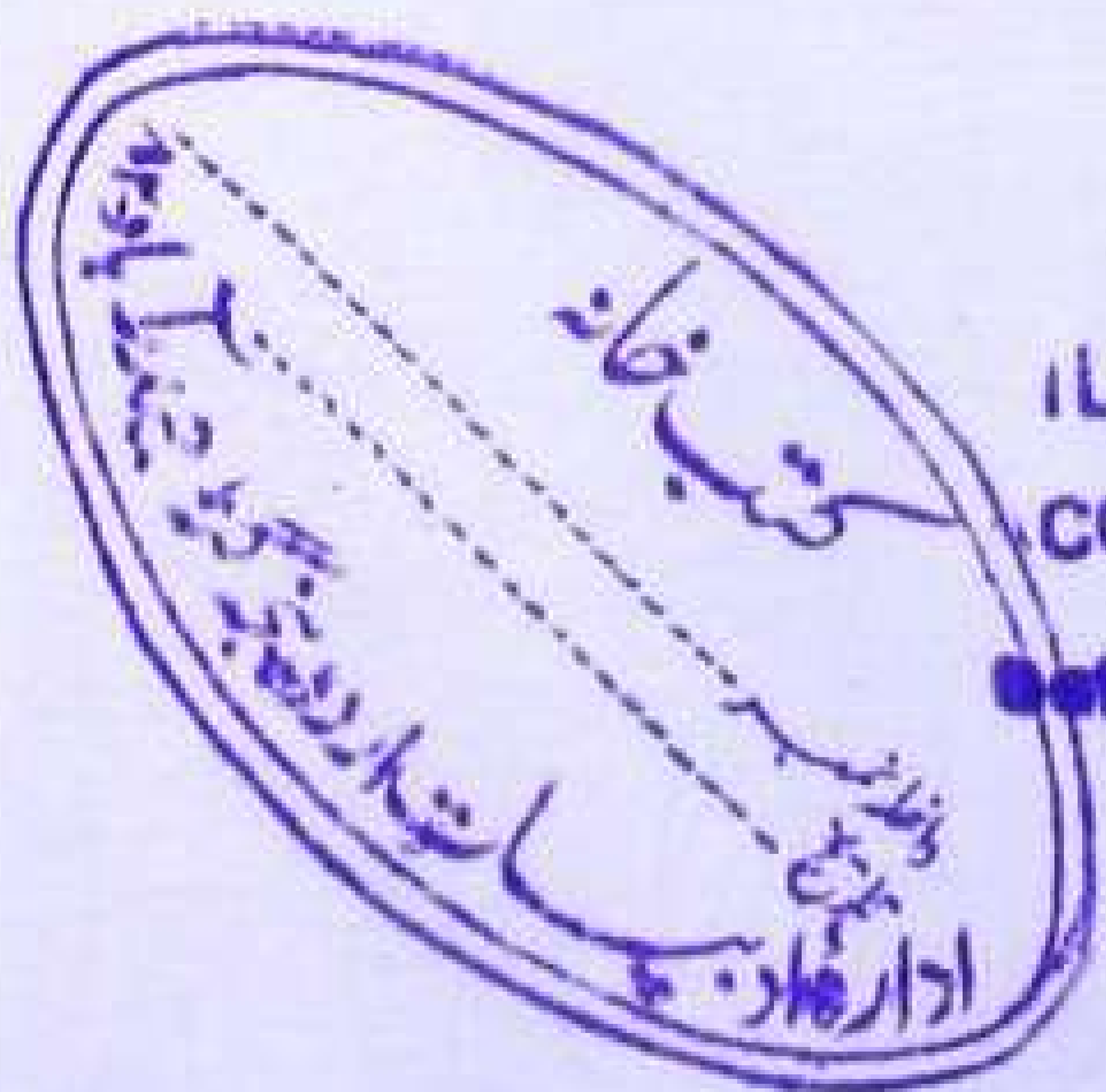
ہے۔ دفتر خارجہ میں ان کو لیا دیا دیکھو تو یقین نہ آئے کہ یہ وہی شخص ہے۔ اٹلی میں تھے (یہ دوسری عالمی جنگ کا ذکر ہے۔ ص) تو اپنے ایک سینئر انگریز افسر سے ہاتھا پائی کر بیٹھے۔ جنگ نہ ہوتی تو فوج سے بارہ پتھر ہو گئے ہوتے۔ (۳۰ دسمبر)

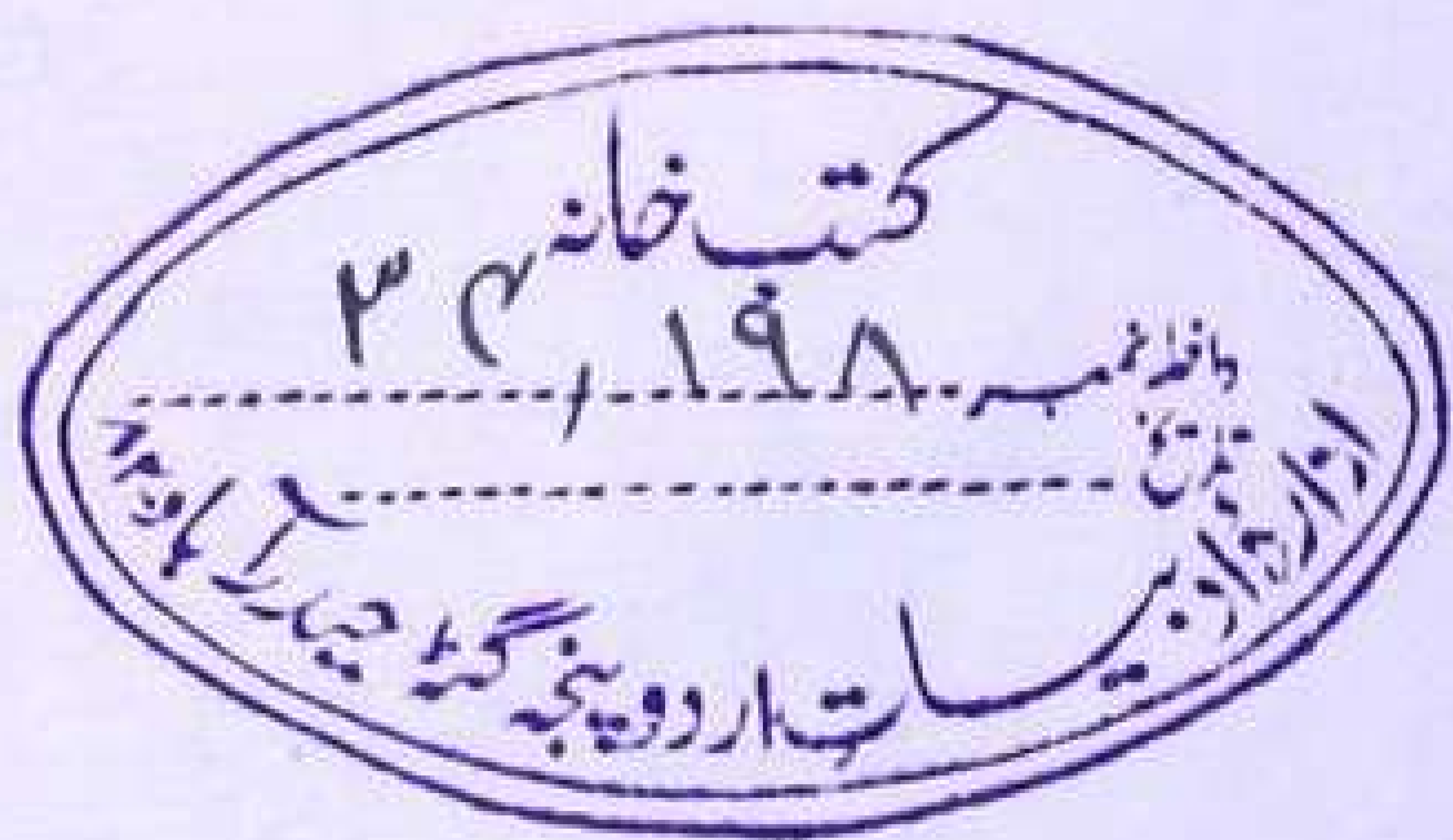
زندگی کا ایک اور سال بیت گیا۔ میرے لئے یہ مشکلات کا سال رہا۔ اخبار بند ہو گیا۔ ایک خواب تھا جو لوٹ گیا۔ تنگ دستی الگ۔ شماتتِ ہمسایہ الگ۔ فرد تو خیر دریا میں بہتا ہوا پتہ ہے۔ یہ سال تو اجتماعی زندگی کے لئے، دنیا کے لئے ایک بنجر سال ثابت ہوا۔ افق پر جنگ کے بادل چھائے رہے۔ کشمیر میں آگ سلگ رہی ہے۔ کوریا میں خون بہہ رہا ہے۔ بڑی رتھوں کو شاید خبر نہیں کہ رتھ چھوٹی چھوٹی کیلوں ہی سے مضبوط رہے گی۔ مقتدر لوگوں کو یہ معلوم نہیں کہ جو لوگ بلندی سے گرتے ہیں وہ سر کے بالوں کی طرح گرتے ہیں۔ خوشی شاید بچپن کے ایام تک ہی محدود ہے۔ ذہن جتنا بالغ ہوتا جاتا ہے خوشی کم ہوتی جاتی ہے۔

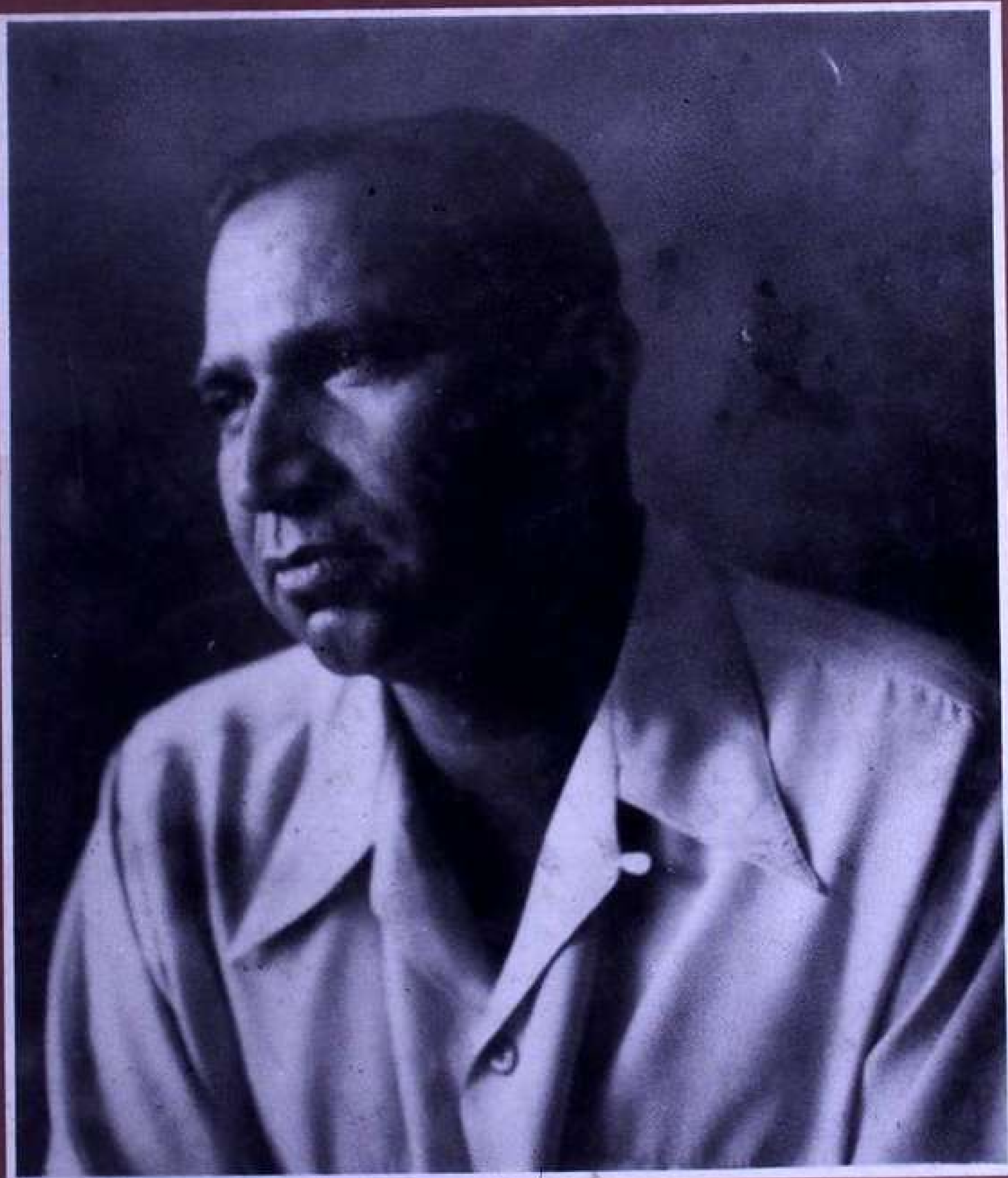
جی تو نہیں چاہتا تھا۔ مگر دوستوں کے ساتھ اگلے سال کا استقبال کلب میں جا کر کیا۔ عارضی ہی سہی۔ دل کا کچھ بوجھ تو ہلکا ہوا کہ ؏

ہمیشہ تازہ و شیریں ہے نغمۂ خسرو

(۳۱۔ دسمبر ۱۹۵۰ء)




کتب خانہ
داخلہ نمبر ۳۲،۱۹۸
تاریخ
ادارۂ ادبیات اردو پنجہ گٹہ حیدرآباد دکن



سیّد ضمیر جعفری کی ڈائری' جس میں اس دور کا یہ منفرد
مزاح نگار اپنے مخصوص گلابی اسلوب میں ضمیر اور زمانے کے
اُفق کو منکشف کرتا چلا گیا ہے۔ ایک عام آدمی کی زندگی کے
عام واقعات جو ایک عہد کے شعور کا حصّہ بن گئے ہیں۔